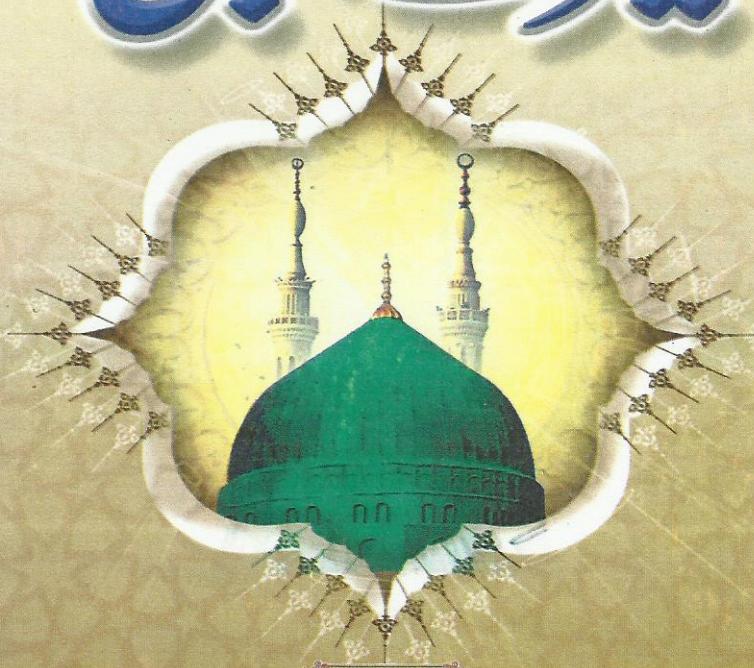


{وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ}

اور ہم نے آپ [صلی اللہ علیہ وسلم] کو تمام جہان والوں کیلئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے
(الابیاء: ۱۰)

سیرت ابی



تاکیف

خالیق احمد مفتی

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾

اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہان والوں کیلئے رحمت بنا کر رہی تھیجاتا ہے
(الأنبیاء: ۷۰)

سیرت النبی

صلی اللہ علیہ وسلم

تألیف:

خلیق احمد مفتقی

جملہ حقوق بحق مولف محفوظ ہیں

نام کتاب : سیرت انبیاء ﷺ
طبع : اول
تألیف : خلیق احمد مفتی
ناشر :

..... ﴿ رابطہ ﴾

پوسٹ بکس نمبر: 1625 عجمان، متحده عرب امارات۔

khaleeqmufti@hotmail.com

face book: Khaleeq Ahmed Mufti



ملاحظہ: یہ کتاب مفت تقسیم کیلئے ہے۔

فہرست مضمایں

<u>صفحہ:</u>	<u>عنوان:</u>
۹	حرف آغاز
۱۱	سیرت مبارکہ قبل از ولادت
۱۶	شهر کم..... اور حضرت ابراہیم علیہ السلام
۳۶-۳۵	<u>نسب مبارک</u>
۲۷	ہاشم
۲۷	عبدالمطلب
۳۲	عبداللہ
۳۷	<u>ولادت باسعادت</u>
۳۹	ایامِ رضاعت و طفولت
۳۹	حليمہ سعدیہ کی گود میں
۴۲	حادثہ شقِ صدر
۴۳	والدہ کی کفالت میں
۴۵	دادا کی کفالت میں
۴۶	بچا کی کفالت میں

صفحہ:

عنوان:

۵۶-۷۷ **☆ مرحلہ شباب**

۷۷ تجارت

۷۷ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

۵۰ بعض فضائل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا

۵۱ مختصر تذکرہ اولادِ نبی ﷺ از حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا

۵۵ کعبہ کی تعمیر نو میں شرکت

۴۳-۵۷ **☆ بعثت**

۵۹ بعثت کے وقت دینی و اخلاقی و معاشرتی حالات

۶۳ بعثت کے بعد کی زندگی کا پہلا دور:

۶۳ خفیہ دعوت و تبلیغ

۶۵ کمی زندگی کا دوسرا دور

۶۵ علانیہ تبلیغ

۶۸ مشرکین کی طرف سے ایذا اور سانیاں

۷۱ ہجرت جہشہ

۷۶ حضرت حمزہ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا قبولِ اسلام

۷۷ ترغیب و ترہیب کا سلسلہ

۸۲ مقاطعہ

صفحہ:

۸۳

عنوان:

عام الحزن

۸۴

مکی زندگی کا تیسرا اور آخری دور

۸۴

مکہ سے باہر دعوت و تبلیغ

۸۴

سفر طائف

۹۱

اسراء و معراج

۹۲

سفر اسراء و معراج میں حکمتیں:

۹۵

رسول ﷺ کیلئے تسلی و غنواری کا انتظام

۹۶

آنہنہ پیش آنے والے مراحل کیلئے تیاری

۹۸

سفر اسراء و معراج میں امت کیلئے سبق اور پیغام:

۹۸

اللہ سے لوگانے کی ضرورت

۹۹

نماز کی پابندی کی ضرورت

۱۰۰

مسجد سے رشتہ جوڑنے کی ضرورت

۱۰۱

اخلاقی بلندی کیلئے فکر و جستجو کی ضرورت

۱۰۲

نوافل کی فضیلت

۱۰۳

ذکر اللہ کی فضیلت

۱۰۴

معراج کے بعد:

۱۰۸

نئی منزل کی امید

صفحہ:

عنوان:

۱۱۱	بیعتِ عقبہ اولیٰ
۱۱۲	بیعتِ عقبہ ثانیہ
۱۱۷	☆ بھرث مدینہ
۱۲۸	عظمیم خاتون
۱۳۰	غاریثور سے روانگی
۱۳۳	مدینہ میں آمد
۱۳۹	سفر بھرث میں ہمارے لئے سبق اور پیغام:
۱۳۹	اللہ پر توکل
۱۳۹	توکل کی حقیقت
۱۴۱	امانت و دیانت
۱۴۳	قیمتی ترین متناع؛ دین و ایمان
۱۴۵	بھرث سے مقصود؛ نئے معاشرے کا قیام
۱۴۶	اسلامی کلینڈر کا آغاز
۱۴۸	☆ نئی زندگی: (مدنی زندگی کا پہلا دور)
۱۴۸	مدینہ میں دینی، معاشری، وسیاسی صورت حال
۱۵۸	☆ نئے معاشرے کی تشکیل کیلئے فوری اقدامات:
۱۵۸	مسجد نبوی کی تعمیر

<u>عنوان:</u>	<u>صفحہ:</u>
مواخاة	۱۶۱
میثاق مدینہ	۱۶۵
<u>☆ مشرکین کے خلاف غزوات کا مختصر تذکرہ اور تنقیدی جائزہ:</u>	۱۶۷-۱۷۹
بدر	۱۷۹
اُحد	۱۸۰
خندق	۱۸۱
قیمتی ترین سبق	۱۸۲
اسلام بزوش شمشیر نہیں پھیلا	۱۸۳
<u>☆ صلح حدیبیہ</u> (مدنی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز)	۱۸۰
<u>☆ فرم رواؤں کو دعوتِ اسلام:</u>	۱۸۶-۲۰۳
قیصر روم	۱۹۲
کسری خسرو پرویز	۱۹۸
نجاشی شاہ جہشہ	۲۰۱
موقوس شاہ مصر	۲۰۲
<u>☆ غزودہ خیر</u>	۲۰۳
<u>☆ فتح مکہ</u> (مدنی زندگی کے تیسرا اور آخری دور کا آغاز)	۲۰۷
<u>☆ غزودہ حسین</u>	۲۱۶

صفحہ:

عنوان:

۲۲۳	جزیرۃ العرب میں مختلف شورشیں اور ان کی سرکوبی
۲۲۸	غزوہ تبوک
۲۵۹	عام الوفود
۲۶۲	<u>☆ حجۃ الوداع</u>
۲۹۳-۲۲۹	<u>☆ اپنے رب کی طرف واپسی:</u>
۲۷۳	مرض الموت
۲۷۴	آخری چھ ایام اور صیتین
۲۸۵	سوگوار فضاء
۲۹۰	تجہیز و تنظیم
۳۰۵-۲۹۵	<u>☆.....اصل مقصود؛ اتباع رسول ﷺ</u>



بسم الله الرحمن الرحيم

حرف آغاز:

الحمد لله رب العالمين ، والصلوة والسلام على أشرف الأنبياء والمرسلين ، نبينا محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين ، أما بعد :

اللهم سجناه وتعاليٰ پرایمان کے بعد کسی بھی مسلمان کیلئے سب سے ثقیلی ترین متاع رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عقیدت و محبت ہے، بلکہ اللہ سجناه وتعالیٰ کی معرفت اور اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کا واحد طریقہ بھی ”اتباع رسول ﷺ“ میں ہی مخصر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قدیم و جدید ہر دور میں بڑی تعداد میں رسول ﷺ کی سیرت مبارکہ کے موضوع پر کتابیں تحریر کی گئی ہیں..... اور یقیناً آئندہ بھی تاقیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا..... کیونکہ..... جیسا کہ مثال مشہور ہے : من أَحَبَّ شَيْئاً أَكْثَرَ ذِكْرَه.....

یعنی ”انسان جس چیز سے محبت کرتا ہے، بار بار اسی کا تذکرہ کرتا ہے.....“ وہ نہیں سوچتا کہ مجھ سے قبل اسی بارے میں کتنے لوگ کیا کچھ کہہ چکے ہیں..... یا کیا کچھ لکھ چکے ہیں..... اسی کیفیت کے تحت یہنا کارہ اور بے علم عمل انسان بھی اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور بے ربط عبارات میں وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ تحریر کرتا رہا..... (۱)

بالآخر شخص اللہ سجناه وتعالیٰ کے فضل و کرم سے بے ربط عبارات کا یہی مجموعہ کتابی شکل میں تیار ہو گیا.....

(۱) خصوصاً ۲۰۱۱ء میں یہ دون ملک ایک ٹوٹی ہیں میں کی طرف سے فرمائش پر ”سیرت النبی ﷺ“ کے عنوان سے مفصل پروگرام پیش کرنے کا موقع ملا، تب ان تحریریوں کا مجموعہ مسلسل برداشتراہا.....

اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس ناجیز کی سعی کو شرفِ قولیت سے نوازیں، اور اسے میرے لئے، میرے والدین، اہل و عیال، ذوی الأرحام، تمام اساتذہ کرام، نیز ہر اس شخص کیلئے جس نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں کسی بھی شکل میں تعاون کیا ہو ذخیرہ آخرت بنائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين ،
وصلى الله تعالى على خير خلقه محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين .

خلیق احمد مفتی

۱۸ / ریچ الاول ۱۴۲۳ھ، مطابق ۱۹ جنوری ۲۰۱۳ء بروز التواری

پوسٹ بکس نمبر: 1625 عجمان، متحده عرب امارات -

khalеeqmufti@hotmail.com

face book: Khaleeq Ahmed Mufti



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سیرت مبارکہ قبل از ولادت:

عام طور پر اہل قلم کے یہاں رواج یہ ہے کہ جب کسی اہم شخصیت کی سیرت نگاری یا اس کے حالات و واقعات کا تذکرہ مقصود ہو تو اکثر و بیشتر ابتداء اس کی ولادت سے کی جاتی ہے، یا اس علاقے کا کچھ تذکرہ کر دیا جاتا ہے جہاں اس کی ولادت ہوئی، اور اس سے متعلق کچھ جغرافیائی تفصیلات و معلومات درج کر دی جاتی ہیں، یا زیادہ سے زیادہ اس دور اور اس علاقے کے مذہبی، سیاسی و معاشرتی حالات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن میں اس شخصیت کی ولادت اور پھر نشوونما ہوئی۔

جبکہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ اور حیاتِ طیبہ کے بارے میں جب ہم غور فکر کرتے ہیں تو ہمیں اس حقیقت کا دراک ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی شان نرالی ہے اور آپؐ کی سیرت مبارکہ کا معاملہ بالکل ہی مختلف ہے۔ کیونکہ آپؐ کامبارک تذکرہ تو آپؐ کی ولادت سے بہت پہلے ہی سے چلا آ رہا تھا، گذشتہ امتوں میں بھی آپؐ کا چرچا تھا، اور آپؐ کی شخصیت گذشتہ انبیاء کرام علیہ السلام کے نزدیک جانی پہچانی تھی، اور اس حقیقت کو جانے کیلئے کسی تاریخی کتاب کی ورق گردانی کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ حقیقت تو خود قرآن کریم سے ثابت ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَ لَتَنْصُرُنَّهُ﴾

قَالَ أَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَى ذَلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعْكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ فَمَنْ تَوَلَّ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١﴾

ترجمہ: (اور جب اللہ نے نبیوں سے یہ عہد لیا کہ جو کچھ میں تمہیں کتاب و حکمت دوں، پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو تمہارے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرنے والا ہو تو تم سب اس رسول پر ضرور ایمان لاوے گے اور اس کی مدد و نصرت کرو گے، فرمایا: کیا تم سب نے اقرار کیا؟ اور اس میرے عہد کو تقبل کیا؟ ان سب نے کہا: ہم نے اقرار کیا، فرمایا: پھر اب تم گواہ رہو، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں، پھر جو کوئی [اس عہد و اقرار کے بعد] پھر جائے تو یقیناً وہی لوگ نافرمان ہیں)۔

یعنی رسول ﷺ کے بارے میں گذشتہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے یہ عہد لیا گیا کہ اگر ان کے دور میں ہی آپؐ کاظہور ہو گیا تو وہ اپنی نبوت چھوڑ کر آپؐ پر ایمان لا سکیں گے اور آپؐ ہی کا اتباع کریں گے۔ (۲)

اسی طرح اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام جب اللہ کے حکم کی تعیل میں دونوں تمیم کعبہ میں مشغول تھے، اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ رب العزت سے دعاء و مناجات کے دوران یہ دعا بھی

(۱) آل عمران: [۸۲-۸۳]

(۲) اس آیت کی ایک تفسیر تو یہی بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مفسرین کی ایک بڑی تعداد کے نزدیک اس کی تفسیر یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ باہم ایک دوسرے کی تائید و نصرت کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں تفسیروں میں کوئی تعارض نہیں ہے اور اس دوسری تفسیر کے ضمن میں ہی یہی تفسیر بھی خود بخود شامل ہے، کیونکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف سے ایک دوسرے کیلئے تائید و نصرت کے عہد میں ہی یقیناً رسول ﷺ کیلئے تائید و نصرت بھی شامل ہے۔

ماگل: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُرَكِّبُهُمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۱)

ترجمہ: (اے ہمارے رب! ان میں انہی میں سے رسول ہجج جوان کے پاس تیری آئیں پڑھ، انہیں کتاب و حکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے، یقیناً تو غلبہ والا اور حکمت والا ہے)

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَّيَّنَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُرَكِّبُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (۲)

ترجمہ: (وہی ہے جس نے ان ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آئیں پڑھ کر سنتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ یہ اس سے قبل یقیناً کھلی گمراہی میں تھے)

مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعاء ماگل تھی اس کی قبولیت آپ ﷺ کی بعثت کی شکل میں ہوئی۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو کہ رسول ﷺ سے چھ سو سال پہلے گزرے ہیں، قرآن کریم میں ان کے بارے میں تذکرہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے نبی آخر الزمان ﷺ کے بارے میں یوں خوبشیری سنائی: ﴿وَإِذْقَالَ عِيسَى ابْنُ مَرِيمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقاً لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التُّورَةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحَمَدُ﴾ (۳)

ترجمہ: (اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، مجھ سے پہلے کی کتاب تورات کی میں تصدیق کرنے والا ہوں اور اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی میں تمہیں خوشخبری سنانے والا ہوں جن کا نام احمد ہے) (۱) رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: (إِنِّي عَنْدَ اللَّهِ مَكْتُوبٌ :خَاتَمُ النَّبِيِّينَ وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِي طِينَتِهِ) (۲) ترجمہ: (میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت سے ”خاتم النبیین“، لکھا ہوا ہوں کہ جب آدم علیہ السلام کا خیر تیار ہو رہا تھا) یعنی آپ ﷺ عالم الہی میں ازل سے ہی خاتم النبیین تھے جبکہ حضرت آدم علیہ السلام اس وقت تخلیقی مرحل میں تھے۔

نیز رسول ﷺ کا تذکرہ چونکہ سابقہ کتب سماویہ میں موجود تھا اس لئے اہل کتاب آپ گی بعثت و رسالت سے بخوبی واقع تھے اور آپ گی شخصیت ان کے نزدیک خوب جانی پہچانی تھی، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس بات کا تذکرہ موجود ہے۔

مثلاً ارشادِ بانی ہے: ﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عَنْدَ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَأَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ (۳) ترجمہ: (اور جب اللہ کی طرف سے ایک کتاب [قرآن کریم] ان کے پاس آئی جو تصدیق کرتی ہے اس کتاب [تورات] کی جوان کے پاس تھی، حالانکہ پہلے یہ خود [اس کے ذریعے] کافروں پر فتح چاہتے تھے، اور

(۱) واضح ہو کہ آپ ﷺ کا نام مبارک محمد بھی ہے اور احمد بھی ہے۔

(۲) مشکاة المصابح [۵۷۵] باب فضائل سید المرسلین۔

(۳) البقرہ [۸۹]

جب وہ چیز آگئی تو باوجود اس کو پہچان لینے کے اس کا انکار کرنے لگے، اللہ کی لعنت ہو انکار کرنے والوں پر)۔

یعنی یہ یہودی میں جب کسی جنگ کے موقع پر مشرکین سے شکست کھا جاتے تو دعا کرتے کہ یا اللہ! آخری نبی کو جلد مبعوث فرماء تاکہ اس کے ساتھ مل کر ہم ان مشرکین پر غالبہ اور فتح حاصل کر سکیں، یعنی رسول اللہ ﷺ کی بعثت ان کے علم میں تھی اور اس چیز سے خوب واقف تھے، مگر اس کے باوجود مخفی حسد کی وجہ سے انہوں نے کفر کیا۔

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُم﴾ (۱) ترجمہ: (جنمیں ہم نے کتاب دی ہے وہ تو اسے [یعنی رسول اللہ ﷺ کو] ایسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں، ان کی ایک جماعت حق کو پہچان کر پھر اسے چھپاتی ہے)

یعنی رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور آپؐ کی حقانیت و صداقت ان اہل کتاب کے ہاں اس قدر معروف اور یقینی تھی اور وہ اس طرح آپؐ کو جانتے اور پہچانتے تھے کہ جس طرح بغیر کسی شک و شبہ کے خود اپنے بچوں کو جانتے اور پہچانتے تھے۔

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿..... يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ﴾ (۲) یعنی یہ اہل کتاب رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ اپنے پاس تورات و نجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔



شہر مکہ..... اور..... حضرت ابراہیم علیہ السلام

رسول ﷺ کا آبائی وطن چونکہ مکہ مکرمہ تھا لہذا آپ کی سیرت مبارکہ اور حیاتِ طیبہ کے تذکرہ و بیان کے ضمن میں اس شہر اور اس خطے کا مختصر تذکرہ بھی ضروری ہے، اور جب شہر مکہ کا تذکرہ ہوگا تو ضرور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ بھی ہوگا، کیونکہ یہ دونوں لازم و ملزم ہیں۔

شہر مکہ کی اولین آبادی دو پاکیزہ نفوس پر مشتمل تھی، یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ”ہاجر“۔ (۱)

حضرت اسماعیل علیہ السلام اللہ کے جلیل القدر تین بیغر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند تھے، جنہیں ابوالأنبیاء بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے بعد جتنے بھی نبی آئے وہ سب انہی کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر ایمان قبول کرنے والوں کی تعداد تو اگرچہ بہت کم تھی، یعنی صرف ان کی اہلیہ حضرت سارہ، دوسری اہلیہ حضرت ہاجر، نیز بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام (۲) یہ کل امت تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی، لیکن اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے انہیں مقام و رتبہ بہت ہی بلند عطااء کیا گیا اور ”امام الناس“ کا لقب عطاے کیا گیا۔

قانون قدرت یہ ہے کہ جب کسی کو بلند مقام و رتبہ سے نوازنا مقصود ہو تو اس کیلئے آزمائشوں

(۱) ”ہاجر“ کو اردو و ان طبقے میں برصغیر میں عام طور پر حضرت ہاجر کہا جاتا ہے۔ (۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں صاحبزادوں حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کی ولادت تو بعد میں ہوئی، لہذا وہ تو پیدائشی ہی مؤمن تھے، جبکہ آپ کی دعوت پر ایمان قبول کرنے والوں کی کل تعداد تین ہی تھی۔

اور ابتلائات کا سلسلہ بھی اسی قدر دشوار اور سخت ہوتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا، اور ابتلائات کے ایک طویل سلسلہ سے انہیں گذرنا پڑا۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ أُبْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاءِكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً...﴾ (۱)

ترجمہ: (اور جب ابراہیم [علیہ السلام] کو ان کے رب نے کئی کئی باتوں سے آزمایا اور انہوں نے ان سب کو پورا کر دیا تو اللہ نے فرمایا میں تمہیں لوگوں کا امام بنادوں گا.....)

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام متعدد و مختلف قسم کی آزمائشوں سے گذارے گئے اور ہر آزمائش میں کامیاب و کامران رہے، جس کے صلے میں انہیں اللہ کی طرف سے ”امام الناس“ کے عظیم ترین منصب پر فائز کیا گیا، چنانچہ صرف مسلمان ہی نہیں، یہود و نصاریٰ کے نزدیک بھی ان کی شخصیت انتہائی محترم اور پیشوامانی اور سمجھی جاتی ہے، حتیٰ کہ مشرکین عرب کے نزدیک بھی وہ واجب الاحترام تھے، اگرچہ ان کی اپنی امت اور اپنے پیروکار م Hispan تین افراد ہی تھے۔

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَى﴾ (۲) ترجمہ: (اور وہ ابراہیم جنہوں نے وفاء کی)

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے ساتھ کئے گئے تمام وعدے وفاء کئے اور ہر آزمائش میں ثابت قدم رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے آزمائشوں کے اس طویل سلسلے کی ابتداء تو خود ان کے گھر سے ہی ہوئی تھی جب خود ان کے مشرک باپ آزر نے انہیں گھر سے نکال دیا تھا (۳)

(۱) البقرہ [۱۲۳] (۲) انہم [۲۷] (۳) اس واقعی تفصیل سورہ مریم آیات ۵۰-۵۱ میں موجود ہے۔

اس کے بعد انہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور بھرت کی نوبت آئی، پھر آگ میں ڈالے گئے آزمائشوں کے اسی سلسلے کے دوران آپ علیہ السلام کا اپنی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کے ہمراہ ایک ایسے علاقے سے گذر ہوا جہاں ایک بدکردار اور ظالم انسان کی حکمرانی تھی، اس نے اپنے کارندے چھوڑ رکھے تھے جن کے ذمے یہ کام تھا کہ اس علاقے سے گذرنے والے مسافروں اور قافلوں پر نظر رکھیں، اگر کبھی کسی قافلے میں کوئی خوبصورت عورت نظر آئے تو وہ اسے زبردستی انگواء کر لیں اور اس حکمران کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ بدجنت اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناسکے۔

جب ان دونوں حضرات یعنی ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کا گذراں علاقے سے ہوا تو اس بدجنت حکمران کے کارندوں نے حضرت سارہ کو بالجہ اس حکمران کے پاس پہنچا دیا، جبکہ اس عجیب و غریب اور انتہائی پریشان کن اور نازک ترین صورتِ حال میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مشکل سے نجات کیلئے اللہ سے فریاد اور دعا و مناجات کا سلسلہ شروع کیا..... ان برگزیدہ ہستیوں کا یہی مزاج تھا..... یہی ان کا مذہب و مسلک تھا..... اور یہی ان کا شیوه و شعار تھا..... کہ..... ہر مشکل سے نجات کیلئے صرف اللہ کے سامنے دعاء و فریاد..... اور صرف اسی سے استعانت والتجاء.....!

اوہ راست بدجنت شخص نے حسب معمول بری نیت اور غلط ارادے سے حضرت سارہ کی طرف دست درازی کی، جس پر اس کا ہاتھ شل ہو گیا، جس پر اسے کچھ اندازہ ہوا کہ شاید یہ کوئی بزرگ خاتون ہیں اس لئے ان کی طرف دست درازی کی وجہ سے مجھے یہ سزا ملی ہے، لہذا اس نے ان سے کہا کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ دوبارہ ایسی حرکت نہیں کروں گا، آپ میرے لئے دعاء کیجئے تاکہ میرا ہاتھ ٹھیک ہو جائے، حضرت سارہ نے اس کیلئے دعاء کی،

جس کے نتیجے میں اس کا ہاتھ ٹھیک ہو گیا، مگر فوراً ہی اس نے پھر وہی حرکت کی اور پھر اس کا ہاتھ مفلوج اور شل ہو گیا، اور اب دوبارہ اس نے منت سماجت اور خوشامد شروع کی کہ میرے لئے دعاء کیجئے اور یہ کہ اب میں ایسی حرکت ہرگز نہیں کروں گا، حضرت سارہ نے دوبارہ دعاء کی، جس پر اس کا ہاتھ درست ہو گیا، مگر اب پھر اس نے وہی حرکت کی اور پھر وہی ہوا..... یوں تین بار یہی صورتِ حال پیش آئی، تب اسے یقین ہو گیا کہ یہ تو واقعی کوئی بہت ہی عظیم ترین اور پچھلی ہوئی خاتون ہیں..... اور اس نے سچی توبہ کی اور خوب منت سماجت کی، تب حضرت سارہ کی دعاء کے نتیجے میں اس کا ہاتھ درست ہوا تو اس نے نہ صرف یہ کہ حضرت سارہ کو آزاد کر دیا اور جانے کی اجازت دی بلکہ ایک کنیز بھی بطور ہدیہ پیش کی اور خدمت کی غرض سے اسے بھی ان کے ہمراہ روانہ کیا، اس کنیز کا نام تھا ”ہاجرہ“ (۱)

چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت تک بے اولاد تھے اور کافی عمر سیدہ بھی ہو چکے تھے، جس کا حضرت سارہ کو بہت فلق اور رنج تھا اس لئے حضرت سارہ نے اپنے شوہر نامدار حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ اصرار کیا کہ مجھ سے تو آپ کو اولاد کی خوشی مل نہیں سکی..... لہذا میری خواہش یہ ہے کہ میں یہ کنیز آپ کو ہبہ کر دوں، یوں شاید اللہ ہمیں اولاد کی نعمت عطا فرمادے اور ہماری زندگی میں بھی خوشی کا جھونکا آ سکے.....!

چنانچہ حضرت سارہ نے خود اصرار کر کے وہ کنیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہبہ کر دی، جس کے نتیجے میں اللہ نے انہیں بیٹا اسماعیل (علیہ السلام) عطا کیا، یوں ہاجرہ ”ام اسماعیل“ بن گنیں۔ اللہ کی قدرت ملاحظہ ہو کہ اس کے بعد حضرت سارہ سے بھی بیٹے یعنی اسحاق (علیہ

(۱) اصل نام ”ہاجر“ تھا، البتہ بر صغیر میں اہل اردو کے ہاں ”ہاجرہ“ مشہور ہے۔

السلام) کی ولادت ہوئی۔

لیکن اس سے قبل جب حضرت سارہ بے اولاد تھیں جبکہ حضرت ہاجرہ کے ہاں بیٹی کی ولادت ہو چکی تھی یہ ایسی صورتِ حال تھی کہ جس کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام خود اپنے گھر میں ہی بڑی آزمائش کا شکار ہو کر رہ گئے اور صورتِ حال اس قدر بگڑی کہ بالآخر حضرت سارہ نے اب یہ اصرار کیا کہ ہاجرہ اور اسماعیل کو ان سے دور کر دیا جائے۔ جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں کو حضرت سارہ سے الگ کہیں دور بسانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ ان دونوں کو لئے ہوئے اُس وقت اپنی جائے اقامت یعنی فلسطین سے روانہ ہوئے اور پہاڑوں، بیابانوں اور چیل، میدانوں میں مسلسل سفر کرتے ہوئے آخر ایک ویران و سنسان مقام پر پہنچ کر رک گئے، حضرت ہاجرہ اپنے شیرخوار بیٹے اسماعیل کو گود میں لئے ہوئے زمین پر بیٹھ گئیں۔ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ابھی بیٹھے بھی نہیں تھے کہ کھڑے کھڑے اچانک مژرے اور واپس چل دیئے، حضرت ہاجرہ نے پوچھا کہ کہاں چل دیئے آپ؟ مگر شوہر کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا، دوبارہ پوچھا کہ تمیں یہاں اس ویرانے میں چھوڑ کر آپ کہاں چلے جا رہے ہیں؟ مگر اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا، آخر تیسری بار پوچھا: کیا آپ کو اللہ نے یہ حکم دیا ہے؟ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام رک گئے، پلٹ کر پیچھے دیکھا اور فرمایا: ”ہاں“، اس پر حضرت ہاجرہ نے کہا: ”تب اللہ ہمیں بر باؤ نہیں ہونے دے گا“۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کو چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہو گئے، کچھ دور چلنے کے بعد جب ان کی نظروں سے اوچھل ہو گئے تو ایک جگہ رک کر پہاڑی کی اوٹ سے اس مقام کی طرف دیکھتے ہوئے کہ جس کے بارے میں انہیں من جانب اللہ یہ خبر دے

دی گئی تھی کہ ”آخر کار بیہاں اللہ کا گھر تعمیر ہو گا، جو کہ تمام دنیاے انسانیت کیلئے تو حید کا مرکز اور رُشد و ہدایت کا منبع قرار پائے گا.....“ خوب گڑگڑا کر اللہ سے دعاء و مناجات میں مشغول ہو گئے۔ (پوری دعاء سورہ ابراہیم میں ملاحظہ ہو، آیات: ۳۵-۳۶)

☆ اس دعاء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے اپنی اولاد کیلئے دین و دنیا کی صلاح و فلاح اور خیر و خوبی کا سوال کیا، مثلاً: امن و امان، سکون و اطمینان، شرک اور بت پرستی سے حفاظت، نماز کی پابندی کی توفیق، لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل و متوجہ کر دینا، ان کیلئے رزق کا انتظام، اور پھر اس رزق پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی توفیق.....!

چنانچہ اس جامع دعاء میں اللہ سے اپنی اولاد کیلئے بیک وقت دین و دنیا دنوں کی خیر و خوبی مانگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی اولاد کیلئے دینی صلاح و فلاح کی دعاء کے ساتھ ساتھ ان کی معاشی بہتری اور دنیاوی خیر و خوبی کیلئے دعا اور محنت و کوشش تو کل علی اللہ یا تعلق مع اللہ کے منافی نہیں ہے، بلکہ یہ تو اُسوہ انبیاء ہے اور یہی پیغمبرانہ استقامت و حسن انتظام کی مثال ہے کہ ایک پہلو کی رعایت کے وقت دوسرا پہلو کبھی نظر انداز نہیں ہوتا۔

چنانچہ اس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے حکم کی تعلیم میں اگرچہ اپنے اہل و عیال کو اس ویران و سنسان مقام پر چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہو گئے اور یوں حضرت ہاجرہ اور شیرخوار بیٹا اسماعیل کی نظروں سے اوچھل تو ضرور ہو گئے..... لیکن وہ ان کی رعایت و نگہبانی اور ان کیلئے فکر مندی کے فریضے سے غافل ہرگز نہیں ہوئے، اور خوب گڑگڑا کر اپنے اللہ سے ان کیلئے یوں دعاء و فریاد کی:

﴿رَبَّنَا إِنَّيْ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرِعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمَحْرَمَ
رَبَّنَا لِيُقْيِمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئَدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنْ

الثَّقَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿۱﴾

ترجمہ: (اے ہمارے پورو دگار! میں نے اپنی کچھ اولاد اس بے کھیتی کی وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسائی ہے۔ اے ہمارے پورو دگار! یہ اس لئے کہ وہ نماز قائم رکھیں، پس تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے، اور انہیں بچلوں کا رزق عطا فرماء، تاکہ یہ شکر گزاری کریں)۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں سے روانہ ہو گئے اور یوں اپنے اس عمل سے ہمیشہ کیلئے دنیا نے انسانیت کو یہ پیغام دے گئے کہ جہاں اللہ کے ہر حکم کے سامنے ہر تعلق بے معنی اور ہر رشتہ تیچ ہے..... وہیں انسان کیلئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ شفقت پری کے تقاضے کے مطابق اپنی اولاد کی سلامتی اور دنیوی و آخری صلاح و فلاح کیلئے ہمیشہ خوب گڑ گڑا کرو اور دل لگا کر اللہ سے دعا و فریاد کیا کرے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روائی کے بعد حضرت ہاجہ اور ان کا شیر خوار بیٹا اسماعیل دونوں وہیں اس ویرانے میں رہ گئے جہاں کوئی انسان نہیں تھا، جہاں نہ زندگی تھی نہ زندگی کا کوئی نشان..... تھوڑی بہت جو خوراک تھی وہ ختم ہو گئی، اب انہیں بھوک اور پیاس نے ستایا، اور شیر خوار بچے نے بری طرح رونا اور بلکن اشروع کر دیا، حضرت ہاجہ اس ویرانے میں جیران و پریشان پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگیں، قریب ہی ایک ٹیلہ (صفا) نظر آیا، اس خیال سے اس کے اوپر چڑھ گئیں کہ ٹیلے کے اوپر بلندی سے دور دور تک نگاہ جائے گی اور یوں شاید کوئی انسان یا کھانے پینے کا کوئی سامان نظر آجائے، لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی، سامنے (نصف کلومیٹر کے فاصلے پر) ایک اور ٹیلہ (مرودہ) نظر آیا تو

صفا سے نیچے اتریں اور دوڑتی ہوئی اس دوسرے ٹیلے پر چڑھ گئیں، لیکن وہاں بھی کچھ نظر نہ آیا تو واپس پھر صفا پر پہنچیں..... یوں متاثری ماری ہوئی اس خاتون نے اپنے بچے کیلئے پانی کی تلاش میں اس پہاڑی اور پتھریلی زمین پر دوڑتے ہوئے ان دونوں ٹیلوں کے درمیان مسلسل سات چکر لگائے۔ ساتویں چکر کے اختتام پر جب وہ مرودہ پر کھڑی ہوئی نہایت بے چینی کے ساتھ ادھر ادھر نظر دوڑا رہی تھیں کہ اچانک انہیں ایک آواز سنائی دی، پلٹ کر دیکھا تو بچے کے قریب کسی کو کھڑا ہوا پایا، جو کہ درحقیقت جبریل علیہ السلام تھے، جنہوں نے وہاں اس مقام پر اپنا پر زمین پر مارا کہ جہاں بچہ مسلسل روتے اور بلکتے ہوئے اپنی ایڑیاں رگڑ رہا تھا، تب اللہ کے حکم سے اس سنگلاخ اور پتھریلی زمین میں ”زمزم“ کا چشمہ پھوٹ پڑا..... یوں حضرت ہاجرہ اور ان کے شیر خوار لخت جگہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کیلئے من جانب اللہ وہاں زندگی بسر کرنے کا انتظام کر دیا گیا..... اور یوں یہ دونوں ماں بیٹا مستقل طور پر اسی جگہ قیام پذیر ہو گئے..... لہذا یہی دونوں نعمتوں قدسیہ ہی اُس مقدس ترین بقعہ زمین یعنی شہر ”مکہ“ کے او لین مکین تھے۔

وقت کا پہیہ چلتا رہا..... ایک روز ملکہ یمن سے تعلق رکھنے والے قبیلہ ”بنو جرہم“ کا ایک قافلہ جب وہاں سے گزر رہا تھا تو انہوں نے اچانک وہاں ایک پرندہ اڑتا ہوا دیکھا جس پر انہیں حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی، کیونکہ یہ اس بات کی علامت تھی کہ یہاں قرب و جوار میں کہیں پانی موجود ہے۔ جبکہ اس سے قبل انہیں یہاں کبھی کوئی پرندہ نظر نہیں آیا تھا اور ان کے علم کے مطابق ماضی میں یہاں پانی کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ جبکہ اب پرندہ اڑتا ہوا نظر آیا تو انہوں نے سرگرمی سے پانی کی تلاش شروع کی جس کے نتیجے میں وہ جلد ہی ”زمزم“ تک جا پہنچے، وہاں حضرت ہاجرہ سے ملاقات ہوئی، تب انہوں نے ان

سے یہ گذارش کی کہ ہمیں یہاں مستقل قیام کی اور اس پانی سے استفادہ کی اجازت دی جائے۔ غور طلب بات ہے کہ وہ پورا قافلہ تھا، جبکہ دوسری طرف محض ایک عورت اور اس کا کم سن بیٹا، اگر وہ چاہتے تو زبردستی بھی قبضہ کر سکتے تھے..... لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، اور اعلیٰ اخلاق و کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے محض گذارش کی اور اجازت چاہی۔ جس پر حضرت ہاجرہ نے انہیں اس شرط پر اجازت دے دی کہ وہ اس پانی سے استفادہ تو کریں، لیکن اس پر ان کا کوئی ”حق ملکیت“ نہیں ہوگا، اور یعنی بدستور خود ان کے پاس ہی رہیگا۔ چنانچہ اس شرط کو قبول کرتے ہوئے وہ لوگ مستقل وہیں آباد ہو گئے اور یوں مکہ کی آبادی بڑھتی گئی، حتیٰ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہو گئے اور ان کی والدہ نے ان کی شادی اسی قبلیہ بنوجہنم میں کرادی۔ یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کا یہ سلسلہ حضرت اسماعیل علیہ السلام (جو کہ حضرت ہاجرہ سے تھے) کے توسط سے مکہ مکرمہ میں بڑھتا چلا گیا۔ جبکہ دوسری طرف فلسطین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل حضرت اسحاق علیہ السلام (جو حضرت سارہ سے تھے) کے توسط سے مسلسل بڑھتی چلی گئی اور آخر یہی لوگ ”بني اسرائیل“ کہلانے۔



نسب مبارک:

اس سے قبل یہ تذکرہ ہو چکا ہے کہ اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزندِ جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام جب اللہ کے حکم کی تعییل میں دونوں تمیر کعبہ میں مشغول تھے اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ رب العزت سے دعاء و مناجات کے دوران یہ دعا بھی مانگی تھی: ﴿رَبَّنَا وَأَبْعَثْتُ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتَلَوَّ عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُرِكِّبُهُمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۱) ترجمہ: (اے ہمارے رب! ان میں انہی میں سے رسول بھیج جوان کے پاس تیری آئیں پڑھ، انہیں کتاب و حکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے، یقیناً تو غلبہ والا اور حکمت والا ہے)

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا اسی شہر مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی ولادت اور پھر بعثت کی شکل میں پوری ہوئی، جیسا کہ خود قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأَمْمَيْنَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتَلَوَّ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُرِكِّبُهُمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ ترجمہ: (وہی ہے جس نے ان ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آئیں پڑھ کر سنا تا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ یہ اس سے قبل یقیناً کھلی گمراہی میں تھے) (۲)

رسول اللہ ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزندِ جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل

(۱) البقرۃ [۱۲۹]

(۲) الجمعہ [۲]

سے تھے۔ اور صحت و درستی کے اعتبار سے اس سلسلہ نسب کے دو حصے ہیں:

☆ پہلا حصہ آپ ﷺ کے والد عبد اللہ سے آپ ﷺ کے اکیسویں پشت کے دادا عدنان سے جاماتا ہے، سلسلہ نسب کے اس حصے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے، بلکہ آپ ﷺ نے خود یہاں تک اپنا نسب زبانی بیان فرمایا ہے۔ (۱)

☆ دوسرا حصہ بائیسویں پشت سے شروع ہو کر باسٹھویں دادا یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تک ہے، یہ حصہ بھی درست ہے، البتہ اس کی درستی و ثابتہت پہلے حصے جیسی نہیں۔

بعض موئخین نے باسٹھویں پشت یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے آسیویں پشت یعنی ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام تک بھی نسب بیان کیا ہے، لیکن اس کی صحت کا درجہ نسبیہ مزید کمزور ہے۔

الہذا یہ بات طے ہو گئی کہ آپ ﷺ کا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام تک بالکل یقینی اور قطعی ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (۲)

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى كَنَانَةً مِنْ وَلَدِ إِسْمَاعِيلَ، وَاصْطَفَى قُرَيْشاً مِنْ كَنَانَةً، وَاصْطَفَى مِنْ قُرَيْشٍ مِنْ بَنِي هَاشِمٍ، وَاصْطَفَانِي مِنْ بَنِي هَاشِمٍ) (۳) ترجمہ: (اللہ نے اسماعیل [علیہ السلام] کی نسل میں سے کنانہ کو منتخب فرمایا، پھر کنانہ میں سے قریش کو منتخب فرمایا، پھر قریش میں میں سے بنو ہاشم کو منتخب فرمایا، اور پھر بنو ہاشم میں میں سے مجھے منتخب فرمایا)۔

(۱) حاشیۃ السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ح: اص: ۳۹: (ذکر نسب النبی ﷺ) نیز: دلائل النبوة للباقی: ۱۸۰/۱، وغیرہ

(۲) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تک آپ ﷺ کا نسب یقینی ہے، البتہ اس سلسلہ نسب میں عدنان تک کا حصہ صحت اور یقین کے اعتبار سے قطعی اور مضبوط رہے، بہبعت اس حصے کے جو عدنان سے اوپر ہے.....!

(۳) مسلم [۲۲۷۶] کتاب الفضائل، باب فضل النبی ﷺ (کتاب: ۲۳، باب: ۱)

☆.....ہاشم:

رسول ﷺ کے شجرہ نسب میں جو نام آئے ہیں ان میں سے متعدد شخصیات تاریخی اعتبار سے کافی شہرت کی حامل ہیں، لیکن چونکہ آپؐ کی نسبت عام طور پر خاندان بنو ہاشم کی طرف کی جاتی ہے، لہذا سلسلہ نسب کے تفصیلی تذکرے کا آغاز بھی عموماً ”ہاشم“ سے ہی کیا جاتا ہے۔

ہاشم اپنے باپ عبد مناف کی وفات کے بعد قبیلے کے سردار منتخب ہوئے اور متولی کعبہ بھی مقرر ہوئے، یوں کعبۃ اللہ کی خدمت و نگرانی، نیز حجاج و رؤوار کی خدمت و میزبانی کا شرف انہیں حاصل ہوا، گویا دنیاوی طور پر قبیلہ قریش کی سرداری و سربراہی کے ساتھ ساتھ دینی رہنمائی کا اعزاز بھی انہی کے پاس تھا۔

☆.....عبدالمطلب:

ہاشم کی وفات کے بعد قبیلے کی سرداری، نیز کعبہ مشرفہ کی خدمت و نگرانی کی ذمہ داری ہاشم کی وصیت کے مطابق ان کے بھائی مطلب بن عبد مناف کے حصہ میں آئی جس نے کچھ عرصہ اس ذمہ داری کو بینھانے کے بعد اپنے بھائی ہاشم کے احسان کا بدلہ چکانے کی غرض سے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی اولاد میں سے کسی کو اپنا جانشیں مقرر کرنے کی بجائے ہاشم کی اولاد کو یہ شرف لوٹا دیا جائے۔

ہاشم کی ملک شام کی طرف تجارت کی غرض سے بکثرت آمد و رفت رہتی تھی اور اس سفر کا راستہ یثرب یعنی مدینہ سے گذرتا تھا جہاں اکثر دورانِ سفر ہاشم کا قیام بھی رہتا تھا، جس کی وجہ سے وہاں ان کی اچھی خاصی شناسائی بھی تھی، ایسے ہی ایک سفر کے موقع پر مدینہ میں قیام کے دوران ہاشم نے وہاں مدینہ کے ایک معروف و معزز خاندان ”بنو نجار“ کی

ایک خاتون سلمی بنت عمر سے شادی کر لی تھی، اور اس شادی کے بعد جلد ہی وہ اپنی منزل یعنی ملک شام کی طرف روانہ ہو گئے، جہاں فلسطین کے علاقے ”غزہ“ میں پہنچ کر بیمار پڑ گئے اور پھر وہیں ان کی وفات ہو گئی۔

ادھران کی وفات کے بعد مدینہ میں ان کے بیٹے کی ولادت ہوئی جس کا نام اس کی ماں نے شبیر کہا (اسے شبیرۃ الحمد بھی کہا جاتا تھا)۔ ہاشم کی اس شادی اور پھر اس بیٹے کی پیدائش کے باارے میں کہ میں ہاشم کے بھائی مُطلب کے سوا کسی کو علم نہیں تھا، البتہ مطلب نے بھی کہی اپنے اس بھتیجے کو دیکھا نہیں تھا۔

اب مُطلب کے دل میں بھائی کیلئے احسان مندی کے جذبے کے تحت جب یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھائی کے احسان کا بدلہ چکائے (کیونکہ بھائی نے اسے اپنا جانشیں مقرر کیا تھا) تو اس مقصد کیلئے اس نے سوچا کہ بھائی کے اس بیٹے کو اپنا جانشیں مقرر کرے جو کہ پیدائشی طور پر ہی باپ کی شفقت و محبت سے محروم ہے اور مکہ سے بہت دور گناہی کی زندگی برکر رہا ہے۔ چنانچہ وہ ایک روز اس کی تلاش میں مدینہ جا پہنچا، بھتیجے سے ملاقات ہوئی، اپنے فوت شدہ پیارے بھائی کی اس یادگار پر جب پہلی نگاہ پڑی تو مُطلب کی آنکھیں بھرا نہیں، اور دیر تک اسے گلے لگائے رکھا..... اس کے بعد آمد کا مقصد بیان کیا اور ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ بھتیجے نے پہلی تو انکار کیا، لیکن جب مُطلب نے زیادہ اصرار کیا تو بھتیجے نے کہا کہ میری ماں سے پوچھ لیجئے، میرے باارے میں وہ جو فیصلہ کریں گی وہی آخری فیصلہ ہو گا.....! نوجوان کے دل میں ماں کیلئے اتنی اہمیت یہ سوچ کر مُطلب کے دل میں بھتیجے کی قدر مزید بڑھ گئی اور اس کی ماں سے اس باارے میں بات کی، لیکن وہ اپنے لخت جگرو نظروں سے دور کرنے اور پر دل میں بھتیجے دینے پر کسی صورت آمادہ نہ ہوئی۔

مُطْلِب نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا بیٹا کوئی پر دیس نہیں جا رہا، بلکہ وہ تو اپنے ہی آباً اجداد کے شہر ”مکہ“ جا رہا ہے، جہاں یہ کسی اجنبی یا پر دیسی کی طرح کسی پرستی کی زندگی نہیں، بلکہ اپنے آباً اجداد کی طرح شان و شوکت کی زندگی بسر کرے گا اور اپنے باپ کی طرح اپنی قوم کا سردار ہو گا..... اس پر بھی شبیہ کی ماں راضی نہوئی، تب مُطْلِب نے کہا کہ اس سرداری و سربراہی سے بھی بڑھ کر یہ کہ تمہارا یہ بیٹا وہاں اللہ کے گھر کا متولی ہو گا..... اس سے بڑا اور کیا شرف ہو سکتا ہے.....؟ تب شبیہ کی ماں اسے اس کے چچا کے ہمراہ مکہ بھینجنے پر رضا مند ہو گئی، یوں مُطْلِب اپنے فوت شدہ بھائی ہاشم کی اس نشانی کو ہمراہ لئے ہوئے مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ ہو گیا۔

یہ سفر طے کرنے کے بعد مُطْلِب جب اپنے بھتیجے شبیہ کو لئے ہوئے مکہ پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کے سردار کے ہمراہ اونٹ پر ایک نوجوان بھی سوار ہے، تب وہ کہنے لگے کہ دیکھو ہمارا سردار اپنے لئے ایک نیا غلام خرید لایا ہے۔ جس پر مطلب نے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کوئی غلام نہیں، یہ میرا بھتیجا ہے، اور یہی تمہارا مستقبل کا سردار بھی ہے، کیونکہ میں نے اسے اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔

اس کے بعد مکہ میں مُطْلِب نے اپنے اس بھتیجے کے ساتھ ہمیشہ اس قدر شفقت و محبت اور لاڈ پیار کا معاملہ روا کھا کہ چچا کے اس حسن سلوک اور شفقت و مہربانی سے متاثر ہو کر بھتیجے نے زندگی بھر خود کو اپنے اصل نام (شبیہ) کی بجائے ”عبدالمطلب“ ہی کہلانا پسند کیا.....! یہی عبدالمطلب ہمارے پیارے نبی ﷺ کے دادا محترم ہیں، اور انہوں نے ہی ہمارے نبی ﷺ کا اسم گرامی ”محمد“ تجویز کیا تھا۔

☆..... مطلب کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے عبدالمطلب قبیلے کے سردار اور متولی کعبہ

مقرر ہوئے، یہ بہت ہی وجیہ اور باوقار انسان تھے، مکہ میں انہیں انتہائی عزت و احترام اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، ان کے دور میں دواہم ترین اور قابل ذکر واقعات پیش آئے جن کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:

(۱) زمزم کی کھدائی:

زمزم کا چشمہ تو راصل اللہ کے حکم سے حضرت ہاجرہ اور ان کے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کیلئے جاری کیا گیا تھا، لیکن صد یوں تک جاری رہنے کے بعد ایک مرحلہ ایسا آیا جب مکہ میں کسی قبائلی جنگ کے موقع پر جب مخالف قبیلہ غالب آگیا تو جاتے جاتے حسب دستور مختلف فقیم کی لوٹ مار چانے اور توڑ پھوڑ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک حرکت یہ بھی کی کہ زمزم کا کنوں وہ لوگ بند کر گئے، کیونکہ زندگی کا تمام دار و مدار تو پانی پر تھا، لہذا دشنی کے طور پر گویا وہ اہل مکہ کیلئے زندگی کا سامان ہی برپا کر گئے۔ اور پھر مرورِ زمانہ کے ساتھ نوبت بیہاں تک پہنچی کہ لوگ اس کا محل وقوع تک بھول گئے کہ یہ کنوں تھا کہاں.....؟

آخر عبدالمطلب جب قوم کے سردار اور متولی کعبہ بنے تو ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی انہیں زمزم کے کنوں کی کھدائی کا حکم دے رہا ہے، جس پر وہ بہت حیران ہوئے، پھر دوسرا رات اور پھر اس کے بعد متواتر تیسری رات بھی یہی خواب دیکھا، اور تیسری رات مزید یہ بھی ہوا کہ خواب میں اس شخص نے انہیں زمزم کے کنوں میں کا محل وقوع بھی دکھایا..... اور حکم دیا کہ اس جگہ کھدائی کرو۔

چنانچہ عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو ہمراہ لے کر اس مقام پر کھدائی شروع کی، قبیلے والوں کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ سب مصر ہو گئے کہ اس کام میں ہم سب بھی آپ کے ساتھ شریک ہوں گے تاکہ ہم بھی اس شرف اور اعزاز کے حقدار بن سکیں۔ لیکن

عبدالمطلب نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے صاف انکار کر دیا، البتہ اس موقع پر ان لوگوں کے شدید اصرار اور مسلسل دباؤ کی وجہ سے عبدالمطلب اس قدر پریشان ہوئے کہ انہوں نے منت مانی کہ ”یا اللہ اگر تو مجھے دس بیٹیے عطا کرے اور وہ سب جوان ہو کر میرے دست و بازو بن جائیں (تاکہ آئندہ کوئی مجھے اس طرح پریشان کرنے کی جرأت نہ کر سکے) تو میں ان میں سے ایک بیٹا بطور شکر تیرے اس گھر کے سامنے قربان کروں گا.....“۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس سلسلہ میں عبدالمطلب کو اپنی قوم کی طرف سے کس قدر دباؤ کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

لیکن اس قدر شدید دباؤ کے باوجود فقط یہی دونوں باپ بیٹا ہی اس کھدائی میں مسلسل مشغول رہے، یہاں تک کہ آخر کنی رو زکی مختی شاثہ کے بعد زمزم کا پانی نمودار ہو گیا، جو کہ آج تک جاری ہے، اور خلقِ خدا اس سے خوب مستفید ہو رہی ہے۔

الغرض زمزم کی کھدائی کا کام انہی دونوں باپ بیٹا نے ہی بلا شرکت غیرے مکمل کیا، لہذا یہ کنوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزندِ جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ عبدالمطلب کی بھی یادگار ہے۔

(۲) واقعہ اصحاب الْفَیل:

دوسرا ہم اور قابل ذکر واقعہ جو عبدالمطلب کے دور میں پیش آیا اور جس کا تذکرہ قرآن کریم میں سورۃ الْفَیل میں بھی موجود ہے، وہ یہ کہ ملکِ مکن کا بادشاہ جس کا نام ابرہہم تھا جب اسے اس بات کا علم ہوا کہ مکہ میں ایک گھر ہے جسے لوگ اللہ کا گھر کہتے ہیں اور اس کی انتہائی تعظیم و تکریم کرتے ہیں تو اس نے اس گھر یعنی کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کا فیصلہ کیا۔

ابرہہم کی طرف سے کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی اس ناپاک و مذموم خواہش کے پچھے اصل اور

بڑا راست محکات و اسباب کیا تھے؟ اور پھر یہ کہ جب وہ اس مقصد کیلئے یمن سے روانہ ہوا، اور پھر جب مکہ کی حدود میں پہنچا تو اس دوران کیا کیا ہوا.....؟ اس سلسلے میں کافی تفصیل ہے جو کہ کتب تاریخ میں مذکور ہے۔

خلاصہ یہ کہ کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی غرض سے وہ اپنا لشکر جرار لئے ہوئے مکہ کی حدود میں داخل ہوا اور کعبۃ اللہ کی طرف پیش قدی کی، اس لشکر میں بڑی تعداد میں ہاتھی بھی موجود تھے، جو غالباً جنگی مقاصد کیلئے استعمال کے علاوہ مزید یہ کہ کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی غرض سے بھی لائے گئے تھے۔

جب یہ لشکر مکہ کر مرد کے مضافات میں منی کے مقام پر پہنچا تو اچانک فضاء میں اللہ کی قدرت سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے غول نمودار ہوئے ہر پرندے نے اپنی چونچ اور پنջوں میں کنکریاں تھامی ہوئی تھیں، اور اس لشکر کے عین اوپر پنچ کران پرندوں نے وہ کنکریاں ان پر بر سادیں، جس سے وہ تمام لشکر ہاتھیوں سمیت نیست ونا بود ہو گیا، اور یوں اللہ نے اپنے گھر کی خود حفاظت فرمائی۔

جس سال مکہ کر مرد میں یہ واقع پیش آیا اسی سال وہاں رسول اللہ ﷺ کی ولادت با سعادت ہوئی۔

☆.....عبداللہ: (رسول اللہ ﷺ کے والد گرامی)

عبدالمطلب نے زمم کا کنوں کھو دتے وقت جو دعا مانگتی تھی وہ قول ہوئی، اللہ نے انہیں دس بیٹے عطا کئے، جو سب کے سب جوان ہوئے اور اپنے باپ کے دست و بازو بنے، ان دس جوان بیٹوں میں عبداللہ سب سے خوبصورت اور باپ کے بہت لاڈ لے تھے۔

اب عبدالمطلب کو اپنی قسم پوری کرنے کی فکر لاحق ہوئی، بیٹوں کو اپنی قسم کے بارے میں

بتایا تو سب ہی بیٹوں نے باپ کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا، جس پر قرص اندازی کی نوبت آئی، قرص کے نتیجے میں سب سے زیادہ لاڈ لے اور پیارے بیٹے یعنی عبداللہ کا نام نکلا۔ ایک روز عبدالمطلب اپنے اس لاڈ لے بیٹے کو قربان کرنے کی غرض سے جب کعبۃ اللہ کی طرف لے جانے لگے تو گھر سے روانگی کے وقت عبداللہ کی بہنوں کی حالت بگڑائی اور وہ زور زور سے رونے لگیں، جس پروہاں لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو گیا، سردار ان قریش بھی آپنچے، ان سردار ان قریش اور بہت سے عزیز و احباب نے اصرار کیا کہ عبداللہ کو قربان کرنے کی بجائے قسم پوری کرنے کا کوئی اور راستہ تلاش کیا جائے، ان لوگوں کے اس اصرار کے نتیجے میں عبداللہ کے بھائیوں میں سے ابوطالب نے بھی ہمت کی اور والد سے اتجاء کی کہ عبداللہ کو قربان نہ کیا جائے..... کوئی اور راستہ تلاش کیا جائے..... ان سب لوگوں کے شدید اصرار پر عبدالمطلب نے کہا کہ پھر تم ہی لوگ اس مسئلے کا کوئی حل مجھے بتاؤ۔

اس پر ان سب نے طے کیا کہ پیرب (مدینہ) میں جو ایک مشہور کاہنہ رہتی ہے اس سے رجوع کیا جائے وہی اس مسئلے کا کوئی حل بتائیگی۔ چنانچہ یہ لوگ طویل سفر طے کر کے مکہ سے مدینہ پہنچے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ کاہنہ تو آجکل مدینہ سے مزید آگے خیرگئی ہوئی ہے اور کچھ معلوم نہیں کہ وہاں سے اس کی واپسی کب ہوگی۔ تب یہ لوگ مدینہ سے خیرپہنچ، کاہنہ سے ملاقات ہوئی، تمام صورت حال بیان کی، جسے نکراس نے دریافت کیا کہ تمہارے یہاں اگر کوئی کسی کو قتل کر دے تو اس پر مقتول کے ورثاء کو قاتل بطورِ فدیہ (خون بہا) کیا چیز ادا کرتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے یہاں خون بہا دس اونٹ مقرر ہے۔

یہن کراہنہ نے کہا کہ ایک طرف عبداللہ اور دوسری طرف دس اونٹ رکھے جائیں اور پھر

ان دونوں کے درمیان قرعد اندازی کی جائے۔ قرعد اندازی کی گئی، نام عبداللہ کا نکلا، کاہنہ نے کہا کہ دس اونٹ بڑھادیئے جائیں، یعنی ایک طرف عبداللہ اور دوسری طرف بیس اونٹ، چنانچہ دوبارہ قرعد اندازی کی گئی، مگر نام عبداللہ کا ہی نکلا..... اس کاہنہ کے کہنے پر ہر بار دس اونٹ بڑھتے رہے اور قرعد اندازی ہوتی رہی آخر جب سواونٹ ہو گئے اور قرعد اندازی کی گئی تو قرعد اونٹوں کے نام نکلا، تب کاہنہ نے کہا کہ عبداللہ کی بجائے ان سواونٹوں کو قربان کر دیا جائے، یوں فتحم پوری ہو جائیگی۔ لیکن عبدالمطلب نے مزید اطمینان کیلئے ایک بار پھر قرعد اندازی کی اور تب بھی اونٹوں کے نام ہی قرعد نکلا..... تب عبدالمطلب مطمئن ہو گئے اور انہی خوشی خبر سے واپس مکہ پہنچے اور اپنے پیارے اور لاڑلے بیٹے کے عوض سواونٹ کعبۃ اللہ کے سامنے قربان کئے اور اور ان کا گوشت اسی جگہ غریبوں اور مسکینوں کیلئے چھوڑ دیا، اور یوں عبدالمطلب بیٹے کیجان بچ جانے پر بھی خوش ہو گئے نیز یہ کہ اب انہیں اس بات کی بھی بیحد خوشی تھی کہ ان کی فتحم پوری ہو گئی اور یوں ان کا رب بھی ان سے راضی ہو گیا۔

یوں ہمارے پیارے رسول ﷺ کے سلسلہ نسب میں قربانی کا واقعہ ایک بار نہیں بلکہ دوبار پیش آیا، پہلی بار حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ اور دوسری بار عبدالمطلب اور ان کے لخت جگر عبداللہ کے ساتھ۔

نیز یہ کہ اس واقعے کے نتیجے میں خون بہاؤں اونٹوں سے بڑھ کر اب سواونٹ مقرر ہوا جس کے نتیجے میں انسان کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ نیز قتل و خوز بیزی کے واقعات میں بھی کافی کمی آگئی کہ اب قتل کرنے سے پہلے ہر کوئی بار بار سوچتا کہ اب دس کی بجائے سواونٹ دینا پڑیں گے اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو ”رحمۃ للعلمین“ بنانا تھا..... یوں دینا نے آپ ﷺ کی

ولادت بسعادت سے پہلے ہی اس ”رحمت“ کی جھلک دیکھ لی۔

☆.....عبداللہ کی شادی:

قبیلہ قریش کے سردار عبدالمطلب کے لاڈ لے بیٹھے، ان کی آنکھوں کے نور اور دل کے سرور.....یعنی عبداللہ.....جب سوانحُوں کی قربانی کے عوض قربان ہونے سے نچ گئے.....اور زندگی کا سفر رواں دواں ہو گیا.....تو عبدالمطلب کو اپنے اس خوبصورت و خوب سیرت بیٹھ کی شادی کی فکردا من گیر ہوئی۔

قبیلہ قریش کی جو متعدد شاخیں اور پھر ان میں جو بہت سے خاندان تھے ان میں ”بنی زہرا“ کے نام سے ایک بڑا معزز خاندان تھا، اس خاندان کے سربراہ کا نام ”وہب“ تھا، وہب اپنے حسب نسب، خاندان کی سربراہی و سرداری کے علاوہ شرافت و دیانت اور اعلیٰ اخلاق و کردار کے لحاظ سے بھی بہت معروف تھے اور معاشرے میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ وہب کی ایک نہایت چیزی اور لاڈلی بیٹھی جو کہ عصمت و عفت اور شرافت و نجابت میں اپنی مثال آپ تھی اور اسی لئے خاندان میں اس کا منفرد اور ممتاز مقام تھا، اس لاڈلی بیٹھی کا نام تھا ”آمنہ“۔

عبدالمطلب کی نظر میں اپنے لخت جگر عبداللہ کیلئے قبیلہ قریش کی بہت سی خاندانی لڑکیاں تھیں، لیکن ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ کسی طرح عبداللہ کا رشتہ وہب کی اس بیٹی آمنہ کے ساتھ طے ہو جائے۔ چنانچہ یہی تمناول میں لئے ہوئے ایک روز وہ وہب کے گھر پہنچے، مدعی بیان کیا، اپنے بیٹھے عبداللہ کیلئے آمنہ کا رشتہ مانگا۔..... جسے وہب نے بخوبی قبول کر لیا۔ یوں ہمارے پیارے نبی ﷺ کے گرامی قدر والدین رغیب زوجیت میں مسلک ہو گئے!

اس شادی کے محض چند ہفتے بعد عبداللہ اپنے والد کی تجارت کے سلسلے میں ملک شام کی طرف جانے والے قافلے کے ہمراہ روانہ ہو گئے، جبکہ اس دوران ان کی اہلیہ مختارہ یعنی ”آمنہ“، ”امانت دار نورِ محمدی“ بن چکی تھیں.....!

ملک شام سے واپسی کے موقع پر راستے میں عبداللہ بیمار پڑ گئے، اور یہ قافلہ جب مدینہ کی حدود میں پہنچا تو ان کی طبیعت اس قدر ناساز ہو گئی کہ وہ مزید سفر جاری رکھنے کے قابل نہ رہے اور مدینہ میں ہی رک گئے (۱) جبکہ قافلہ انہیں چھوڑ کر منزل کی جانب روانہ ہو گیا..... مکہ پہنچ کر قافلے والوں نے عبدالالمطلب کو جب بیٹے کی بیماری کی اطلاع دی تو وہ انتہائی پریشان اور فکر مند ہو گئے اور فوراً اپنے بڑے بیٹے حارث کو عبداللہ کی خبر گیری کیلئے مدینہ کی طرف روانہ کیا، حارث انتہائی سرعت کے ساتھ جب یہ طویل سفر طے کر کے مدینہ پہنچ تو معلوم ہوا کہ عبداللہ کی وفات ہو چکی ہے اور انہیں مدینہ کے محلہ ”دار النابغہ“ میں دفن کیا جا چکا ہے..... اس پر حارث انتہائی رنجیدہ و افسوس دہ ہوا، اور فوراً ہی مکہ کی طرف واپس لوٹ گیا، اور مکہ واپس پہنچنے پر اس نے اپنے والد عبدالالمطلب کو یہ افسوسناک خبر سنائی!..... انتقال کے وقت جناب عبداللہ کی عمر صرف پچیس برس تھی، جبکہ سیدہ آمنہ کی عمر اس سے بھی کم تھی۔ یوں سیدہ آمنہ اپنے محبوب شوہر کی امانت لئے ہوئے، عین عالم شباب میں یہو ہو گئیں..... جبکہ وہ امانت ابھی اس دنیا میں آئی بھی نہیں تھی۔

(۱) مدینہ میں عبداللہ نے خاندان ”بنو جبار“ میں قیام کیا تھا، جو کہ ان کی دادی کا خاندان تھا، بعد میں بھرت مدینہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی اوثقی اللہ کے حکم سے جب مسلسل چلتی چلی جا رہی تھی، آخر ”بنو جبار“ کے اسی محلے میں پہنچ کر خود بخود رک گئی تھی..... آپ نے وہیں قیام فرمایا تھا اور مسجد نبوی بھی اسی مقام پر تعمیر کی گئی تھی، آپ کی مدینہ آمد کے موقع پر بنو جبار کی پیچاں نہایت والہانہ انداز میں خیر مقدمی اشعار پڑھ رہی تھیں ”طلع البدر علينا.....“

ولادت با سعادت:

رسول ﷺ کی ولادت با سعادت سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ کے وقت جو دعاء مانگی تھی، اس دعاء کی قبولیت کا وقت اب آپ کا تھا۔

نیز جس مقصد کی خاطر انہوں نے اپنی ذریت کے ایک حصے کو وہاں اس ویران و منسان اور بے آب و گیاہ مقام پر چھوڑا تھا..... اس مقصد کی تکمیل کا وقت اب آپ کھچا تھا۔

مکہ کرمہ میں جس سال عام اغیل کا واقعہ پیش آیا، اسی سال اس واقعے کے تقریباً ڈیرہ ماہ بعد شہر مکہ میں آباد خاندان بنوہاشم میں ”آمنہ کے لال“ یعنی ہمارے پیارے نبی ﷺ کی ولادت ہوئی..... موسم بہار کی ایک صبح اس مبارک شہر میں ایسا پھول کھلا جس نے اپنی مہک اور خوبصورت سارے عالم کو متعطر کرنا تھا..... ایک ایسا آفتاب جگل گایا جس نے اپنی روشنی سے تمام کائنات کو بقعہ نور بنانا تھا..... رشد و ہدایت کا ایسا دریچہ کھلا جس نے اس سلسلہ نبوت کی تکمیل کرنا تھی جس کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی تھی۔

رسول ﷺ کی ولادت کے بارے میں تمام اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ ماہ ربیع الاول میں ولادت ہوئی، نیز دن کے بارے میں بھی سب کا اتفاق ہے کہ پیر کا دن تھا۔

البتہ تاریخ ولادت کے بارے میں اہل علم کے متعدد اقوال ہیں، جن کے مطابق تاریخ نو سے بارہ کے درمیان تھی۔ متعدد قدیم و جدید اہل علم، موّخین، نیز مہرین فلکیات کی نظر میں صحیح ترین تاریخ ۹ ربیع الاول ہے۔ البتہ عام مشہور یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یوم ولادت ۱۲ ربیع الاول ہے۔

آپ ﷺ کی ولادت باسعادت کے موقع پر من جانب اللہ متعدد اشارات و بشارات کا ظہور ہوا، مثلاً آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ نے آپ ﷺ کی ولادت سے چند روز قبل خواب میں بہت بڑی روشنی دیکھی، نیز آپ ﷺ کی ولادت کے موقع پر بہت بڑا نور دیکھا جس سے اطراف واکناف کی ہر چیز روشن ہو گئی۔ اس کے علاوہ بعض عجیب و غریب حالات و حوادث اور غیر معمولی واقعات بھی پیش آئے، مثلاً اس وقت دنیا کی عظیم الشان اور انتہائی طاقتور مملکت یعنی فارس کے سب سے بڑے آتش کدے میں مسلسل ایک ہزار سال سے روشن آگ، جس کی وہ پوچا کیا کرتے تھے، اچانک بجھ گئی، کسری شاہ فارس کے عظیم الشان اور فلک بوس محل کی چند بر جیاں اچانک ٹوٹ کر نیچے آگریں اور زمین بوس ہو گئیں.....!!
 یہ سب کچھ درحقیقت اس بات کے غیبی اشارے تھے کہ اس نومولود کو اللہ عز وجل کی طرف سے جو دین عطا کیا جائے گا وہ بہت جلد مشرق و مغرب میں ہر جگہ چھا جائیگا اور قیصر و کسری کی عظیم الشان سلطنتیں عنقریب اس کے قدموں میں ہوں گی.....!!



ایام رضاعت و طفولت:

☆.....حليمه سعد يه کي گود میں:

رسول ﷺ کی ولادت بسعادت کے بعد سب سے پہلے آپؐ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ نے اپنے لخت جگر کو چند روز تک خود دودھ پلایا، اس کے بعد کچھ مدت کیلئے ابوالہب کی کینز رویہ نے یہ خدمت انجام دی، اور اس کے بعد یہ شرف قبیلہ بنو سعد سے تعلق رکھنے والی حليمه سعد يه کے حصے میں آیا۔

در اصل مکہ کے شرقاء میں یہ روانج تھا کہ وہ اپنے شیر خوار بچوں کو کچھ عرصہ کیلئے ”بادیہ“ (گاؤں) میں رکھنا پسند کرتے تھے، تاکہ شہر کے آلوہ ماہول سے دور صاف ستھری اور خالص آب و ہوا میں بچے کی صحت پر خوشگوار اثرات مرتب ہوں اور اس کی نشوونما بھی اچھی ہو۔ نیز یہ کہ شہر میں چونکہ بیرونی لوگوں کی بکثرت آمد و رفت رہا کرتی ہے، لہذا ان کے ساتھ مسلسل اختلاط اور میل جوں کی وجہ سے زبان بھی خالص نہیں رہتی اور لب و ہجہ بھی متاثر ہوتا ہے، جبکہ گاؤں والوں کی زبان خالص ہوا کرتی ہے اور اس میں دوسری کسی زبان کی ملاوٹ کا احتمال نہیں ہوتا۔

چنانچہ جن دنوں رسول ﷺ کی ولادت ہوئی آپؐ کی والدہ ماجدہ نے بھی حسب دستور اپنے لخت جگر کو گاؤں بھجنے کا ارادہ کیا، اتفاق سے انہی دنوں بادیہ بنی سعد سے تعلق رکھنے والی کچھ عورتیں بچے گود لینے کی غرض سے شہر مکہ کی جانب روانہ ہوئیں، جن میں حليمه سعد يه بھی تھیں، مکہ پہنچنے کے بعد شہر میں گھوم پھر کر سب ہی عورتوں نے کوئی نہ کوئی شیر خوار بچے گود لے لیا، جبکہ حليمه کو کوئی بچہ نہ مل سکا، البتہ ایک پتیم بچہ تھا جسے کسی عورت نے محض اس

وجہ سے اپنا ناقول نہیں کیا تھا کہ اس یتیم بچے کو گودلے کر شاید کوئی معتقل معاوضہ اور مالی فائدہ نہ مل سکے..... اور پھر یتیم بھی ایسا کہ جس نے باپ کا نام تو سنا ہو..... مگر آنکھیں باپ کی صورت دیکھنے کو ترسی ہوں جس کا باپ اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکا.....!

حیمه کو چونکہ کوئی بچہ نہیں مل سکتا تھا اس لئے سوچا کہ خالی ہاتھ واپس جانے سے بہتر ہے کہ اس یتیم کو ہی قبول کر لیا جائے، چنانچہ بادل ناخواستہ اسے گودلے لیا..... جس یتیم بچے کو گود لینے پر حیمه رنجیدہ ولبرداشتہ تھیں اور اس چیز کو اپنی ناکامی تصور کر رہی تھیں انہیں کیا خبر تھی کہ اظاہر تو یہ ناکامی تھی..... لیکن ایسی ناکامی پر ہزاروں کامیابیاں قربان ہو جائیں!

حیمه خوب بھی لا غرفاقتہ زدہ تھیں الہذا بقول ان کے خود ان کے اپنے شیرخوار بیٹے کو بھی پیٹ بھر کر دودھ پینا نصیب نہیں ہوا تھا، لیکن اُس وقت جب انہوں نے بنوہاشم کے اس ”ڈر یتیم“ کو گود لیا اور پہلی بار اسے اپنا دودھ پلایا تو اس نے خوب سیر ہو کر دودھ پیا اور اس کے بعد دریتک سوتار ہا، اورتب حیمه نے اپنے حقیقی بیٹے کو بھی دودھ پلایا تو پہلی بار اس نے بھی خوب پیٹ بھر کر دودھ پیا اور اس کے بعد وہ بھی دریتک سوتار ہا..... یہ بات حیمه اور ان کے شوہر (حارث بن عبدالعزیز) کیلئے انتہائی جیرت انگیز تھی۔ ان کی ایک بکری اور ایک اونٹی بھی اس سفر میں ہمراہ تھی، وہ دونوں بھی فاقہ زدہ تھیں اور ان کا دودھ نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن اس روزان دونوں نے بھی خوب زیادہ دودھ دیا، حیمه اور ان کے شوہرنے کے اس روز خوب بھی بھر کر دودھ پیا۔

گاؤں سے مکہ شہر کی طرف آتے وقت کیفیت یہ تھی کہ حیمه کی گدھی کمزوری کی وجہ سے سب

سے پیچھے پیچھے چل رہی تھی اور حلیمہ کی سہیلیاں بار بار راستے میں رک کر اس کا انتظار کرتی تھیں..... لیکن اب مکہ سے گاؤں کی طرف واپسی کا وقت آیا تو کیفیت یہ ہوئی کہ حلیمہ کی وہی گدھی اس قدر چست اور تیز رفتار ہو گئی کہ سب سے آگے دوڑ نہ لگی، جس پر حلیمہ کی سہیلیاں بار بار انہیں پیچھے سے پکارتیں کہ حلیمہ رک جاؤ..... کچھ ہمارا بھی تو خیال کرو..... اور بار بار پوچھتیں کہ حلیمہ کیا یہ تہاری وہی گدھی ہے.....؟ حلیمہ جواب دیتیں کہ ہاں یہ وہی تو ہے..... اس پر وہ کہتیں کہ وَاللَّهِ إِنَّ لَهَا لَشَانًا یعنی ”بخدا آج تو اس کی شان ہی نرالی ہے.....!“

اسی طرح گاؤں پہنچنے کے بعد ان کی کھتی باڑی اور غلہ و خوراک وغیرہ..... غرضیکہ ہر چیز میں نہایت تیزی کے ساتھ حیرت انگیز طور پر بہتری اور برکت کے آثار نمایاں ہوتے چلے گئے، خود حلیمہ کی صحت بھی بہت اچھی ہو گئی..... جس پر وہ دونوں میاں بیوی انتہائی حیران بھی تھے اور بہت زیادہ خوش بھی، حتیٰ کہ ایک روز حلیمہ کے شوہرن انہیں کہا: (تَعْلِيمٰي وَاللَّهُ يَا حَلِيمَة！لَقَدْ أَخَذْتِ نَسَمَةً مُبَارَكَةً.....) یعنی: ”حلیمہ! یقین کرو، بخدا مجھے تو یوں لگتا ہے کہ تم یہ جو بچہ لائی ہو یہ انتہائی مبارک ہے.....“! اس پر حلیمہ نے برجستہ جواب دیا: (وَاللَّهُ إِنِّي لَأَرْجُو ذَلِكَ) یعنی: ”بخدا مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے.....“۔

اور یوں حلیمہ سعدیہ اور ان کے افرادِ خانہ کو اس ”دُرِیتِم“ کی قدر و قیمت کا مکمل اور اک واحساس ہوا اور وہ اس کی بدولت فیوض و برکات کا اپنی کھلی آنکھوں سے مسلسل مشاہدہ بھی کرتے رہے اور خوب مستقید و مستفیض بھی ہوتے رہے.....!

دو سال دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے..... حلیمہ کا دل بالکل نہیں چاہتا تھا کہ یہ بچہ ان کی آنکھوں سے واپس چلا جائے، لیکن مدتِ رضاعت پوری ہو چکی تھی، الہذا بدل ناخواستہ وہ اسے

کی والدہ کے پاس مکہ شہر لے گئیں، بچے کی والدہ نے اپنے لخت جگر کی اتنی اچھی صحت دیکھی تو انہائی خوش ہوئیں، ماں کی یہ خوشی دیکھ کر حلیمه نے موقع مناسب سمجھا اور ڈرتے ڈرتے کہا کہ ”آپ دیکھ رہی ہیں کہ گاؤں کی صاف ستری فضاء میں بچے کی صحت کتنی عمدہ ہے، لیکن اب مجھے یہ فکر ستارہ ہی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب یہاں شہر میں اس کی صحت خراب ہو جائے..... اس لئے میں چاہتی ہوں کہ..... اگر آپ اجازت دیں تو میں بچے کو مزید کچھ عرصہ کیلئے واپس اپنے ہمراہ لے جاؤں..... بی بی آمنہ دیکھ رہی ہی چکی تھیں کہ بادیہ بی بی سعد میں رہتے ہوئے بچے کی صحت خوب عمدہ ہے اور وہاں کی آب وہاں کو خوب موافق آئی ہے، نیز انہوں نے اپنے لخت جگر کیلئے حلیمه کا جب یہ جذبہ اور پیار بھی دیکھا تو وہ مسکرائیں اور مزید کچھ عرصہ کیلئے بچے کو لے جانے کی اجازت دے دی۔

☆..... حادثہ شق صدر:

حلیمه اس بچے (رسول ﷺ کی واپسی پر بہت خوش تھیں، اور یوں بادیہ بی سعد میں مزید تین سال (یعنی کل پانچ سال) گزر گئے، لیکن ایک روز نہایت عجیب واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے حلیمه انتہائی خوفزدہ اور پریشان ہو گئیں۔ ہوا یہ کہ یہ بچہ ایک روز جب گاؤں کے دوسرے ہم عمر بچوں کے ہمراہ کھیل کو دیں مشغول تھا کہ اچانک وہاں کوئی اجنبی نمودار ہوا، اور اس نے بچے کو زمین پر لٹا کر اس کا سینہ چاک کر دیا۔.... دوسرے بچوں نے جب یہ منتظر دیکھا تو فوراً ڈرتے ہوئے حلیمه کے گھر پہنچے اور بتایا کہ کسی نے محمد ﷺ کو قتل کر دیا ہے۔ حلیمه انتہائی پریشانی کے عالم میں وہاں پہنچیں تو دیکھا کہ گھبراہٹ کی وجہ سے آپؐ کے چہرے کارنگ قدرے بدلا ہوا ہے۔

درحقیقت وہ اجنبی شخص جریل امین علیہ السلام تھے جو اللہ کے حکم سے وہاں آئے تھے،

انہوں نے رسول ﷺ کا سینہ چاک کر کے قلب مبارک باہر نکالا، اور اس میں سے سیاہ نقطے کی مانند جمے ہوئے خون کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نکال کر یہ کہتے ہوئے پھینک دیا کہ ”یہ شیطان کا حصہ ہے“ (یعنی اس حصے کو دل سے نکال کر پھینک دیتا کہ شیطان کبھی آپ پر غالب نہ آسکے) پھر آپ کے دل کو سونے کی طشتہ میں رکھ کر آب زرم سے دھویا، اس میں ایمان و حکمت کا جوہر بھرا، اور پھر اسے اسی طرح جوڑ کر سینے میں اس کے مقام پر رکھ دیا۔ (۱) دراصل یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے ایک قدم کا روحاںی آپریشن اور سامانِ عصمت تھا۔

اس حادثہ کی وجہ سے حلیمه سعدیہ بہت زیادہ گھبرا گئیں، اور آپ کی سلامتی کو مدد نظر رکھتے ہوئے چند روز بعد آپ گومکہ شہر میں آپ گی والدہ ماجدہ کے پاس چھوڑا گئیں۔

☆.....والدہ کی کفالت میں:

بادیہ بنی سعد میں تقریباً پانچ سال گزارنے کے بعد آپ ﷺ اپنی والدہ کے سایہ شفقت میں واپس پہنچ گئے۔ جب چھ سال کے ہوئے تو والدہ نے اپنے شوہر نامار (یعنی عبداللہ بن عبدالمطلب سے خلوص ووفاء کے اظہار کے طور پر مدینہ کا سفر کیا، اس سفر میں کمسن بیٹے (یعنی آپ ﷺ) کو بھی یہ سوق کر ہمراہ لیا کہ بیٹے کو باپ کی شکل دیکھنا تو نصیب نہ ہوا کا..... کم از کم اب اسے باپ کی قبر کی زیارت ہی نصیب ہو جائے۔ اس سفر میں کنیز امام ایک بھی ہمراہ تھیں، یہ کمسن بچے اس طویل اور کھن سفر میں مناظر فطرت کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کرتا رہا، اس مختصر قافلے نے مدینہ میں تقریباً ایک ماہ قیام کیا۔ (۲)

(۱) ملاحظہ ہو حدیث: ان رسول اللہ ﷺ اتاه جبریل و هو يلعب مع الغلمان ، فصرعه فشق عن قلبہ فاستخرجه (مسلم: ۲۸۰، کتاب الایمان)۔ (۲) یہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

☆.....والدہ کی وفات:

آپ ﷺ کی والدہ بی بی آمنہ مدینہ میں تقریباً ایک ماہ قیام کے بعد جب مکہ کی طرف واپس روانہ ہوئیں تو راستے میں انہتائی تندو تیز اور گرم صحرائی ہوا تو نے آلیا، جس کی وجہ سے شدید بیمار پڑ گئیں، راستے میں علاج کا کوئی انتظام تھا اور نہ ہی راحت و آرام کا کوئی بندوبست..... چند روز کی اس عالالت کے بعد آخر مدینہ اور مکہ درمیان ”ابواء“ نامی مقام پر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں.....! اور انہیں اسی مقام پر ہی دفن کر دیا گیا۔
 کمسن بچے نے اپنی معصوم آنکھوں سے ماں کو یوں پر دیں میں نزع اور موت کی کشمکش سے گذرتے دیکھا..... جس سے اس کا گدازِ قلب مزید بڑھ گیا۔

☆.....دادا کی کفالت میں:

اُمِ ایمن جو اس سفر میں ہمراہ تھیں، پر دیں میں بی بی آمنہ کی عالالت اور پھر وفات کے بعد اس کمسن بچے کو ہمراہ لئے ہوئے وہیں مکہ پہنچیں اور وہاں اسے اس کے دادا عبدالمطلب کے حوالے کر دیا..... یہ بچہ اس سفر کیلئے ماں کی انگلی تھا میں جب گھر سے روانہ ہوا تھا

[باقیہ از حاشیہ صحیحہ گذشتہ:]

(۲) آپ ﷺ جب بعد میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور وہاں مستقل قیام کیا، تب ایک روز آپ جب بننجار کے ایک محلے سے گذر رہے تھے آپ کی نگاہ اس مکان پر پڑی جہاں آپ نے بیچپن میں اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ سفر مدینہ کے موقع پر قیام کیا تھا، اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود آپ نے اس مکان کو پہچان لیا، اور پھر سن آٹھ ہجری میں فتح مکہ کی غرض سے مدینہ سے مکہ کی جانب سفر کے دوران راستے میں ابواء نامی مقام پر آپ اپنی والدہ کی قبر پر بھی گئے، اور وہاں خوب روئے، جیسا کہ حدیث کے الفاظ ہیں زار النبی ﷺ قبر اُمہ فَبَكَى وَ أَبْكَى مَنْ حَوَّلَهُ ”یعنی آپ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اور تب آپ نو دھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا.....“ (مسلم: ۶۷۹، کتاب الجنازہ)۔

تب سر پر باب کا سایہ نہ تھا..... اور اب اس طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد جب واپس مکہ میں اپنے گھر پہنچا تو کیفیت یہ تھی کہ ماں کی متاثر بھی محروم ہو چکا تھا.....!
یوں ہمارے پیارے رسول ﷺ اپنی پیاری ماں کی وفات کے بعد اب اپنے دادا محترم یعنی جناب عبدالمطلب کی کفالت میں آگئے، اُس وقت آپؐ کی عمر مبارک چھ سال تین ماہ اور دس دن تھی۔ (۱)

دادا نے جب اپنے اس یقین پوتے کو اپنے دامن کفالت و تربیت میں لیا تو بھی بھر کر اسے پیار دیا، اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا، اور اپنے بچوں سے بھی بڑھ کر اس کے ساتھ ہمیشہ لاڈ اور پیار کیا، وہ آپ ﷺ کو ہمیشہ اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے، دن بھر آپ ﷺ کو اپنے ساتھ ہی رکھتے، اور رات کو جب آپ ﷺ سوچاتے تو وہ بار بار اٹھ کر آپ ﷺ کی خبر گیری کیا کرتے۔

عبدالمطلب چونکہ اپنے قبیلہ کے سردار ہونے کے علاوہ متولی کعبہ بھی تھے اس لئے کعبۃ اللہ کے قریب ان کیلئے خاص منصب چھائی جاتی تھی جس پر کبھی کسی کو بیٹھنے کی جرأت نہوتی، یہاں تک کہ ان کے اپنے بیٹے بھی جب وہاں آتے تو اس منصب کے آس پاس بیٹھ جاتے..... مگر آپ ﷺ کو عبدالمطلب ہمیشہ اس منصب خاص پر اپنے ساتھ ہی بیٹھاتے، اگر کبھی کوئی آپ ﷺ کو وہاں سے اٹھانے کی کوشش کرتا تو عبدالمطلب یوں کہتے: دُعَاوا ابْنِي ! فَوَاللَّهِ إِنَّ لَهُ لَشَانًا..... یعنی: ”میرے بیٹے کو یہیں بیٹھا رہنے دو، کیونکہ اللہ کی قسم اس کی توشان بڑی ہی نرالی ہے.....“، اور ساتھ ہی فرط محبت سے آپ ﷺ کی پشت پر ہاتھ پھیرتے اور آپ ﷺ کے اس انداز شاہانہ اور استغناء کو دیکھ کر خوش ہوا کرتے۔

(۱) الفصول فی سیرۃ الرسول ﷺ، از: ابن کثیر، صفحہ: ۹۳۔

لیکن آپ دادا کی اس شفقت سے بھی جلد ہی محروم ہو گئے جب یہاں سال کی عمر پا کر یہ شفقت و مہربان دادا بھی رائی ملک عدم ہو گئے، اور مکہ مکرمہ میں محلہ جون میں دفن ہوئے۔

جب ان کا جنازہ اٹھا تو آپ ﷺ بھی ساتھ تھے، شدتِ غم اور فرطِ محبت سے اُس وقت آپ جنازے کے ہمراہ روتے جا رہے تھے.....!

اُس وقت آپ کی عمر مبارک صرف آٹھ سال دو ماہ اور دس دن تھی۔ (۱)

☆ ابوطالب کی کفالت میں:

رسول ﷺ کے دادا محترم عبدالمطلب نے وفات سے قبل وصیت کی تھی کہ ان کے بعد آپ کی کفالت و تربیت آپ کے پیچا ابوطالب کے ذمہ ہوگی، چنانچہ ابوطالب نے اس عظیم ذمہ داری کو بہت ہی احسن طریقے سے تادم آخربنحا یا، آپ سے وہ اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپ گوہیشہ اپنی اولاد سے بھکر چاہا اور اپنے بچوں پر مقدم رکھا، جب سوتے تو آپ گوساتھ لے کر سوتے، اور جب باہر جاتے تو آپ گوساتھ لے کر جاتے۔

یوں زندگی کے دن گذرتے رہے..... وقت کا پہیہ چلتا رہا..... اور آپ ابوطالب کی زیر سر پرستی بچپن اور کم سنی کی حدود سے گذرنے کے بعد اڑکپن کی عمر میں داخل ہو گئے اور اب کچھ ہوش سنبھالا تو محسوس کیا کہ چونکہ آپ کے مشق و محن چھا قلیل المال اور کثیر العیال ہیں، لہذا تلاشِ معاش کے سلسلہ میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہئے۔ چنانچہ اس جذبے کے تحت آپ نے اس دور میں کبریاں بھی چراکیں اور محنت و مشقت بھی کی۔ (۲)

(۱) البدایۃ والنهایۃ لا بن کثیر، وغیرہ۔

(۲) یہاں یہ ذکر ہے کہ ابوطالب کی معاشری تاگ دستی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ متولیِ کعبہ بھی تھے، جاج کی خدمت، دیکھ بھال اور مہمان نوازی اپنی کے ذمہ تھی، جسے اس دور کے رواج کے مطابق وہ اپنے لئے بڑا فخر سمجھتے تھے اور اس راہ میں بڑی فراغتی کے ساتھ اپنامال خرچ کیا کرتے تھے۔

مرحلہ شباب:

☆.....تجارت:

چونکہ مکہ اور اس کے مضافات میں زراعت کا کہیں کوئی وجود نہیں تھا، الہذا قریش کی معیشت کا تمام تر انحصار تجارت پر تھا۔ بنو ہاشم کے جداً مجد یعنی خود ہاشم کا بھی یہی ذریعہ معاش تھا، اور اب ابو طالب کا بھی یہی پیشہ تھا۔

رسول ﷺ نے بچپن اور پھر رُکپن کی منزلیں طے کرنے کے بعد نوجوانی کے مرحلے میں جب قدم رکھا تو آپؐ نے بھی تجارت کو یہی اپنا ذریعہ معاش بنایا، اور اس دور میں اپنے سر پرست اور مشفق چچا ابو طالب کے ہمراہ آپؐ نے متعدد تجاری سفر بھی کئے۔ ان دونوں تجارت کے حوالے سے چہار سو آپؐ کے حسن معاملہ، راست بازی اور امانت و دیانت کے چرچے ہونے لگے، اپنے اور پرانے، دوست و شمن سبھی آپؐ کو ”صادق و امین“ کے لقب سے پکارنے لگے !!.....

☆.....حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح:

خدیجہ بنت خویلدا نہائی شریف نفس اور صاحبِ حیثیت خاتون تھیں، مکہ میں ان کا خاص مقام و رتبہ تھا اور قریش کے عوام و خواص سبھی انہیں نہایت عزت و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں رسول ﷺ کے خاندان سے جا ملتا ہے، وہ بیوہ تھیں، اپنی شرافت نفس، پاکیزگی اخلاق اور عرفت و عصمت کی وجہ سے زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ انہیں ”طاهرا“ کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا کاروبار اس قدر سعی پیانا پر تھا کہ اہل مکہ کا جب کوئی تجارتی قافلہ روانہ ہوتا تو اس میں اکثریت حضرت خدیجہؓ کے مال و اسباب سے لدے ہوئے اونٹوں کی ہوتی، اپنے کاروباری امور کی انجام دہی نگرانی کی غرض سے حضرت خدیجہؓ مختلف اشخاص کی خدمات حاصل کیا کرتی تھیں۔

انہی دنوں حضرت خدیجہؓ کو جب رسول اللہ ﷺ کی راست بازی اور امانت و دینت کی خبریں ملیں تو انہوں نے آپؐ کو یہ پیغام بھجوایا کہ آئندہ جو تجارتی قافلہ مکہ سے ملک شام کیلئے روانہ ہو گا اس کی نگرانی آپؐ کریں، ساتھ ہی معقول معاوضے کا بھی وعدہ کیا۔

آپؐ نے اپنے سرپرست مشفیق چچا ابوطالب سے مشورے کے بعد اس پیشکش کو قبول فرمایا اور سفر شام کیلئے تیار ہو گئے۔

چنانچہ آپؐ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال تجارت لے کر ملک شام کی طرف روانہ ہوئے، توفیق الہی سے اس سفر میں بہت زیادہ منافع ہوا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ”میسرہ“ نامی اپنا ایک غلام بھی اس سفر میں آپؐ کے ہمراہ روانہ کیا تھا، اس نے واپس مکہ پہنچنے پر حضرت خدیجہؓ کے سامنے آنکھوں دیکھا حال بیان کیا، آپؐ کی راست بازی، معاملہ فہمی، پرہیز گاری، امانت و دینت، فہم و فراست، حسن تعامل، و دیگر صفاتِ حمیدہ کا تذکرہ کیا، یہ سب کچھ حضرت خدیجہؓ کیلئے انتہائی فرحت و مسرت اور اطمینان کا باعث بنا۔

حضرت خدیجہؓ اس سے قبل دوبار یوہ ہو چکی تھیں، ان کا پہلا نکاح عقیق مخزوی سے اور پھر اس کی موت کے بعد دوسرا نکاح ہندستی میں سے ہوا تھا۔

دوسری بار بھی جب وہ یوہ ہو گئیں تو ان کے مقام ورتے اور مال و دولت کی وجہ سے بڑے بڑے سرداران قریش متعدد بار انہیں پیغام نکال بھجوا چکے تھے، لیکن حضرت خدیجہؓ اپنی

ذہانت و فہم و فراست کی وجہ سے اس حقیقت کو خوب جان پچکی تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی مغلص نہیں ہے، یہ سمجھی لوگ لاپچی اور محض مال و جمال کے بھوکے ہیں..... اسی لئے وہ ایسے تمام پیغامات کو رد کر چکی تھیں۔

ایسے میں رسول اللہ ﷺ جب حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت لے کر گئے اور اس سفر میں منافع بہت زیادہ ہوا..... اور پھر یہ کہ سفر سے واپسی پر آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کو اس تجارت کا حساب و کتاب پیش کیا..... اور چپ چاپ چل دیئے.....!

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بس سوچتی ہی رہ گئیں کہ کس قدر عجیب و غریب ہے یہ نوجوان کس قدر سچا اور مغلص ہے یہ انسان..... کس قدر سچی اور صاف ستری ہے اس کی تجارت..... کتنی معصومیت ہے اس کی ہر ادائیں..... دوسروں کی نسبت منافع کس قدر زیادہ لایا ہے..... لیکن معاوضے کے معاملے میں کوئی تقاضا نہیں..... کوئی مطالہ نہیں..... کوئی بحث و تکرانہیں..... معاوضہ جو ملابس چپ چاپ قبول کر لیا.....!

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کیلئے یہ سب کچھ انتہائی باعثِ حرمت تھا..... ایک طرف مسلسل پیغامات سمجھنے والے بڑے بڑے سردار ان قریش جو کہ دراصل حرص و طمع کے مارے ہوئے اور مال و زر کے پچاری تھے..... اور دوسری طرف سیدھا سادھا سچا، مغلص اور اس قدر رقابت پسند، متوكل و قانع قدم کا یہ نوجوان.....!

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو آپ ﷺ کی بھی ادا بھا گئی، اور وہ سمجھ گئیں کہ یہی تو ان کی وہ متارع گشیدہ ہے جس کی وہ مدت سے متناشی تھیں.....!

تب حضرت خدیجہؓ نے اپنے دل کی بات اپنی ایک خاص رازدار سہیلی نفیسه بنت منظہ سے کہی، اور انہیں آپ ﷺ کی طرف پیغام نکاح لے کر جانے کو کہا۔ نفیسه نے یہ پیغام آپؐ

تک پہنچایا، جس پر آپ ﷺ نے اپنے چھاؤں خصوصاً جناب ابو طالب اور حضرت حمزة سے مشورہ کیا، ان دونوں نے اس رشتے کی تائید کی، اور پھر یہ دونوں آپ ﷺ کی طرف سے اظہار رضامندی کے طور پر حضرت خدیجہؓ کے پچاعمرو بن اسد کے پاس پہنچے اور آپؓ کی طرف سے رضامندی کی انہیں اطلاع دی، اور یوں آپ ﷺ اور حضرت خدیجہؓ رضی اللہ عنہا اس رشتہ ازدواج میں مسلک ہو گئے، اور یہ مبارک ترین رشتہ حضرت خدیجہؓ رضی اللہ عنہا کی وفات تک، یعنی مسلسل چھپیں برس قائم رہا۔

رسول ﷺ کی یہ پہلی شادی تھی، جبکہ حضرت خدیجہؓ اس سے قبل دوبار بیوہ ہو چکی تھیں، اس شادی کے وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک چھپیں سال، جبکہ حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال تھی۔

بعض فضائل اُم المؤمنین حضرت خدیجہؓ رضی اللہ عنہا:

ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ رضی اللہ عنہا کے مقام و رتبے کا اندازہ اس بات سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ ایک بار جریل امین علیہ السلام جب رسول ﷺ کے پاس تشریف لائے تو فرمایا: (یَا رَسُولَ اللَّهِ ! هَذِهِ خَدِيجَةٌ قَدْ أَتَتَتْ ، مَعَهَا إِنَاءٌ وَ طَعَامٌ ، فَإِذَا أَتَتْكَ فَاقْرِأْ عَلَيْهَا السَّلَامَ مِنْ رَبِّهَا وَمَنِي ، وَبَشِّرْهَا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ ، لَا صَحَبَ فِيهِ وَلَا نَصَبَ) (۱) یعنی: (اے اللہ کے رسول! یہ خدیجہؓ چلی آرہی ہیں، ایک برتن اور کچھ کھانا لئے ہوئے جب وہ آپؓ کے پاس آئیں تو آپؓ انہیں ان کے رب کی طرف سے نیز میری طرف سے سلام کہیں، اور انہیں جنت میں ایسے گھر کی خوشخبری بھی سنائیں جو ہرے کا بنا ہوا ہے، اس گھر میں نہ کوئی شو و شغب ہو گا اور نہ

صحیح بخاری [۳۸۲۰] کتاب المناقب، باب تزویج النبی ﷺ خدیجہ وفضلہا۔ نیز [۷۲۹۷] کتاب التوحید۔

ہی کوئی تھکا وٹ)۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول ﷺ کے ساتھ اس مبارک رشیۃ ازدواج میں مسلک ہو جانے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پچپس برس تک مسلسل آپ ﷺ کیلئے خلوص ووفاء کا پیکر بنی رہیں، زندگی بھرا آپؐ کی خدمت و اطاعت، آپؐ کے ساتھ حسن سلوک اور عزت و احترام کی نادر مثال قائم کی۔ جبکہ آپ ﷺ کو بھی حضرت خدیجہؓ سے بے پناہ محبت تھی، آپؐ نے ان کی زندگی میں اور کوئی نکاح نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد آپؐ زندگی بھرا نہیں یاد کرتے رہے اور مختلف مواقع پر نہایت بیتابی کے ساتھ ان کا ذکر خیز کرتے رہے۔

ایک موقع پر آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا:

(.....آمَنْتُ بِي إِذْ كَفَرَ بِالنَّاسُ، وَصَدَّقْتُنِي إِذْ كَذَّبَنِي النَّاسُ، وَوَاسْتَنِي بِمَا لَهَا إِذْ حَرَمْنِي النَّاسُ، وَرَزَقْنِي اللَّهُ مِنْ أُولَادِهَا إِذْ حَرَمْنِي أُولَادُ النَّاسِ.....) (۱)

یعنی: ”خدیجہ نے اس وقت مجھ پر ایمان قبول کیا جب لوگوں نے میرے ساتھ کفر کیا، میری تصدیق کی جب لوگوں نے میرا انکار کیا، اپنے مال کے ذریعے میری مدد کی جب لوگوں نے مجھے محروم رکھا، نیز یہ کہ اللہ نے مجھے اولاد بھی انہی سے عطا فرمائی.....!“

☆ مختصر تذکرہ اولادِ نبی ﷺ از حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا:

آپ ﷺ کی تمام اولاد بھی حضرت خدیجہؓ سے ہی تھی۔ سوائے ابراہیم کے جو حضرت ماریہ قبطیہؓ سے تھے، جن کی پیدائش بہت بعد میں مدینہ منورہ میں ہوئی، اور وہیں تقریباً ڈیرہ

سال کی عمر میں وفات بھی ہوئی)

جبکہ آپ ﷺ کی باقی تمام اولاد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہی تھی۔ یعنی :
 قاسم، زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمہ، اور عبد اللہ، رضی اللہ عنہم اجمعین۔
 دونوں بیٹے قاسم اور عبد اللہ بچپن میں ہی وفات پا گئے، جس پر مشرکین مکہ باہم یوں کہنے^{لگے} کہ محمد ﷺ کی کوئی اولاد نہ ہے نہیں، صرف بیٹیاں ہی ہیں..... لہذا ہمیں ان
 کے اس نئے دین کی مقبولیت اور ہر دم بڑھتی ہوئی شہرت سے پریشان ہونے کی ضرورت
 ہی نہیں..... کیونکہ ان کے بعد ان کی نسل کا خاتمه ہو جائے گا اور کوئی ان کا نام لیوانہیں
 رہیگا..... اور یوں ان کا یہ دین بھی خود بخود ختم ہو جائے گا.....!!

اس پر سورہ ”الکوثر“ نازل ہوئی، جس میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے اپنے
 حبیب ﷺ کی ولجوئی و تسلی کی غرض سے یہ خبر دی گئی کہ ”ابتر“ یعنی ”بے نام و نشان“ آپ
 نہیں، بلکہ آپ گو طعنہ دینے والے یہ بدرجنت خود بے نام و نشان ہو جائیں گے.....!!

چنانچہ حقیقت یہی ہے کہ چودہ سو تیس سال گذر جانے کے باوجود آج بھی دنیا کے کوئے
 کوئے میں آپ کے نام لیا موجود ہیں، جن کی آپ کے ساتھ والہانہ عقیدت و محبت کا یہ
 عالم ہے کہ آپ کا نام نای اور اسم گرامی سنتے ہی ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگتی
 ہیں..... جذبات بے قابو ہونے لگتے ہیں اور..... فرط عقیدت کی وجہ سے ان کی
 آنکھوں سے بے اختیار آنسو بننے لگتے ہیں آج بھی مشرق و مغرب شمال
 اور جنوب دنیا کے ہر گوشے میں چہار سو چھیلی ہوئی ان بیشمار مساجد کے عظیم الشان
 اور بلند و بالا میناروں سے روزانہ پانچ بار مؤذن پکارتا ہے اشہد آن لا الہ الا اللہ
 اشہد آن محمد رسول اللہ اور یہ سلسلہ تو تاقیامت جاری رہے گا.....!!

جبکہ آپؐ کا نامی کا طعنہ دینے والے وہ ثمن آج خود بے نام و نشان ہیں.....!!
 ☆ آپؐ کی صاحزادیوں میں سے بڑی صاحزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی آپؐ کی بعثت سے قبل حضرت خدیجہؓ کی خواہش پر ابوالعاص بن الریثؓ سے ہوئی جو کہ حضرت خدیجہؓ کی بہن ہالہ بنت خولید کے بیٹے تھے۔ ابوالعاصؓ نے سن چھبھری میں اسلام قبول کیا اور ہجرت کی، ان کا ایک بیٹا علی تھا جو کمسنی میں فوت ہو گیا تھا (فتح کم کے یادگار تین اور تاریخی موقع پر یہی کمسن لڑکا رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اونٹی پر سوار تھا) جبکہ ان کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام امامہ تھا، آپؐ اس کے ساتھ بہت زیادہ محبت و شفقت کا معاملہ فرمایا کرتے تھے (حتیٰ کہ بعض اوقات اسے گود میں اٹھائے ہوئے ہی نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے)۔

☆ دوسری صاحزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی شادی بعثت سے قبل ابوالہب کے بیٹے عتبہ سے، جبکہ تیسرا صاحزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی شادی ابوالہب کے دوسرے بیٹے عتبیہ سے ہوئی تھی، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے حکم: «وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ» (۱) (یعنی: «آپؐ اپنے قریبی رشتہ داروں کو [اللہ کے عذاب سے] ڈرائیے») کے نزول کے بعد جب آپؐ نے کوہ صفا پر بنوہاشم کو جمع کیا اور اللہ کا پیغام پہنچایا تو اس موقع پر ابوالہب نے کہا: تَبَّاكَ! أَمَا دَعَوْتَنَا إِلَّا لِهَذَا.....؟ یعنی (نحوذ باللہ) اے محمد! تم ہلاک جاؤ، کیا تم نے ہمیں اسی لئے یہاں بلا یا تھا.....؟ (۲) ابوالہب کی اس بیہودگی پر آپؐ اپنہائی رنجیدہ و دل گرفتہ ہوئے، جس پر آپؐ کی تسلی و دلچسپی کیلئے سورۃ المسد ﴿تَبَّثَ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ.....﴾ نازل ہوئی (یعنی: دُوٹ

(۲) صحیح بخاری کتاب الفتن، سورۃ المسد۔

[۲۱۲] (۱) اشعراء

جاں کیں ابوالہب کے دونوں ہاتھ اور وہ خود بھی ہلاک ہو جائے.....”)
اس پر ابوالہب مشتعل ہو گیا اور اس نے اپنے دونوں بیٹوں عتبہ اور عتبیہ کو حکم دیا کہ وہ آپ کی صاحزادیوں (حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم) کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

کچھ عرصہ گذرنے کے بعد آپ نے اپنی صاحزادی حضرت رقیہ کی شادی اپنے جلیل القدر صحابی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے کر دی، ان دونوں نے پہلے مکہ سے جہشہ کی جانب ہجرت کی، اور پھر چند سال بعد ایک غلط ہنگی کے نتیجے میں جہشہ سے مکہ کی جانب واپسی ہوئی، اور پھر ہجرت مدینہ کا حکم نازل ہونے کے بعد مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کی، سن دونوں ہجرتی میں عین غزوہ بدر کے روز مدینہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (۱)

تب آپ نے اپنی دوسری صاحزادی حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عثمان بن عفان سے کرا دیا، اور اسی دوہرے شرف کی وجہ سے حضرت عثمان ”ذوالنورین“ کے لقب سے معروف ہوئے۔

☆ سب سے چھوٹی صاحزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی آپ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کی جو آپ کے عمزاد ہونے کے علاوہ مزید یہ کہ ابتداء سے ہی آپ ہی کی کفالت و سرپرستی میں بھی تھے، ان سے حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے۔

(۱) بعض موئیین کے بقول حضرت رقیہ کی مکہ سے خفیہ ہجرت اور جہشہ جیسے دور دراز مقام کی جانب بے بی و کمپہی کے عالم میں روانگی کی وجہ سے ان کی والدہ حضرت خدیجہ انتباہی افسرده و رنجیدہ رہنگیں، اور بالآخر یہی صدمہ ان کی بیماری اور پھر وفات کا سبب بنا..... جبکہ دوسری طرف ماں سے دوری اور پھر ماں کی وفات کی خبر حضرت رقیہ کی بیماری اور پھر وفات کا سبب بی..... واللہ اعلم۔

آپ ﷺ کی تین صاحبزادیاں (نیب، رقیہ، ام کلثوم رضوان اللہ علیہن) عین جوانی کی عمر میں آپؐ کی حیات میں ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں، جبکہ چوتھی اور سب سے چھوٹی اور لاڈی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات آپؐ کی رحلت کے چھ ماہ بعد اٹھائیں برس کی عمر میں ہوئی۔

☆.....کعبہ کی تعمیر نو میں شرکت:

طوفانِ نوح [علیہ السلام] کے نتیجے میں کعبۃ اللہ کی عمارت کے نشانات مت جانے کے بعد اس کی تعمیر نو کا مقدس فریضہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام نے انجام دیا تھا۔ لیکن مردِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ عمارت کمزور اور مخدوش ہوتی چلی گئی۔ خصوصاً رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک جب پنیتیں برس تھی، یعنی آپؐ کی بعثت مبارکہ سے پانچ سال قبل مکہ مکرمہ میں ایک زبردست سیلاپ آیا جس کے نتیجے میں کافی تباہی ہوئی، اسی سیلاپ کی وجہ سے ہی کعبۃ اللہ کی عمارت مزید خشته و بوسیدہ ہو گئی، حتیٰ کہ اس کے منہدم ہو جانے کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔ تب اکابر قریش نے غور و فکر اور باہم صلاح و مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ قبل اس کے کسی روز یہ عمارت اچاکن کر جائے اور کسی نقصان کا باعث بنے اسے خود ہی منہدم کر کے اس کی تعمیر نو کی جائے۔

چنانچہ اس منصوبے کے مطابق کعبہ کی قدیم عمارت کو منہدم کر کے اس کی جگہ نئی عمارت تعمیر کی گئی، تعمیر نو کے اس کام میں سردارانِ قریش کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ نے بھی بفسی نفیس شرکت فرمائی، اس موقع پر آپؐ بھاری پھر و دیگر سامان تعمیر خود اٹھاتے رہے، جس کی وجہ سے آپؐ کے مبارک کندھے زخمی ہو گئے۔

کعبہ مشرفہ کی اس تعمیر نو کا یہ کام جب مکمل ہوا تو جری اسود کواس کے مقام پر نصب کرنے کا مرحلہ آیا تو اس موقع پر سخت اختلاف کی نوبت آئی جس کے نتیجے میں بڑی ہی نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی، تواریخ نیاموں سے باہر آگئیں اور شدید جنگ کا خطرہ منڈلانے لگا..... کیونکہ ہر کسی کی یہ خواہش تھی کہ جری اسود کو اٹھا کر اس کے مقام پر نصب کرنے کا عظیم شرف اور اعزاز اسی کو نصیب ہو.....!!

آخر باءہمی مشاورت کے بعد یہ طے کیا گیا کہ کل صبح سب سے پہلے حرم شریف میں جو کوئی داخل ہو گا وہی اس بارے میں کچھ فیصلہ کرے گا اور اس کا فیصلہ سمجھی کو قبول ہو گا۔

چنانچہ دوسرے روز علی الصباح لوگوں نے یہ میزندی کیا کہ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ حرم میں داخل ہو رہے ہیں..... آپؐ کو آتا دیکھ کر ان لوگوں کی خوشی کی انتہاء نہ رہی، اور وہ سب فرط مسرت سے یک زبان ہو کر پکارا ہے: أَتَاكُمْ الْأَمِينُ أَتَاكُمْ الْأَمِينُ یعنی ”امین آگئے..... امین آگئے“!!

آپؐ نے اپنی چادر مبارک زمین پر بچھائی اور جری اسود کو اٹھا کر اس پر رکھا، پھر تمام سردارانِ قریش سے کہا کہ سب مل کر اس چادر کو اٹھائیں، چنانچہ ان سب نے مل کر اس چادر کو اٹھایا اور کعبۃ اللہ تک پہنچایا، تب آپؐ نے خود اپنے دستِ مبارک سے جری اسود کواس کے مقام پر نصب فرمادیا..... یوں آپؐ کی بے مثال فہم و فراست اور حسن تدیر کی وجہ سے اس عظیم شرف میں وہ سمجھی شریک ہو گئے اور یوں وہ سب مسرورو مطنن ہو گئے..... جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں باہم بڑی جنگ اور خون ریزی کا خطرہ مل گیا۔

بعثت:

رسول ﷺ کی عمر مبارک جب پینتیس برس سے تجاوز کر گئی تو طبیعت میں مزید سنجیدگی و متناسن کے آثار نمایاں ہونے لگے، آپؐ اکثر خاموش اور تفکر و تدبیر میں محور ہتے، آپؐ کی طبیعت اس ماحول سے مسلسل بیزار ہے لگی کہ جہاں عقیدہ و ایمان اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے چهار سو خرابیاں ہی خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں، ایسے میں آپؐ کے مزاج میں گوشہ نشینی و خلوت گزینی کی طرف میلان و رجان بڑھنے لگا، آپؐ کے کندھوں پر اہل و عیال کی ذمہ داریوں کا بوجھ تھا، دنیاوی و کار و باری امور بھی نپٹانا پڑتے تھے، لیکن اب آپؐ کی طبیعت ان تمام کاموں سے اچاٹ رہنے لگی، آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپؐ اکثر کئی دنوں کی خوارک اپنے ہمراہ لیتے جو کہ پانی اور ستوپ مشتمل ہوتی، اور مکہ شہر سے کچھ فاصلے پر جبل النور نامی پہاڑ کی بلند و بالا چوٹی پر واقع "غارِ راء" میں جا بیٹھتے..... دنیا سے الگ تھلگ..... وہاں آپؐ اکیلے مسلسل کئی کئی دن قیام فرماتے، اللہ کی قدرت کے بارے میں غور و فکر میں منہک و مستغرق رہتے، اس وقت آپؐ کو کسی خاص مقصودِ حقیقتی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا، البتہ تلاشِ حق کی ایک جستجو تھی..... ایک عجیب لگن تھی..... جس نے بے چین کر رکھا تھا..... !!

اسی کیفیت میں وقت گذرتا چلا گیا..... جیسے جیسے آفتاب نبوت کے طلوع ہونے کا وقت قریب آتا گیا آپؐ ﷺ پر قدرت کے اسرار و رموز منکشف ہونے لگے، آپؐ کو اکثر خواب نظر آتے، اور خواب میں آپؐ جو کچھ دیکھتے جلد ہی حقیقت کی دنیا میں بھی وہی منظر سامنے آ جاتا..... خوابوں کا یہ سلسلہ تقریباً چھ ماہ تک جاری رہا۔

اسی کیفیت میں آپ ﷺ کی عمر مبارک جب چالیس سال ہو گئی تو ایک روز جب آپ حسبِ معمول غایر راء میں ذکر و فکر اور عبادت میں مشغول تھے کہ اچانک وہاں کوئی اجنبی شخص نمودار ہوا جو کہ درحقیقت امین الوجی حضرت جبریل علیہ السلام تھے۔

اس نوواردیعنی جبریل امین نے آپ کے قریب آ کر کہا: إقْرَأْ لیعنی: ”پڑھو“، آپ نے جواب دیا: مَا أَنَا بِقَارِئٍ لیعنی: ”میں تو پڑھا ہوا ہی نہیں ہوں“، اس پر جبریل نے دوبارہ کہا: إقْرَأْ لیعنی: ”پڑھو“ اور آپ نے وہی جواب دیا: مَا أَنَا بِقَارِئٍ لیعنی: ”میں تو پڑھا ہوا ہی نہیں ہوں“، تب جبریل علیہ السلام نے آپ کو گلے سے لگا کر قدرے بھینچا، اور پھر چھوڑ دیا، اس کے بعد تیسری بار کہا: ﴿إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ، إِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ، الَّذِي عَلَمَ بِالْقَلْمَ ، عَلَمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمُ﴾ لیعنی: ”پڑھا پنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو مجھے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھ، اور تیرارب براہم بریان ہے، جس نے قلم کے ذریعے سکھایا، جس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔“

یہی سب سے پہلی وحی جو خالق کائنات کی طرف سے اپنے آخری نبی ﷺ کی جانب نازل کی گئی، تمام آسمانی کتابوں میں سب سے آخری و فضل کتاب کا یہ سب سے پہلے نازل ہونے والا حصہ تھا، جس میں انسان کو اس کے خالق و مالک کی طرف سے تحصیل علم کا حکم دیا گیا۔ اس سے دوسریں اسلام میں علم کی اہمیت واضح ہوتی ہے، اور یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ دوسریں اسلام علم و معرفت اور حکمت و بصیرت کا دین ہے۔

بعثت کے وقت دینی و اخلاقی و معاشرتی حالات:

رسول ﷺ کی بعثت جن حالات میں ہوئی اُس وقت صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ انسانیت اندر ہیروں میں بھٹک رہی تھی، کفر و شرک اور ہر قسم کی معصیت و ضلالات عروج پڑھی، عقیدہ و ایمان کا معاملہ ہوا، یا اخلاق و اقدار کی بات ہو، ہر لحاظ سے پستی و انحطاط کا وہ دور تھا، بت پرستی، تو ہم پرستی، ستارہ پرستی، اور ہرگز اسی اس معاشرے میں موجود تھی، معمولی باتوں پر لڑائی جھگڑا، قتل و غارتگری، فتنہ و فساد اور خون ریزی ان کا پسندیدہ ترین مشغله تھا، ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا، قاعدہ و قانون نام کی کسی چیز کا دور دور تک کوئی وجود نہیں تھا، ہر برائی اپنے عروج پڑھی، اور ہر لحاظ سے وہ لوگ پستی کی انتہاء کو پہنچھ ہوئے تھے، کون سی برائی تھی جو اس معاشرے میں موجود نہیں تھی.....؟ اور سب سے بڑھ کر روکنگئے کھڑے کر دینے والی برائی اس معاشرے میں یہ تھی کہ وہ لوگ عار کے ڈر سے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی بیٹیوں کو زندہ در گور کر دیا کرتے تھے، انسانیت سک سک کردم توڑ رہی تھی، ترپتی، سکتی، دم توڑتی انسانیت کی مثال کسی تپتے ہوئے صحرا کی مانند تھی جو صدیوں سے ابر رحمت کا منتظر ہو.....!

ایسے میں خالق کائنات نے اپنا فضل و کرم فرمایا، اور اپنے نبی ﷺ کو یہ انسانیت کیلئے ابر رحمت بنا کر بھیجا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلَنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (۱) یعنی: (اے نبی! ہم نے آپ کو تمام دنیا والوں کیلئے رحمت بنا کر رہی بھیجا ہے)

(۱) الأنباء [۷۰]

ہر طرف چھائی ہوئی ان ظلمتوں کے درمیان آپ ﷺ کی طرف سے بینارہ نور، مُشعل راہ اور وشن چراغ بن آکر آئے۔ جیسا کہ ارشادِ بانی ہے: ﴿..... وَ دَاعِيَاً إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَ سِرَاجًا مُّنِيرًا﴾ (۱)

یعنی: (..... ہم نے آپ کو بھیجا ہے اللہ کے حکم سے اُس کی طرف بلانے والا، اور وشن چراغ بنانے کا راستہ) (۲)

مقصد یہ کہ جس طرح چراغ سے اندھیرے دور ہو جاتے ہیں، اسی طرح اللہ نے آپ ﷺ کو کفر و شرک اور معصیت و ضلالت کی تاریکیاں دور کرنے والا بنا کر بھیجا۔

بعثت کے فوری بعد:

رسول ﷺ پہلی وحی کے نزول کے بعد خلافِ معمول جلد گھر لوٹ آئے اور آتے ہی لیٹ گئے، اور اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: زمُلوونی - زمُلوونی یعنی "مجھے چادر اڑھادو، مجھے چادر اڑھادو"۔ جس پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو چادر اڑھادی۔

کچھ تو قف کے بعد جب طبیعتِ قدرے سنبھلی تو آپ نے حضرت خدیجہؓ کے سامنے تمام صورتِ حال بیان کی، اور پھر اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: قد خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي یعنی "مجھے تو اپنی جان خطرے میں محسوس ہو رہی ہے"۔ تب حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو سلی دیتے ہوئے فرمایا: (كَلَّا، وَاللَّهِ لَا يُخْزِيَ اللَّهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّاجِمَ، وَتَصُدُّقُ الْحَدِيثَ، وَتَحْمُلُ الْكَلَّ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ.....) (۲)

(۲) بخاری [۳] مکتاب بدء الوضی.

(۱) الأَحْزَاب [۳۶]

ترجمہ: (”نبیں نہیں! اللہ کی قسم! اللہ آپ کو ہرگز اس کام میں رسوائیں کرے گا، کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، مہمان نواز ہیں، محتاجوں اور غریبوں کی مدد کرتے ہیں، اور راہِ حق میں لوگوں کی مدد کرنے والے ہیں“) (۱)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو تسلی تو دی، اور اس یقین کا اظہار بھی کیا کہ جب آپؐ کا اخلاق اس قدر اچھا ہے تو پھر اللہ کی طرف سے یقیناً آپؐ کی حفاظت اور مدد و نصرت کا غیری انظام بھی ضرور ہو گا.....!

لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات خود ان کیلئے بھی بڑی تشویش کا باعث تھی۔ چنانچہ وہ مزید اطمینان اور تسلی کی غرض سے فوراً ہی آپؐ کو اپنے پیچا زاد بھائی ورقہ بن نواف کے پاس لے گئیں جو نظہر اسلام سے قبل ہی بت پرستی سے بیزار ہو کر ایک عرصے تک تلاشِ حق میں سرگردان رہے، اور پھر تلاشِ جنت کے بعد بالآخر اپنی دانست کے مطابق اس وقت کے صحیح دین یعنی ”نصرانیت“ کو قبول کر چکے تھے، اور اکثر انجیل بھی پڑھتے رہتے تھے، انتہائی عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کو ہمراہ لئے ہوئے ورقہ کے پاس پہنچیں اور کہا کہ دیکھو یہ (رسول ﷺ) کیا کہتے ہیں.....! اس پر ورقہ نے آپؐ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا کہ بولو چتھجے کیا بات ہے؟ تب آپؐ نے تمام ماجرا بیان فرمایا۔ جسے سننے کے بعد ورقہ بن نواف نے کہا: (هذا النَّامُوسُ الَّذِي أَنْزَلَهُ اللَّهُ عَلَى مُوسَى) یعنی ”یہ تو ہی ناموس ہے جو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب نازل کیا تھا“۔ اس کے بعد مزید کہا: یا لیتَنِی جَذَّعاً، (۱) غور طلب بات ہے کہ بعثت سے قبل ہی آپ ﷺ کے اخلاق کی بلندی و عظمت کا یہ حال تھا تو بعثت کے بعد کیا کیفیت ہو گی.....؟

لَيَتَنِي أَكُونُ حَيَاً إِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ (۱) یعنی: ”کاش میں جوان ہوتا، کاش میں اُس وقت تک زندہ رہتا کہ جب آپ کی قوم آپ گو شہر سے نکال دے گی“۔ اس پر آپ نے حیرت و تجھ کے عالم میں دریافت فرمایا: أَوْ مُخْرِجِيٌّ هُمْ؟ یعنی ”کیا یہ میری ہی قوم کے لوگ مجھے میرے شہر سے نکال باہر کریں گے؟“۔ ورقہ نے جواب میں کہا: نَعَمْ یعنی ”ہاں“۔ اور پھر مزید کہا: لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا عُودِيَ یعنی ”جب بھی کسی نے ایسی تعلیم پیش کی کہ جبی تعلیم آپ کے کرائے ہیں، تو اس کے ساتھ ہمیشہ دشمنی ہی کی گئی ہے“۔ اور پھر محض چند روز بعد ہی ورقہ بن نوافل کی وفات ہو گئی۔

اس کے بعد جریل امین بھی جلد دوبارہ نہیں آئے، بلکہ کچھ عرصہ گذر گیا، غالباً اس توقف میں حکمت یہ ہو گی کہ رسول ﷺ کی طبیعت پر سکون ہو جائے، اور آپ کا ذہن اس حقیقت کو قبول کر لے۔

اور پھر اس توقف کے بعد ایک روز جریل علیہ السلام دوبارہ وحی لے کر آئے، اس بار وہ سورۃ المدثر کی ابتدائی پانچ آیات لے کر آئے تھے: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدْثِرُ، قُمْ فَأَنذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِيَابَكَ فَطَهِرْ، وَالرُّجُرَ فَاهْجُرْ﴾ (۲) ترجمہ: (اے چادر اوڑھنے والے، اٹھ کھڑے ہو جاؤ، اور آگاہ کرو، اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو، اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو، اور ناپاکی سے دور رہو)

اس بارے میں رسول ﷺ نے خود یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: (بَيْنَا أَنَا أَمْشِي سَمِعْتُ صَوْتًا مِّنَ السَّمَاءِ، فَرَفَعْتُ بَصَرِي قَبْلَ السَّمَاءِ، فَإِذَا الْمَلَكُ

(۱) بخاری [۲۹۸۲] کتاب تغیر - (۲) المدثر [۵]

الَّذِي جَاءَنِي بِحِرَاءَ قَاعِدًا عَلَى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، فَجَئْتُهُ مِنْهُ حَتَّى هَوَيْتُ إِلَى الْأَرْضِ، فَجِئْتُ أَهْلِي، فَقُلْتُ : زَمْلُونِي، زَمْلُونِي، فَرَزَمْلُونِي، فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى : يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، إِلَى قَوْلِهِ : فَاهْجُرْ) (۱) ترجمہ: (میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک میں نے آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی، میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہ فرشتہ جو عارِحاء میں میرے پاس آیا تھا، میں نے دیکھا کہ وہی فرشتہ آسمان وزمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، میں گھبراہٹ کی وجہ سے زمین پر بیٹھ گیا، پھر گھر پہنچتے ہی میں نے اپنی اہلیہ سے کہا ”مجھے کوئی چادر اڑھادو، مجھے کوئی چادر اڑھادو“، جس پر انہوں نے مجھے چادر اڑھادی، تب اللہ تعالیٰ نے یا ایُّهَا الْمُدَّثِّر سے وَالرُّجُزَ فَاهْجُرْ تک آیات نازل فرمائیں)۔



(۱) بخاری [۳۹۲۶] کتاب التفسیر، باب: والرجوز فاجر

اَمْدَلَّدَّا ج بِتَارِخٍ / شوال ۱۴۳۲ھ، مطابق ۱۵/تمبر ۲۰۱۱ء بروز جمعرات یہ باب مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبَّ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ

مکی دور:

رسول ﷺ کی تینیں سالہ پیغمبرانہ زندگی اس قدر وسیع موضوع ہے اور اس کی اتنی جزئیات ہیں کہ ان میں سے ہر موضوع پر مستقل مخیم کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ سلسلہ ہر دور میں جاری رہا اور آئندہ بھی تاقیامت جاری رہے گا۔

ابتدہ سہولت کی خاطر بطورِ خلاصہ اس تینیں سالہ زندگی کو یوں تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ ابتداء میں اسے کمی دور اور مدنی دور میں تقسیم کر دیا جائے، اور پھر ان دونوں ادوار میں سے ہر ایک کو مزید تین مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا جائے، اس سلسلہ میں تفصیل درج ذیل ہے:

☆ پہلا دور؛ خفیہ دعوت و تبلیغ:

کمی زندگی کے تین مختلف ادوار میں سے پہلا دور وہ ہے جسے ”خفیہ دعوت و تبلیغ“ کا دور کہا جاتا ہے، اور جو کہ تین سال کے عرصہ پر محیط ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے جب آپؐ کو دین برحق کی تبلیغ کا فریضہ سونپا گیا تو اس حکم ربیٰ کی تعییل میں آپؐ نے سب سے پہلے اپنے افرادِ خانہ کو پیغامِ حق پہنچایا، جس کے تیتجے میں آپؐ کی زوجہ محترمہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، آپؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، آپؐ کے چپازاد بھائی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے (جو کہ آپؐ کے زیرِ کفالت تھے) آپؐ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اس پیغامِ حق کو قبول کیا۔

ان افرادِ خانہ کے بعد آپؐ نے گھر سے باہر ان لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دی

جن میں آپ ﷺ کو خیر و خوبی کی جھلک نظر آتی تھی، ان افراد میں آپؐ کے انتہائی قربی رازدار اور خاص ترین دوست اور با اعتماد ساتھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ودیگر متعدد ایسے حضرات تھے جو کہ بالکل ابتدائی دور میں ہی دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے مشرف باسلام ہو گئے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ تمام حضرات وہ تھے کہ جن کا رسول ﷺ کے ساتھ بہت قدیم اور قربی تعلق چلا آ رہا تھا، جس کی وجہ سے یہ حضرات آپؐ کے اخلاق و کردار سے بخوبی واقف تھے، آپؐ کی زندگی کا کوئی گوشہ ان سے مخفی نہیں تھا..... اس کے باوجود سب سے پہلے انہی حضرات کا آپؐ کی دعوت کو قبول کرنا اور بلا چون وچرا آپؐ کی تصدیق کرنا آپؐ کی صداقت و حقانیت نیز آپؐ کے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار کی مضبوط دلیل ہے۔

تین سال کے عرصے پر محیط خفیہ دعوت و تبلیغ کا یہ دوریوں مکمل ہوا کہ گئے پھر چند افراد نے اس دسین بحق کو قبول کیا، جس کی خبر اگرچہ مشرکین مکہ کے کانوں تک جا پہنچی، تاہم انہوں نے اسے محض وقتی چیز سمجھتے ہوئے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

☆ دوسرے دور؛ علانية دعوت و تبلیغ :

نبوت کے چھٹے سال کے آغاز میں جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (۱) یعنی: (آپؐ ڈرائیے اپنے خاندان والوں، قرابت داروں کو) اس حکم رباني کی تعمیل میں آپؐ نے اب علانية دعوت و تبلیغ کا آغاز فرمایا، اور یوں کی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز ہوا، جو کہ نبوت کے دسویں سال تک جاری رہا۔

(۱) الشرعاۃ [۲۱۳]

چنانچہ ایک روز آپ ﷺ نے کوہ صفا پر اپنے خاندان والوں یعنی بنوہاشم کو مجمع کیا تاکہ ان کے سامنے دعوت حق پیش کر سکیں، لیکن اس موقع پر ابوالہب نے حسبِ معمول الٹی سیدھی ہائی شروع کی، جس کی وجہ سے آپ ﷺ اپنامدی بیان نہ کر سکے۔

دوسرے روز آپ ﷺ نے دوبارہ بنوہاشم کو مجمع کیا اور مدعا بیان کرنے سے پہلے ان سے اپنی تصدیق چاہی (۱) جس پر ان سب نے بیک زبان کہا: مَا جَرَّبَنَا عَلَيْكَ كَذِبًا یعنی ”هم نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں سنایا“ تب آپ ﷺ نے انہیں اللہ کا پیغام پہنچایا، اللہ کے دین کی طرف انہیں دعوت دی، صرف ایک اللہ کی عبادت کی تلقین فرمائی، بت پرستی اور ہر قسم کے شرک سے انہیں روکا، معاشرتی برائیوں سے باز رہنے کی تاکید فرمائی۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے ان حاضرینِ محفل سے دریافت فرمایا کہ اس کام میں تم میں سے کون میرا ساتھ دے گا.....؟

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس وقت کم سن تھے، اور اس محفل میں موجود تمام افرادِ بنوہاشم میں وہ سب سے چھوٹے تھے، مگر اس کے باوجود وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور آبا از بلند، بلا تردید آپ ﷺ کی حمایت اور اس کام میں بھرپور ساتھ دینے کا وعدہ کیا، جبکہ وہ اس سے بہت قبل ہی مشرف بالسلام بھی ہو چکے تھے۔

آپ ﷺ کے سرپرست اور مشفیق و مہربان چچا ابوطالب نے اس موقع پر آپ ﷺ کو اس سلسلے میں اپنی مکمل حمایت اور تائید کا یقین دلایا، البتہ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ إِنَّ نَفْسِي لَا تُطَاطِوْ أَعْنِي عَلَىٰ فِرَاقِ دِيْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ یعنی ”میرا دل نہیں مانتا کہ میں عبدالمطلب کے دین

(۱) یعنی آپ ﷺ نے وہاں موجود بنوہاشم سے اپنے بارے میں دریافت فرمایا کہ میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ تم مجھے سچا سمجھتے ہو؟ یا یہ کہ تمہاری نظر میں میں جھوٹا انسان ہوں.....؟

سے روگردانی کروں۔“ -

مقصد یہ کہ دینِ اسلام کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کی جہاں تک بات ہے، اس سلسلے میں میں آپؐ کے شانہ بشاہ ہر تعاون اور مدد کیلئے مکمل طور پر تیار ہوں..... لیکن جہاں تک میرے اپنے دین کا معاملہ ہے تو میں اپنے آبائی دین کو نہیں چھوڑ سکتا..... !!

رسول ﷺ نے اپنا سلسلہ نتنتگو جاری رکھا، اسی دوران جب آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا:
 انّي نذيرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ یعنی ”میں تمہیں ڈراتا ہوں سخت مذاب سے۔“ یہ الفاظ سنتے ہی ابوالہب بھڑک اٹھا، اور یوں ہرزہ سرائی کرنے لگا: تَبَّا أَلَّكَ، أَلْهَدَا جَمَعَتَنَا؟ یعنی (نعوذ باللہ) ”توہلک ہو جائے، کیا تو نے ہم سب کو صرف اسی لئے یہاں جمع کیا ہے؟“ -

ابوالہب کی زبانی یہ انتہائی سخت اور قبیح ترین الفاظ سن کر رسول ﷺ انتہائی رنجیدہ ہو گئے، جس پر آپؐ کی دلجوئی و تسلی کیلئے خالق ارض و سماء کی جانب سے سورہ تبت یادا (یعنی سورہ مسد) نازل کی گئی، جس میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ ہلاکت و بر بادی تو خود ابولہب کیلئے ہے.....!

انہی دنوں جب آیت (فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمِنُ.....) (۱) یعنی ”آپؐ کو جو حکم دیا گیا ہے اسے آپؐ خوب صاف صاف بیان کر دیجئے.....“ نازل ہوئی تو اس حکم ربانی کی تعلیل کرتے ہوئے اب آپؐ ﷺ نے اپنے سلسلہ دعوت و تبلیغ کو مزید تیز کر دیا اور اس کام کو مزید وسعت دی، چنانچہ آپؐ نے اپنے قربات داروں کے علاوہ مزید یہ کہ پورے شہر کمک میں ہر جگہ اور ہر قبیلے کو یہ یام حق پہنچانا شروع کر دیا، اب آپؐ جگہ جگہ گھومتے ہجتھا

قبائل اور خاندانوں کے مساکن میں تشریف لے جاتے، بازاروں، گلیوں، محلوں، میں جاتے، کوئی میلہ منعقد ہوتا..... یا کوئی محفل بھی..... یا کسی بھی قسم کا کوئی اجتماع ہوتا..... آپؐ وہاں پہنچتے..... خصوصاً حج کے موقع پر یہ دن مکہ سے بڑی تعداد میں جو لوگ حج کی غرض سے آتے، آپ ﷺ انہیں دین اسلام کی دعوت دیتے، اسی طرح مختلف علاقوں سے عربوں کے جو تجارتی قافلے مکہ آتے آپؐ ان سے ملاقاتیں کرتے، ان کے ٹھکانوں اور ان کی اقامت گاہوں میں جا کر انہیں پیغامِ حق سناتے اور دینِ برحق کی طرف دعوت دیتے.....!

مشرکین کی طرف سے ایذا رسانیوں کا سلسلہ:

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مشرکین مکہ بھی طیش میں آگئے..... طاغونی قوتیں حرکت میں آگئیں، اور اب انہوں نے سچائی کا راستہ روکنے اور آپؐ کو نیز آپؐ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچانا شروع کیں، کسی کوشیدگری کے موسم میں میں آگ اگلتے ہوئے سورج کے نیچے پتی ہوئی ریت پر لٹا کر سینے پر بڑا بھاری پھر رکھ دیا جاتا، تاکہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے..... کسی کو پاؤں میں رسیاں ڈال کر دن بھر مکہ کی پھریلی اور گرم گلیوں میں گھسیتا جاتا..... کسی کو انگاروں پر لٹایا جاتا..... اس دور میں جن حضرات پر ظلم و ستم کے پھاڑ توڑے گئے اور انہائی وحشیانہ طریقے سے ان پر ہر قسم کا تشدد کیا گیا، ان میں خاص طور پر بلاں بن رباح، یاسرا اور ان کے بیٹے عمارة، نیز عمار کی والدہ سمیہ، اسی طرح خباب بن الارت، وغیرہ..... قابل ذکر ہیں، رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اُس دور میں خود رسول ﷺ کو بے حد تکلیفیں پہنچائی گئیں، کبھی آپؐ کے راستے میں کائنے بچھاد دیئے جاتے، کبھی غلاظت کے ڈھیر ڈال دیئے جاتے، کبھی آپؐ کے قتل کی

سازش کی جاتی، نیز ایک بار جب آپ ﷺ بیت اللہ کے قریب نماز کے دوران اپنے رب کے سامنے حالتِ سجود میں تھے، تو چند بدجختوں نے اونٹ کی او جڑی لا کر آپؐ کی پشت مبارک پر ڈال دی، جس کے بوجھ اور وزن کی وجہ سے آپ ﷺ کافی دریک کوئی حرکت نہ کر سکے..... جبکہ نجاست و غلاظت اور بدبوکی تکلیف اس کے علاوہ تھی..... !!

☆..... مزید یہ کہ آپ ﷺ کو ان جسمانی اذیتوں اور تکلیفوں کے علاوہ ہر قسم کی ہنی و نفسیاتی تکلیف پہنچانے میں بھی ان طالموں اور بدجختوں نے کوئی کسر اٹھانے رکھی..... چنانچہ کبھی آپؐ "دیوانہ" کہا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں اسی طرف اشارہ ہے: ﴿وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نَزَّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ﴾ (۱) ترجمہ: (انہوں نے کہا کہ اے وہ شخص جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے، یقیناً تو تو کوئی دیوانہ ہے)

کبھی کہتے کہ یہ قرآن تو نعوذ باللہ اس شخص نے خود ہی لکھوا لیا ہے اور اللہ کی طرف اس کی جھوٹی نسبت کر دی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوْلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمَلَّى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَ أَصِيلًا﴾ (۲) ترجمہ: (اور یہ بھی کہا کہ یہ تو محض گذشتہ لوگوں کے افسانے ہیں، جو اس نے لکھا رکھے ہیں، بس وہی صحیح و شام اس کے سامنے پڑھے جاتے ہیں)

اوکبھی بطور استہزاء و تمسخریوں کہتے ہیں کہ یہ کیسا عجیب رسول ہے جو کھانا پیتا اور بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے.....؟ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوا مَا لِهُذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ﴾ (۳) ترجمہ: (اور انہوں نے کہا کہ یہ کیا رسول ہے؟ جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟)

(۱) الحجر [۲]

(۲) افرقان [۵]

(۳) افرقان [۷]

نیز کہی ”جادوگر“ اور کہی ”جھوٹا“ کہا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿وَقَالَ الْكَافِرُونَ هَذَا سَاحِرٌ كَذَابٌ﴾ (۱) ترجمہ: (اور کہا کافروں نے کہ یہ تو بس جادوگر ہے جھوٹا ہے)

غور طلب بات ہے کہ وہی مشرکین مکہ جو آپ ﷺ کو بعثت و رسالت سے قبل ہمیشہ سے ”صادق و امین“ کے لقب سے پکارتے چلے آ رہے تھے..... اب وہی لوگ یک یک آپ گو ”جھوٹا“ کہنے لگے..... اور پھر خاص طور پر جمکہ ان میں سے اکثریت کے ساتھ آپ کا قرابت داری کا تعلق بھی تھا..... اپنوں ہی کی زبانی دل چھانی کر دینے والی یہ باتیں..... یقیناً یہ چیز آپ ﷺ کیلئے انتہائی صدمے اور نفسیاتی تکلیف کا باعث تھی۔

نیز یہ مشرکین مکہ بغرض ولفترت کی شدت کی وجہ سے آپ ﷺ کو تیز نگاہوں اور کھا جانے والی نظروں سے دیکھا کرتے تھے، جس کا قرآن کریم میں یوں تذکرہ کیا گیا ہے: ﴿وَإِن يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُرْلُقُونَكِ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الْذِكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ﴾ (۲) ترجمہ: (اور قریب ہے کہ کافرا پنی تیز نگاہوں سے آپ کو پھسلا دیں جب کہی قرآن سنتے ہیں، اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ضرور دیوانہ ہے)

مزید یہ کہ آپ ﷺ کو دلی رنج اور نفسیاتی صدمہ پہنچانے کی غرض سے بد بخت ابو لہب نے اپنے بیٹوں عتبہ اور عتبیہ کو حکم دیا کہ وہ دونوں اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں، جو کہ آپ کی صاحبزادیاں یعنی حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم (رضی اللہ عنہما) تھیں، جن کا نکاح آپ کی بعثت سے قبل ابو لہب کے ان بیٹوں کے ساتھ ہوا تھا (۳)

(۱) [۵] (۲) [۶] (۳) [۷]

(۳) البتہ متعدد موئیین کے بقول اُس وقت تک خصتی کی نوبت نہیں آئی تھی، مغض نکاح ہوا تھا، واللہ اعلم۔

بھرتو جشہ:

رسول ﷺ کی بعثت مبارکہ کے بعد پانچواں سال چل رہا تھا، علایین تبلیغ کے اس سلسلے کو دوسال کا عرصہ گذر چکا تھا، کفار و مشرکین کی طرف سے بدسلوکیوں اور ایذا رسانیوں کا سلسلہ بھی بدستورِ عروج پر تھا، تب آپؐ نے اپنے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مشورہ دیا کہ وہ ملکِ جشہ کی جانب بھرتو جشہ کر جائیں، کیونکہ وہاں ایک نہایت عادل و انصاف پسند بادشاہ کی حکمرانی ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ کے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے صحابہ کرام کی ایک مختصر جماعت جو کہ بارہ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل تھی، مکہ مکرمہ سے ملکِ جشہ کی جانب بھرتو جشہ کر گئی، ان میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی اپنی اہلیہ حضرت رقیہؓ بنت رسول ﷺ بھی شامل تھے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد تراہی مردوں اور اٹھارہ عورتوں پر مشتمل دوسرا قافلہ روانہ ہوا جس میں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، نیزان کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ (۱)

مشرکین مکہ نے انہیں گرفتار کرنے کی غرض سے دور تک ان کا تعاقب کیا، لیکن وہ تیز رفتاری کے ساتھ جدہ سے بھری راستے سے سفر کرتے ہوئے ان کی دسترس سے باہر نکال گئے، اور پھر بخیر و عافیت ملکِ جشہ پہنچنے کے بعد وہاں مشرکین مکہ کے مظالم سے دور..... اب چین اور سکون کی زندگی بس کرنے لگے..... !!

(۱) بعد میں ان آٹھ بھری میں رو میوں کے خلاف غزوہ مودعہ کے موقع پر حضرت جعفرؑ کی شہادت کے بعد حضرت اسماء بنت عمیس حضرت ابو بکر صدیقؓ کے نکاح میں اور پھر ان کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں۔

اُدھر مشرکین مکہ کو جب یہ خبر ملی کہ مسلمان اب ان کی پہنچ سے دور ملک جشہ میں آرام اور چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں..... تو ان کینہ پروروں نے کئی دن پہنچ تاب کھانے کے بعد آخر یہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد ملک جشہ کی جانب روانہ کیا جائے، جو وہاں کے بادشاہ نجاشی سے ملاقات کر کے اسے اس بات پر آمادہ کرے کہ مسلمانوں کو دوبارہ ان کے حوالے کر دیا جائے۔

آخر اس منصوبے کے تحت مشرکین مکہ کا ایک وفد ملک جشہ جا پہنچا، اور بادشاہ سے ملاقات سے قبل اس کے درباریوں اور مشیروں سے متعدد ملاقاتیں کیں، ان کے ساتھ تعارف اور دوستی کے رشتے استوار کئے، اور پھر بطورِ شوت قیمتی تحاکف اور نذرانے پیش کئے یوں شاہی دربار میں پیش ہونے اور وہاں اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے سے قبل ہی ان مکاروں نے بادشاہ کے ان وزیروں، مشیروں کو اپنی مٹھی میں کر لیا..... !!

آخر ایک روز شاہی دربار میں پیش ہوئے، وہاں بھی بھاری نذرانے اور قیمتی تحاکف پیش کرنے کے بعد اپنا مدعی بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

”اے بادشاہ! ہمارے شہر کے چند سر پھرے اور فتنہ پر دا قسم کے لوگ اپنے آبائی دین سے برگشته ہو کر آپ کے ملک میں آبے ہیں۔ اے بادشاہ! اگر انہوں نے اپنے آباء و اجداد کا دین چھوڑ کر آپ کا دین ہی اپنالیا ہوتا تب بھی غنیمت تھا..... مگر انہوں نے تو ایک ایسا عجیب و غریب نیاد دین ایجاد کر لیا ہے جسے مجھنے سے ہم اور آپ دونوں ہی قاصر ہیں..... اے بادشاہ! جس طرح انہوں نے ہمارے شہر مکہ میں فتنہ پھیلایا ہے، یقیناً اسی طرح اب یہ آپ کے ملک میں بھی فتنہ اور خرابی ہی پھیلائیں گے۔ لہذا ہمارے بزرگوں اور داشمنوں نے ہمیں آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، تاکہ آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیں..... اور ہم

انہیں اپنے ہمراہ واپس مکہ لے جاسکیں.....”

بادشاہ نے ان کی یہ بات سننے کے بعد اپنے درباریوں اور مشیروں کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھا، گویا وہ ان کی رائے جانا چاہتا ہو..... اورتب..... رشتہ بول الٹھی..... سبھی درباریوں نے پر زور انداز میں مشرکین مکہ کی تائید اور ان کے مطالبے کی حمایت کی، اور اپنے بادشاہ کو مسلمانوں کی طرف سے مزید بدول کرنے کیلئے تاکیدی انداز میں کہا کہ جو اپنے آباؤ اجداد کے دین کے ساتھ غداری کر سکتے ہیں..... ان سے خیر کی کیا توقع کی جاسکتی ہے.....؟

مشرکین مکہ اور پھر ان کے بعد اپنے ان درباریوں کی گفتگو سننے کے بعد بادشاہ نے کہا: ”النصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے ان مسلمانوں کی بات بھی سن لوں، اور اس کے بعد ان کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کروں.....“

چنانچہ مسلمانوں کو وہاں دربار میں طلب کیا گیا، بادشاہ نے ان سے دریافت کیا کہ ”یہ کون سادین ہے کہ جس کی خاطر تم نے اپنے آباؤ اجداد کے دین کو چھوڑ دیا ہے..... اور پھر یہ کہ ہمارا دین بھی نہیں اپنایا.....؟“

بادشاہ کی طرف سے اس سوال کے جواب میں ان حضرات صحابہ کرام میں سے حضرت جعفر بن ابی طالبؑ ہوئے اور یوں گفتگو کا آغاز کیا:

”أَيَّهَا الْمَلِك! كُنْا قَوْمًا أَهْلَ جَاهْلِيَّةً، نَعْبُدُ الْأَصْنَامَ، وَنَأْتِي الْفَوَاحِشَ، وَنَأْكُلُ الْمَيْتَةَ، وَنَقْطَعُ الْأَرْحَامَ، وَنُسْيِءُ الْجِوارَ، وَيَأْكُلُ الْقَوْيُّ مِنَ الْخَسِيفِ، فَكُنَّا عَلَى ذَلِكَ، حَتَّىٰ بَعَثَ اللَّهُ إِلَيْنَا رَسُولًا مِنَنَا، نَعْرِفُ نَسْبَةً وَ صِدْقَةً وَ أَمَانَةً وَ عَفَافَةً، فَذَعَانَا إِلَى اللَّهِ لِنُوْحَدَةٍ وَ نَعْبُدَهُ،

وَنَخْلَعَ مَا كُنَّا نَعْبُدُ نَحْنُ وَآبَاؤُنَا مِنْ دُونِهِ مِنَ الْحِجَارَةِ وَالْأَوْثَانِ
 وَأَمْرَنَا بِصِدْقِ الْحَدِيثِ، وَأَدَاءِ الْأَمَانَةِ، وَصَلَةِ الرِّجْمِ، وَحُسْنِ
 الْجِوَارِ، وَالْكَفِ عَنِ الْمَحَارِمِ وَالدَّمَاءِ، وَنَهَايَا عَنِ الْفَوَاحِشِ، وَقَوْلِ
 الرُّزُورِ، وَأَكْلِ مَالِ الْيَتَيمِ، وَقَذْفِ الْمُحْصَنَاتِ فَصَدَّقَنَا وَآمَنَّا بِهِ
 فَعَدَا عَلَيْنَا قَوْمًا، فَعَذَّبُونَا، وَفَتَنُونَا عَنِ دِينِنَا، لِيَرُدُّونَا إِلَى
 عِبَادَةِ الْأَوْثَانِ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَلَمَّا قَهَرُونَا، وَظَلَمُونَا، وَحَالُوا بَيْنَنَا
 وَبَيْنَ دِينِنَا، خَرَجْنَا إِلَى بِلَادِكَ، وَاخْتَرَنَاكَ عَلَى مَنْ سِواكَ، وَرَغَبَنَا
 فِي جِوَارِكَ، وَرَجَوْنَا أَنْ لَا نُظْلَمَ عِنْدَكَ أَيْهَا الْمَلِكِ”۔

ترجمہ: ”اے بادشاہ! ہم جاہل تھے، ہم بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے، بدکاری کیا کرتے
 تھے، ہم مردار کھاتے تھے، پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک کیا کرتے تھے، ہم میں سے
 جو طاقت رخواہ کمزور کو کھاجاتا تھا، ہم اسی کیفیت میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ اس دوران
 اللہ نے ہم میں سے ایک ایسی ہستی کو بنی باکر ہماری جانب مبعوث فرمایا کہ جس کے حسب
 نسب، نجابت و شرافت، امانت و دیانت، نیز اس کی پاکیزہ زندگی سے ہم سب خوب و اقت
 تھے، اس نے ہمیں ایک اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دی، اور اللہ کے سوابجن بتوں کی ہم
 اور ہمارے باپ دادا پوجا کرتے چلے آرہے تھے ان کی پوجا سے بازرگانی کی
 تاکید کی، اس نے ہمیں راست بازی، امانت داری، صلد رحمی، اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن
 سلوک کا سبق سکھایا، خوزیری، بے حیائی، دروغ گوئی، تیمبوں کا مال ہڑپ کر جانے،
 اور پاک دامن عورتوں پر بہتان لگانے سے ہمیں منع کیا، پس ہم نے اس کی تقدیق کی
 اور اس پر ایمان قبول کیا، جس پر ہماری قوم ہمارے درپے آزار ہو گئی، ہمیں ہر طرح ستایا،

پریشان کیا، اور ہمیں اپنے دین سے برگشتہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، جب ان کا ظلم و ستم حد سے تجاوز کر گیا تو اے بادشاہ ہم نے اپنے وطن عزیز کو خیر بادکھا، اور پناہ کی تلاش میں ہم آپ کے ملک میں چلے آئے، یہ امید لئے ہوئے کہ یہاں ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے گا اور یہ کہ یہاں ہمارے ساتھ کوئی ظلم وزیادتی نہیں ہوگی.....”۔

یہ تھا سب نبی آمی کے مكتب کا فیض..... کہ ایک صحرائش..... جس نے دنیا کی کسی درسگاہ میں کوئی تعلیم حاصل نہیں کی..... جس کے پاس کوئی ڈگری نہیں..... جسے دنیا کے کسی شاہی دربار میں جانے کا بھی اتفاق ہی نہیں ہوا..... شاہی درباروں کے آداب سے یکسر ناواقف..... سفارتی آداب سے مکمل بے خبر..... مگر بادشاہ کے دریافت کرنے پر جو جواب دیا..... وہ کس قدر جامع، پرمغز، مدلل، اور اثر انگیز تھا..... یقیناً یہ معلم انسانیت رسول اکرم ﷺ کی پاکیزہ تربیت، ہی کا نتیجہ تھا..... !!

اس کے بعد نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے کہا ”تمہارے نبی کی جانب اللہ کی طرف سے جو کلام نازل کیا گیا ہے، کیا اس میں سے کچھ تم مجھے سناسکتے ہو؟ اس پر حضرت جعفرؑ نے سورہ مریم کی ابتدائی چند آیات تلاوت کیں، جنہیں سن کر نجاشی زار و قادر و رونے لگا، اس کی آنکھوں سے آنسو وال ہو گئے جو اس کے رخساروں پر بپنے لگے..... تب بے اختیار وہ بول اٹھا: إِنْ هَذَا وَالَّذِي جَاءَ بِهِ عِيسَىٰ لَيَخْرُجُ مِنْ مَشْكَأً وَاحِدَةٍ یعنی ”پیش کیا کلام اور وہ کلام جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام لائے ہیں، دونوں ایک ہی چراغ سے نکلے ہوئے نور ہیں“۔

نجاشی حضرت جعفرؑ کی تقریر سے اور پھر ان کی زبانی سورہ مریم کی تلاوت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ان مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور پھر

مشرکین مکہ کے وفد کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہنے لگا کہ ”اللہ نے مجھے یہ سلطنت رشوت لے کر عنایت نہیں کی پھر میں کسی سے رشوت کیوں لوں؟ اور وفد کو واپس لوٹ جانے کا حکم دیا۔ (۱)

جب یہ وفد ناکام و نامراد مکہ واپس پہنچا اور اپنی ناکامی و وزلت کی داستان سردار ان قریش کے گوش گزار کی تو وہ غصے کے مارے دانت پیس کر رہ گئے !!

حضرت حمزہ، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا قبولِ اسلام:

انہی دنوں، یعنی جب آفتابِ نبوت کو مکہ شہر پر اپنی روشن کرنیں لکھیرتے ہوئے چھٹا سال چل رہا تھا، ایک بڑی خونگوار تبدیلی یہ آئی کہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ مشرف بالسلام ہو گئے، مکہ میں یہ انتہائی شریف انس اور بہت ہی صاحب وجاہت سمجھے جاتے تھے معاشرے میں ان کا بڑا مقام و رتبہ تھا اور انہیں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، رسول ﷺ کے چھپا تھے، خاندانِ بنوہاشم کے چشم و چراغ تھے

اور پھر صرف تین دن بعد ہی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی بالکل اچانک ہی مسلمان ہو گئے، حالانکہ اس سے قبل وہ دینِ اسلام کے شدید مخالف اور مسلمانوں کے سخت دشمن

(۱) چنانچہ یہ تمام مسلمان اس کے بعد بدستور جہش میں ہی رہے، اور پھر بودت کے تیر ہوں ہمال جب بھرت مدنیہ کے نتیجے میں رسول ﷺ و دیگر تمام مسلمان مستقل طور پر مدنیہ منتقل ہو گئے تب یہ مہاجرین جب شہ بھی وہاں سے مدنیہ پہنچ گئے۔ البتہ جب شہ میں قیام کے دوران ایک بار کسی نے یہ غلط خبر اڑا دی کہ تمام مشرکین مکہ اسلام قبول کر کچے ہیں، جس پر متعدد حضرات جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نیزان کی الہیہ حضرت رقیۃ بنت رسول بھی شامل تھیں جب شہ سے مکہ واپس آگئے، لیکن یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اطلاع غلط تھی، چنانچہ یہاں پہنچنے کے بعد انہیں از سر نو مشرکین مکہ کی طرف سے اذیتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور پھر جب بھرت مدنیہ کا حکم نازل ہوا تب ان حضرات نے دوبارہ بھرت کی، یعنی پہلے مکہ سے جب شہ کی جانب، اور پھر مکہ سے مدنیہ کی جانب۔

تھے، ہمیشہ مسلمانوں کے درپے آزار رہتے تھے، انتہائی بہادر دلیل اور تندرست و توانا قسم کے انسان تھے، مکہ میں ان کا بہت زیادہ رعب اور بد بہ تھا، بڑے بڑے بہادر اور جوان ان کے نام سے لرزتے تھے..... جیسا کہ مشہور صحابی رسول حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمرؓ کا قبولِ اسلام ہم مسلمانوں کیلئے عزت کا ذریعہ اور فتح و نصرت کا پیش خیمه تھا، ہم مسلمانوں نے عمرؓ کے قبولِ اسلام کے بعد پہلی بار علی الاعلان اور کھلے عام بیت اللہ کا طواف کیا اور وہاں نماز ادا کی، اس سے قبل ہمیں کبھی یہ جرأت نہ ہوئی تھی (۱)

ترغیب و تہییب کا سلسلہ:

بشرکین مکہ کے وفد کی جبوشہ سے ناکام واپسی اور پھر اس کے فوری بعد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، اور پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام یہ پے درپے ایسے واقعات تھے جن سے مشرکین مکہ انتہائی افسردہ و پژمردہ ہو گئے اور ان کے حوصلے پست پڑنے لگے لہذا پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی تمام ترقیت و عداوت کے باوجود اب انہوں مسلمانوں کے ساتھ مصاختی رویہ اپنانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں گفت و شنید کی غرض سے انہوں نے متعدد بار رسول ﷺ سے، نیز ابوطالب سے ملاقا تین کیں، جو کہ آپؐ کے چچا بھی تھے اور سر پرست بھی۔

☆..... چنانچہ اسی سلسلے میں مشرکین مکہ نے اپنے ایک مشہور سردار عتبہ کو آپؐ کے ساتھ

(۱) مازلنا أعزّة منذ أسلم عمر (صحیح البخاری، باب اسلام عمر) ولقد رأیتنا ما نستطيع أن نصلّی الى البيت حتى أسلم عمر (طبقات ابن سعد ۲۷/۳) انَّ اسلامه كان نصراً (المعجم الكبير للطبراني ۹/۱۸۱) دین کے معاملے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اسی بے مثال جرأت و شجاعت کی وجہ سے ہی رسول ﷺ نے انہیں ”فاروق“ کا لقب عطا غیر مایتحا۔

گفت و شنید کی غرض سے بھیجا، جس نے آپ گوئا طب کرتے ہوئے کہا: ”اے بھتیجے! آپ نے پوری قوم کو مصیبت میں بتلا کر کھا ہے، آپ نے ہماری جماعت کو کٹڑے کٹڑے کر دیا ہے..... ان سرگرمیوں سے اگر آپ کا مقصود مال و دولت سمیٹنا ہے، تو ہم سارے عرب کے خزانے آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دیں گے..... اگر آپ کو عزت اور نام و نمود کی طلب ہے تو ہم آپ کو اپنا سردار مان لیں گے، اگر حکومت کی تمنا ہے تو ہم آپ کو پورے ملک عرب کا حکمران تسلیم کر لیں گے..... اور اگر آپ پر کسی جن بحوث یا آسیب کا اثر ہے..... تب بھی ہمیں بتائیے..... ہم آپ کیلئے کسی قابل ترین جھاڑ پھونک کرنے والے کا انتظام کر دیں گے!.....!

رسول ﷺ نے دورانِ گفتگو کی موقع پر اسے روک ٹوک نہیں کی..... اس کی بات کو کھانا نہیں..... بلکہ نہایت تحمل اور توجہ سے اس کی پوری گفتگو سنی، جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا تب آپ نے اس سے دریافت فرمایا: ”کیا تم اپنی بات کہہ چکے؟“ اس نے جواب دیا: ”ہاں“، تب آپ یوں گویا ہوئے:

”نہ میں مال و دولت جمع کرنا چاہتا ہوں، نہ سرداری اور بادشاہت کی تمنا ہے، نہ میں بیمار ہوں اور نہ آسیب زدہ..... جس قدر باتیں تم نے کہی ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی مجھ میں نہیں ہے..... مجھ کو تو بُن اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے، اپنی کتاب مجھ پر نازل فرمائی ہے، اور مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس کے عذاب سے ڈراوں“۔

اور پھر آپ ﷺ نے اس کے سامنے سورہ حم السجدہ کی تلاوت شروع کی..... ﴿ حَمٌ ، تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ، كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ، بَشِيرًا وَ نَذِيرًا فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ آپ یہ

سورت پڑھتے گئے..... اور عتبہ انتہائی انہاک کے ساتھ جیران و پریشان اور مہوت ہو کر اللہ کا کلام سنتا رہا..... آپؐ کی طرف ٹکلٹکی باندھے دیکھتا رہا..... اور قرآن کی حلاوات اس کے رگ و پے میں اترتی چل گئی..... آخر آپؐ ﷺ جب اس آیت پر پہنچے:

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذِرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّ نَمُودَ...﴾

یعنی: ”اگر اب بھی یہ روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ میں تمہیں ڈراتا ہوں اس کڑک سے جو عاد اور نمود کی کڑک جیسی ہوگی“ (۱)

یہ آیت سن کر عتبہ کے ہوش و حواس جواب دینے لگے..... اور بے ساختہ اس نے اٹھ کر آپؐ کے ہونٹوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے..... اور یوں انتخاء کرنے لگا:

”بس کرو..... سمجھتے ہیں..... میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں میں تمہیں قرابت داری کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ..... اب بس کرو.....“

اس کے بعد وہ سر جھکائے ہوئے بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چل دیا، اور اس کے ساتھی سردار ان قریش جواس کی آمد کے منتظر تھے..... جنہوں نے اسے بھیجا تھا..... وہ اس کا یہ بدلا ہوا انداز دیکھ کر پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ ”لو..... یہ تو..... بدلتا گیا.....“ اور پھر عتبہ نے ان کے قریب پہنچ کر انہیں کہا کہ: ”اس شخص (یعنی محمد ﷺ) کو اس کے حال پر چھوڑو..... بس..... اسی میں ہم سب کیلئے بہتری ہے“ (۲)

☆..... اسی طرح ایک بار سردار ان قریش نے ”کچھ لو، کچھ دو“ کا اصول اپناتے ہوئے رسول ﷺ کو یہ پیش کی کہ ”آپؐ ہمارے معبدوں کی مخالفت چھوڑ دیجئے، ہم آپؐ

(۱) یعنی ایسی خوفناک کڑک ہوگی کہ جیسی کڑک سے قوم عاد اور قوم نمود کو ہلاک کیا گیا تھا۔

(۲) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر، سورہ حم الحجۃ، نیز دیگر تکہ تفسیر و حدیث و تاریخ۔

کے دین کی مختلف چھوڑ دینے ہیں، نیز یہ کہ ایک سال آپ ہمارا دین اختیار کر لیا کریں، اور پھر ایک سال ہم آپ کا دین اختیار کر لیا کریں گے، یوں مل جل کرہے لیتے ہیں،“ ان کی اس لغو و بیہودہ پیشکش کے جواب میں ”سورۃ الکافرون“ نازل ہوئی جس میں یہ وضاحت و صراحت کردی گئی کہ ایسا ممکن نہیں.....!!

☆.....اسی طرح ایک بار سدارانِ قریش عمارہ بن مغیرہ نامی ایک نہایت خوب رون جوان کوئے ہوئے آپ ﷺ کے سر پرست اور چچائیں ابوطالب کے پاس پہنچے اور انہماں احتمانہ قسم کی پیشکش کرتے ہوئے کہا: ”اے ابوطالب! آپ اس خوب رون جوان کو اپنا فرزند بناتجھے..... اور اپنے بھتیجے محمد کو ہمارے حوالے کر دیجھے،“

اس پر ابوطالب نے جواب دیا: ”واہ..... کیا خوب مشورہ ہے..... کہ میں اپنے فرزند کو تو تمہارے حوالے کر دوں..... تاکہ تم اسے ہلاک کر ڈالو..... اور تمہارے لڑکے کی پرورش میں اپنے ذمے لے لوں؟“

ابوطالب کی زبانی یہ جواب سن کر وہ لوگ کھسیا نے ہو کر وہاں سے چلتے بنے۔

یوں جب ان کی نامتر عیاریاں بے کار و بے سود ثابت ہوئیں..... تو آخر وہ جھنجھلا اٹھے..... اور تنگ آ کر ایک روز وہ باقاعدہ وفر کی شکل میں ابوطالب کے پاس پہنچے، جب سخت گرمی پڑ رہی تھی جھلسادی نے والی لوکے جھکڑ چل رہے تھے، سورج سروں پر آگ برسا رہا تھا، گرمی کی شدت کی وجہ سے ہر کوئی اپنے گھر میں دیکا بیٹھا ہوا تھا..... ایسے میں یہ لوگ خلاف معمول، اچانک اور بے وقت ابوطالب کے پاس جا پہنچے، مزید یہ کہ ان کے تیور بھی کافی بد لے ہوئے تھے..... انداز..... اور لب ولہجہ بھی بدلا ہوا تھا.....

یہ سب کچھ دیکھتے ہی ابوطالب نے معاں ملے کی نزاکت کو فوراً ہی بھانپ لیا، اور ان سے یوں

اچانک اور بے وقت آمد کی وجہ دریافت کی۔

جس پرانہوں نے کہا کہ: ”اے ابوطالب! ہمارے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا ہے..... ہم اپنے بتوں اور بزرگوں کے خلاف اس طرح اس نئے دین کی نشر و اشاعت کو کسی صورت گوارانہیں کر سکتے..... اب یا آپ اپنے بھتیجے کو لگام دے دیجئے..... ورنہ ہم نے ٹھان لی ہے کہ..... ہم دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک ضرور ہلاک ہو جائے گا۔“

اس دھمکی نے ابوطالب کو پریشان کر دیا، کیونکہ انہیں اس بات کا خوب احساس و ادراک تھا کہ قریش اپنی بات کے خوب پکے ہوتے ہیں، جو ٹھان لیتے ہیں وہ ضرور کر گزرتے ہیں.....!

لہذا ابوطالب نے آپ ﷺ کو بلوایا، آپ سوچ میں پڑ گئے کہ اتنی تپتی ہوئی دوپہر میں بچانے بلوایا ہے..... نہ جانے کیا معاملہ ہے.....؟ آپ بچا کے پاس پہنچ تو انہوں نے اپنے لاڈ لے بھتیجے کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے ہی درد انگیز لمحے میں کہا: ”بھتیجے! میرے کندھوں پر اتنا بوجھنا نہ ڈالو..... جسے میں برداشت نہ کر سکوں“

اپنے مشفق و مہربان بچا کی زبانی یہ بات سن کر آپ گویہ خیال گذرا کہ شاید اب میرے بچا میری مد و حمایت سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں.....

یہ سوچ کر آپ نے جواب دیا: ”اے میرے بچا! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں..... تب بھی میں اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا..... یہاں تک کہ اللہ خود اس کام کو پورا کر دے..... یا میں خود اس کوشش میں ہلاک ہو جاؤں.....“

آخری جملہ کہتے کہتے آپ گی آنکھوں میں آنسو آگئے، اور آپ وہاں سے اٹھ کر جانے لگے، ابھی آپ وہاں سے چلے ہی تھے کہ..... لاڈ لے بھتیجے کا یہ حال ابوطالب سے دیکھا نہ گیا،

بھتیجے کی آنکھوں میں آنسو..... ابوطالب کے دل پر تو بس چھریاں ہی چل گئیں..... اور بے اختیار پکارا ٹھے..... ”بھتیجے! یہاں آؤ..... میرے پاس.....“ چھا کی اس پکار پر آپ ﷺ کے بڑھتے ہوئے قدم اسی جگہ رک گئے، اور آپُ واپس پلٹے، چھا کے پاس پہنچے تو انہوں نے شفقت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا: ”بھتیجے! جو جی میں آئے کرو..... میں تمہارا ساتھ ہر گز نہ چھوڑوں گا۔“

مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ):

آخر جب نہ ترغیب سے کام بنا اور نہ ہی ترہیب کسی کام آئی، نہ لالج نے کوئی اثر دکھایا اور نہ ہی دھمکی سے کوئی فائدہ ہوا..... تو مشرکین کہنے انتہائی سنگدلی و سفا کی کامظاہرہ کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے مکمل طور پر معاشرتی مقاطعہ کر لیا جائے، یعنی پورے شہر مکہ میں کوئی ان کے ساتھ سماجی، یا تجارتی، یا اور کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھے، اور اس ظالمانہ مقاطعہ کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے آباؤ اجداد کے دین سے غداری کی ہے۔

یہ مقاطعہ تین سال مسلسل جاری رہا، اس تمام عرصے میں آپُ اپنے خاندان سمیت شعب ابی طالب میں مصوّر رہے، یہ دور مسلمانوں پر بہت سخت گذر رہا، اس دوران انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں، ایسی نوبت بھی آئی کہ بھوک مٹانے کیلئے وہ درختوں کے خشک پتے کھاتے رہے..... اور خشک چڑی کا ٹکڑا پانی میں بھگوکر باری باری سب چوتے رہے.....!! ان کے معصوم بچے بھوک اور پیاس کی شدت سے روتے اور بلکتے رہے.....!! اسی کیفیت میں مکمل تین سال گذر گئے..... آخر..... نبوت کے دسویں سال کے آغاز میں ماہ محرم میں اشارہ الٰہی سے دیک اس صحیفے کو کھائی جس پر یہ معاهدہ تحریر تھا، تب قریش میں

سے ہی ایک شخص مطعم بن عدی نے اس صحیفے کے باقی ماندہ حصے کو بھی چاڑ کر پھینک دیا.....
اور یوں اس ظالمانہ مقاطعے کا اختتام ہو گیا۔

عام الحزن (غم کا سال):

نبوت کے دسویں سال رسول ﷺ اور آپؐ کے اہل خاندان کو شعب ابی طالب سے
نکل ہوئے ابھی بمشکل چند ماہ ہی گزرے تھے کہ آپؐ کے سر پرست اور مشفق و مہربان
بچا ابوطالب کا انتقال ہو گیا، یقیناً آپؐ کیلئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا (۱)
اور پھر اس کے کچھ عرصے بعد ہی آپؐ کی زوجہ مطہرہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ بنت
خولید رضی اللہ عنہا بھی داعی مفارقت دے گئیں۔

پے در پے یہ دونوں صدے آپؐ کیلئے انتہائی رنج والم کا باعث بنے، گھر سے باہر جا لفین
ومفسدین کے مقابلے میں ہمیشہ مضبوط چٹان کی مانند ڈٹے رہنے والے مشفق و مہربان بچا
اب اس دنیا میں نہیں رہے..... گھر کے اندر ہمیشہ تسلی دینے والی رفیقة حیات یعنی حضرت
خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی نہیں رہیں..... جو کہ گذشتہ بچپس سال سے مسلسل آپؐ کیلئے خلوص
و وفا کا پیکر بنی ہوئی تھیں..... اور جو آپؐ کے بچوں کی والدہ بھی تھیں..... (۲)

لہذا اب آپؐ کا نہ گھر سے باہر دل گلتا تھا..... اور نہ ہی گھر کے اندر.....!

نیز یہ کہ ابوطالب کی وفات کے بعد کفار و مشرکین کے حوصلے بھی خوب بڑھ گئے، کیونکہ آپؐ

(۱) ایک تو بچا کی وفات کا صدمہ بچا بھی ایسے کہ جوزندگی بھر پشت پناہی وہ مردی کرتے رہے
اور پھر مزید صدمہ اس لئے کہ بچا کی وفات اپنے آبائی دین یعنی "شک" پر ہوئی۔

(۲) سوائے ابراہیم کے جن کی ولادت بہت بعد میں مدینہ میں حضرت ماریہ قبطیہؓ سے ہوئی اور پھر تقریباً ۴۰ سال
کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

کے معاملے میں انہیں پورے شہر کہ میں بس ابوطالب ہی کا لحاظ تھا..... اب یہ چیز بھی ختم ہو گئی..... لہذا اب آپؐ کی مشکلات میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو گیا.....!
یہی وہ مشکل ترین حالات تھے جن کی وجہ سے آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے اس دور کو تاریخ میں "عام الحزن"، یعنی "غم کا سال" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مکی زندگی کا تیسرہ دور:

مکہ سے باہر دعوت و تبلیغ اور سفر طائف:

مشرکین مکہ کی طرف سے مسلسل بدسلوکی، اور ایذا اور رسانی کے اس لامتناہی سلسلے سے شگ آ کر آخر بہوت کے دسویں سال ماهِ شوال میں رسول اللہ ﷺ نے شہر طائف کا رخ کرنے اور وہاں کے باشندوں کو پیغامِ حق پہنچانے کا فیصلہ فرمایا، طائف مکہ سے تقریباً ساٹھ میل (سوکلومیٹر) کے فاصلے پر واقع پہاڑی علاقہ ہے، جہاں بلند و بالا پہاڑ بکثرت پائے جاتے ہیں، راستہ انتہائی مشکل، خطرناک اور دشوار گذار ہے، آپؐ نے یہ طویل مسافت پیدل اپنے قدموں پر چل کر طے کی، راستے میں متعدد قبائل کے مساکن سے گذر ہوا، آپؐ نے ان سبھی کو دینِ اسلام کی دعوت دی، لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس پیغامِ حق کو قبول نہ کیا۔

آخر یہ دشوار گذار اور انتہائی خطرناک پہاڑی راستہ پیدل طے کرتے ہوئے آپؐ طائف شہر جا پہنچے، جو اس وقت مشہور قبائل ہوازن، نیز بنو ثقیف کا مسکن تھا، وہاں آپؐ نے مسلسل دس روز قیام فرمایا، اس دوران آپؐ نے پہلے ان کے سرکردہ افراد کو اور پھر ان سے مالیوں ہو جانے کے بعد ہر خاص و عام کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دی..... مگر ان بدجختوں نے

آپ کی اس دعوت کو قبول کرنے کی بجائے حد درجہ بے مرتوی اور سگندلی کام مظاہرہ کیا، نیز آپ کی شان میں گستاخی اور بدسلوکی کی انتہاء کر دی..... شہر کے آوارہ اور اباش قسم کے نوجوانوں کو پیچھے لگا دیا..... جو مسلسل آپ کا تعاقب کرتے رہے..... آپ پر آوازے کستے رہے..... بیہودہ گوئی کرتے رہے..... اسی پر بس نہیں..... بلکہ مسلسل پھر بر ساتے رہے، یہاں تک کہ آپ کے پاؤں مبارک یہاں ہو گئے اور جو تے خون سے بھر گئے..... اس حالت میں آپ نے وہاں سے مکہ کی جانب واپسی کا سفر شروع کیا، تقریباً تین میل کی مسافت طے کرنے کے بعد آپ جب ایک باغ میں سے گذر رہے تھے تو وہاں کچھ ستانے کی غرض سے انگور کی بیل کے نیچے سائے میں آپ نے توقف فرمایا..... عجب بیچارگی تھی..... اس قدر طویل سفر کی مشقت..... اور پھر یہ کہ کوئی اپنی ذاتی غرض نہیں تھی..... بلکہ محض اللہ کا پیغام پہنچانا مقصود تھا..... مگر..... انجام کیا ہوا.....؟ یہی سب کچھ سوچ کر آپ اُس وقت انتہائی صدمے کی کیفیت میں تھے..... بے بُسی و بیچارگی کی انتہاء ہو گئی تھی..... اسی کسی پرسی و بیچارگی کی کیفیت میں آپ اپنے خالق و مالک سے لوگائے ہوئے اس کے سامنے آہ و فریاد اور الحاح و زاری میں مشغول ہو گئے..... اور تب آپ کے دل سے وہ آہ نکلی جس نے زبان تک پہنچتے پہنچتے عجیب و غریب کلمات کاروپ دھار لیا..... ایک ایسی دعاء آپ کی زبان پر جاری ہو گئی جس کا ایک ایک کلمہ اپنے اندر ایک سمندر سمیٹنے ہوئے ہے..... جس کے ایک ایک لفظ میں عجب تاثیر ہے، کسی اور موقع پر آپ ﷺ سے ایسی عجیب و غریب دعاء منقول نہیں ہے.....

اللّٰهُمَّ إِلَيْكَ أَشْكُوا ضَعْفَ قُوَّتِي وَ قَلَةَ حِيلَتِي وَ هَوَانِي عَلَى النَّاسِ، أَنْتَ أَرَحْمُ الرَّاحِمِينَ وَ أَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِينَ، وَ أَنْتَ رَبِّي، إِلَيْكَ مَنْ تَكَلَّنِي؟

إِلَى بَعِيدٍ يَتَجَهُنِي؟ أَو إِلَى عَدُوٍّ مَلْكَتَهُ أَمْرِي؟ إِنْ لَمْ يَكُنْ بِكَ غَصْبٌ
عَلَيَّ فَلَا أَبْالِي، غَيْرَ أَنْ عَافَيْتَكَ هِيَ أَوْسَعُ لِي، أَعُوذُ بِنُورِ وَجْهِكَ
الَّذِي أَشْرَقْتُ لَهُ الظُّلُمَاتُ، وَصَلَحَ عَلَيْهِ أَمْرُ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ، مِنْ أَنْ
يَحْلَّ عَلَيَّ غَصْبُكَ، أَوْ يَنْزِلَ بِي سَخْطُكَ، لَكَ الْعُتْبَى حَتَّى تَرْضَى، وَلَا
حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ۔ (۱) (۲)

ترجمہ: ”اے اللہ! میں تھجی سے شکایت کرتا ہوں اپنی قوت کے ضعف اور کمی کی، اور اپنی تدبیر کی ناکامی کی، اور لوگوں کی نظر و میں اپنی خفت و بے تو قیری کی، اور توسہ رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، اور تو ہی کمزوروں کی پروشن کرنے والا ہے، تو ہی میرا رب ہے، پھر تو مجھے کس کے سپرد کر رہا ہے؟ کسی غیر آدمی کے جو مجھ سے درشتی سے پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے جو میرے ساتھ جو چاہے کرے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہ ہو۔۔۔۔۔ تو پھر مجھے ان سب چیزوں کی کوئی فکر نہیں، ہاں البتہ تیری دمی ہوئی عافیت میرے لئے زیادہ بہتر ہے، میں تیرے مبارک نور کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ جس سے تمام اندر ہیرے روشن ہو جاتے ہیں، اور جس کی بناء پر دنیا و آخرت کے تمام کام درست ہو جاتے ہیں، اس بات سے کہ مجھ پر تیرا غصب نازل ہو، یا تیری ناراضگی مجھے آگھیرے، میرا کام بس یہی ہے کہ تجھ راضی کرنے اور منانے میں ہی لگا رہوں جب تک کہ تو راضی نہ ہو جائے۔۔۔۔۔ اور نہیں۔۔۔۔۔

(۱) الطبراني في الدعاء [۱/ ۳۱۵] السيرۃ العلویۃ لابن حشام [۲/ ۲۶۸]

(۲) بعد میں کسی موقع پر جب امام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ یا رسول اللہ کیا آپ کی زندگی میں احمد کے دن سے بھی زیادہ مشکل کوئی دن گذر رہے؟ اس پر آپ نے جواب دیا تھا کہ ہاں میری زندگی کا سب سے مشکل ترین دن ”عقبہ“ کا دن تھا۔۔۔۔ ملاحظہ ہو حدیث: کان اشد مالقیت نہیں یوم العقبۃ۔۔۔۔ (متفق علیہ) اس حدیث میں ”عقبہ“ سے مراد طائف کی پہاڑی گھاٹیاں ہیں۔

ہے کوئی سہارا اور نہ ہی کوئی وسیلہ سوائے تیرے۔“

یہ باغ دراصل ربیعہ کے میٹوں عتبہ اور شیبہ کی ملکیت تھا، اس وقت وہ دونوں کچھ فاصلے پر وہاں موجود تھے اور مسلسل رسول اللہ ﷺ کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کر رہے تھے، آپؐ کی یہ حالت دیکھ کر..... اور پھر آپؐ کی اس عجیب و غریب دعاء کے یہ دل سوز کلمات سننے کے بعد..... ان کے دل میں کچھ رحم کے جذبات بیدار ہونے لگے، تب انہوں نے انگوروں کا ایک چھا اپنے خادم کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ انگور اس شخص (یعنی رسول اللہ ﷺ) کو دے آؤ، اس خادم کا نام عَدَّ اس تھا، جو کہ نصرانی تھا اور اللہ کے نبی حضرت یوسف علیہ السلام کے شہر ”نینوی“ کا باشندہ تھا، چنانچہ وہ انگوروں کا گچھائے ہوئے آپؐ کے قریب پہنچا اور انگور پیش کئے، آپؐ نے انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ”بسم اللہ“ کہا، جس پر وہ خادم انتہائی حیران ہوا، اور کہنے لگا کہ یہاں کے باشندے تو یہ الفاظ (یعنی بسم اللہ) نہیں کہتے.....؟ اس پر آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا کہ ”تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“ اس نے جواب دیا ”میں نیوی کا رہنے والا ہوں“ آپؐ نے فرمایا ”اس کا مطلب ہے تم یوس بن متنی کے علاقے سے تعلق رکھتے ہو؟“ اس پر وہ مزید حیران ہوا، اور کہنے لگا ”آپ کو یوس بن متنی کے بارے میں علم کیسے ہوا؟“ آپؐ نے فرمایا ”یوس میرے بھائی تھے، میری ہی طرح وہ بھی اللہ کے نبی تھے، آپؐ کی زبانی یہ بات سن کر عداس نے دیوانہ وار آپؐ کے ہاتھ پاؤں چومنا شروع کر دیئے..... اُدھر اس کے دونوں آفتابہ و شیبہ یہ منظر دیکھ کر آپؐ میں کہنے لگے ”لو..... یہ تواب گیا کام سے۔“

اور جب عداس رسول اللہ ﷺ کے پاس سے واپس اپنے ان آقاوں کے قریب پہنچا تو انہوں نے اس سے پوچھا کہ ”تم یہ کیا کر رہے تھے؟ اس شخص کے ہاتھ پاؤں کیوں اس

طرح چوم رہے تھے؟“ عَدَ اس نے جواب دیا: ”اس وقت تمام روئے زمین پر ان سے بہتر کوئی اور شخص نہیں ہے..... انہوں نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جو کہ صرف اللہ کا کوئی نبی ہی بتا سکتا ہے۔“ اپنے غلام کی زبانی یہ بات سن کر ان دونوں نے اسے جھٹک دیا..... اور پھر قدرے توقف کے بعد اسے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے ”تمہارا دین اس شخص کے دین سے بہتر ہے..... تم کہیں اس کی باتوں میں آ کر اپنادین نہ چھوڑ بیٹھنا۔“

اُس باغ میں اس مختصر سی راحت کے بعد آپ ﷺ وہاں سے آگے گئے منزل یعنی مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہو گئے، راستے میں قرن الشالب نامی مقام پر (۱) جب آپ پہنچ تو وہاں جبریل امین علیہ السلام نازل ہوئے اور فرمایا: إِنَّ اللَّهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْلِكَ لَكَ وَمَا رَدُّوا عَلَيْكَ یعنی ”اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کا راویہ دیکھ لیا ہے اور آپ کی باتوں کا جو کچھ انہوں نے جواب دیا ہے وہ بھی سن لیا ہے۔“

اور پھر مزید فرمایا: وَقَدْ بَعَثَ اللَّهُ إِلَيْكَ مَلَكَ الْجِبَالِ إِتَّأْمُرَةً بِمَا شِئْتَ فِيهِمْ یعنی ”اللہ نے میرے ہمراہ آپ کیلئے پہاڑوں کے فرشتے کو بھی بھیجا ہے تاکہ ان اہل طائف کے بارے میں آپ اسے جو چاہیں حکم دیں۔“

تب ملک الجبال یعنی پہاڑوں کے فرشتے نے خود آگے بڑھ کر سلام کیا اور کہا: إن شِئْتَ أَنْ أَطْبِقَ عَلَيْهِمِ الْأَخْشَبَيْنِ لَفَعَلْتُ یعنی ”اگر آپ حکم دیں تو میں ابھی ان دونوں پہاڑوں کو آپس میں ملا دوں۔“ (تاکہ یہ اہل طائف دونوں پہاڑوں کے درمیان پھلے جائیں اور یوں ان کا خاتمه ہو جائے)

(۱) یہ مقام طائف سے مکہ جاتے وقت راستے میں آتا ہے اور آجکل ”قرن المنازل“ کے نام سے معروف ہے، ریاض، دمام، نیز غایبی ممالک سے جو دعمرہ کیلئے زمینی راستے سے مکہ مکرمہ جانے والوں کیلئے ”میقات“ یہی مقام ہے۔

لیکن اس موقع پر پہاڑوں کے فرشتے کی طرف سے اس پیش کش کے جواب میں نی رحمت ﷺ کی زبان مبارک سے اپنے ان بدترین دشمنوں اور بدخواہوں کیلئے جو الفاظ لئے عفو و درگذر کے باب میں انسانی تاریخ شاید کوئی ایسی مثال کبھی پیش نہیں کر سکے گی آپ نے اس فرشتے کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے ان دشمنوں کے بارے میں فرمایا: بَلْ أَرْجُو أَن يُخْرِجَ اللَّهُ عَزْ وَجَلْ مِنْ أَصْلَابِهِمْ مَنْ يَعْبُدُ اللَّهَ وَحْدَهُ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا یعنی ”انہیں ہلاک نہ کرو، کیونکہ مجھے اللہ سے امید ہے کہ وہ ان کی آئندہ نسلوں میں ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو صرف اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔“ (۱) (۲)

اس کے بعد رسول ﷺ نے مکہ کی جانب اپنا سفر جاری رکھا، جب آپ "وادی نخلہ"

(۱) صحیح بخاری [۳۲۳۱] کتاب بدء الخلق، باب: اذا قال احمد كم آمين..... نير صحیح مسلم، باب ما في النبي ﷺ من آذى المشركيين والمنافقين۔

(۲) پہاڑوں کے فرشتے کی طرف سے ان اہل طائف کو دنوں پہاڑوں کے درمیان یوں کچل کر ہلاک کر دلانے کی اس پیش کش کے جواب میں رسول ﷺ کی طرف سے یہ جواب ”رحمت و ہمدردی“ کے باب میں اگرچہ رہتی دنیا تک تمام دنیاۓ انسانیت کیلئے ایک روشن مثال ہے..... لیکن ہم بر صغیر اور خصوصاً پاکستان سے تعلق رکھنے والوں کو اس موقع پر بطور خاص اس اہم ترین تاریخی حقیقت کا استحضار کبھی کرنا چاہئے کہ بر صغیر میں سب سے پہلے دین اسلام کی شعع لے کر جو کم سن پہ سالا رپنچا..... وعظیم فاتح جس نے صرف سترہ برس کی عمر میں سندھ فتح کیا..... یعنی محمد بن قاسم اثشقی رحمہ اللہ..... اس کا تعلق بتوثیقیف سے تھا، اور اہل طائف سب ثقیقی ہی تھے۔ اگرچہ بعد میں بعض انتظامی امور کے پیش نظر محمد بن قاسم کے والد نیز پچا (جاجن بن یوسف ثقیقی) و دیگر متعدد اہل خاندان طائف سے بصرہ (عراق) منتقل ہو گئے تھے اور پھر فتح سندھ کے موقع پر محمد بن قاسم نے مکران، بلوچستان، سندھ اور ملتان کی جانب پیش قدی کا سلسہ بصرہ سے ہی شروع کیا تھا..... لیکن اصل میں تو اس کا وطن طائف تھا، لہذا اگر اہل طائف ہلاک کر دیئے جاتے تو محمد بن قاسم کبھی اس دنیا میں نہ آتا..... ولہذا خلقتہم شوؤون۔

نامی مقام پر تھے، اتفاقاً اسی وقت وہاں سے ”جنوں“ کی ایک جماعت کا گذر ہوا، اس وقت آپ تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے، جنوں نے آپ سے قرآن سناتوای جگہ رک گئے اور دیر تک قرآن سنتے رہے..... اور پھر اسلام بھی قبول کیا..... سورۃ الجن کی ابتدائی آیات نیز سورہ الحفاف کی آیات ۳۱ تا ۲۹ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ (۱)

اور پھر نبوت کے دسویں سال ماہ ذوالقعدہ میں آپ ﷺ واپس مکہ پہنچ گئے، جہاں موسم حج کے آغاز کے ساتھ ہی، حج کی غرض سے دور راز کے علاقوں سے آنے والے مختلف قبائل نیز متعدد شخصیات کو آپ نے دین اسلام کی طرف دعوت دی، جس پر ان کی طرف سے ملا جلارِ عمل سامنے آیا..... !!



- (۱) قل أَوْحى إِلَيْهِ أَنَّهُ استَمْعَنَ نَفْرَمِ الْجَنِ فَقَالُوا إِنَا سَمِعْنَا قَرآنًا عَجَباً..... (الجن: ۱)
وَادْصِرْفْنَا إِلَيْكَ نَفْرًا مِنَ الْجَنِ يَسْتَمِعُونَ الْقُرآن..... (الْحَقَافَ: ۲۹-۳۱)

اسراء و معراج:

نبوت کے بارہویں سال ماہ ربج ب میں وہ انتہائی عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جو کہ ”اسراء و معراج“ کے نام سے معروف ہے، اور جو کہ درحقیقت خالق کائنات کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے ایسا اعزاز اور شرف تھا کہ جو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی مقدس و برگزیدہ ترین جماعت میں سے صرف آپؐ ہی کو عطا کیا گیا..... کسی اور نبی کے حصے میں یہ سعادت نہ آسکی۔

یہ واقعہ اپنی ابتداء سے انتہاء تک عجیب و غریب اور انتہائی محیر العقول قسم کی باقتوں پر مشتمل ہے، جس کا مختصر تذکرہ کچھ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ رسول ﷺ کو اللہ کے حکم سے بیت المقدس اور پھر ملأاً اعلیٰ یعنی آسمانوں کی سیر کرائی گئی، جہاں آپؐ نے بہت کچھ دیکھا، جنت اور وہاں کی نعمتوں کا نیز جہنم اور وہاں کے عذاب کا مشاہدہ کیا، مختلف آسمانوں پر مختلف انبیائے کرام علیہم السلام سے ملاقات بھی ہوئی، یہ تمام مسافت رات کے ایک مختصر سے حصے میں طکر لی گئی اور آپؐ راتوں رات واپس مکہ مکرمہ بھی پہنچ گئے بیشک اللہ هر چیز پر قادر ہے !!

یہ سفر و حصول پر مشتمل تھا، پہلا حصہ زمینی سفر، یعنی مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک کا سفر، جس کا تذکرہ سورۃ الاسراء / بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں ہے (۱) سفر کے اس حصے کو ”اسراء“ کہا جاتا ہے، یہ سفر ”براق“ نامی جانور پر سوار ہو کر طے کیا گیا، جس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جہاں نگاہ پہنچتی تھی وہاں اس کے قدم پہنچتے تھے۔

(۱) سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بَعْدِهِ لَيَلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى

اس کے بعد آپ ﷺ کو جریل امین کی معیت میں بیت المقدس سے آسمانوں تک لے جایا گیا، سفر کے اس حصے کو ”معراج“ کہا جاتا ہے، اس کا تذکرہ سورۃ النجم کی ابتدائی آیات میں ہے (۱)

اس موقع پر آپ ﷺ کو تمام آسمانوں سے گزارنے کے بعد آخر ”سدرا المنشیٰ“ تک اور پھر اس سے بھی آگے لے جا کر قرب الہی اور شرفِ ہمکلامی سے نواز گیا، اورتب اسی موقع پر نماز کا تحفہ دیا گیا، جس سے نماز کی فضیلت و اہمیت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ باقی تمام عبادات کی فرضیت تو زمین پر ہوتی، جبکہ نماز کی فرضیت معراج کے موقع پر آسمانوں پر ہوتی، نیز یہ کہ باقی تمام عبادات کی فرضیت بذریعہ وحی فرشتے کے توسط سے ہوتی، جبکہ نماز کی فرضیت براہ راست ہوتی۔ (۲)

اس یادگار سفرِ معراج کے موقع پر آپ ﷺ نے جنت اور جہنم کے مختلف مناظر کا مشاہدہ بھی کیا، مثلاً:

☆.....بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا جو اپنے بہت موٹے پیٹ کی وجہ سے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے تھے، ان کی یہ حالت دیکھ کر آپ نے جریل امین سے دریافت فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جریل نے جواب دیا کہ یہ ”سودخور“ ہیں۔

☆.....تینیوں کامال کھانے والوں کو اس حال میں دیکھا کہ وہ اپنے منہ میں آگ بھر رہے

(۱) وَالنَّجْمُ إِذَا هَوَىٰ ، مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوَىٰ

(۲) یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ رسول ﷺ کی تسلی کیلئے معراج کا اور آسمانوں پر بلا کر مہمان نوازی کا انتظام کیا گیا..... اسی موقع پر آپ ﷺ کی امت کیلئے نماز کا تحفہ عطا کیا گیا..... اس کا مطلب یہ ہوا کہ ”نماز“ مؤمن کی معراج، نیز اللہ سے ملاقات و مناجات ہے، نماز میں بندے کیلئے اللہ کی طرف سے تسلی واطمینان کا سامان ہے، اور بے چین دل کیلئے سکون کا انتظام ہے۔

ہیں۔ (۱)

☆..... زانیوں کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ پا کیزہ اور تازہ گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا متعفن اور بد بودار گوشت کھار ہے ہیں۔

☆..... غیبت اور چغلی کرنے والوں کو دیکھا کہ ان کے لمبے لمبے پیتل اور تابنے کے ناخن ہیں، جن سے وہ اپنے چہروں اور سینوں کو مسلسل بری طرح نوچ رہے ہیں۔

☆..... مشرکین مکہ کا عمل:

رسول ﷺ راتوں رات جب اللہ کی قدرت سے بیت المقدس اور پھر آسمانوں کے اس سفر کے بعد واپس مکہ مکرمہ پہنچے اور مکہ والوں کو اس سفر کے بارے میں مطلع فرمایا تو اہل ایمان نے تصدیق کی، اور اسی نسبت سے خاص طور پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہمیشہ کیلئے تاریخ میں ”صدیق“ کے لقب سے معروف ہو گئے۔ (۲)

جبکہ مشرکین مکہ نے آپؐ کی زبانی اس سفر کی روادشنے کے بعد آپؐ کا بری طرح مذاق اڑایا، تماشا بنایا، اور تمثیر و استہزاء کا بازار گرم کر دیا..... اور پھر بالآخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ کیوں نہ محمد ﷺ کی سچائی جانے کی غرض سے ان کا امتحان لیا جائے آپؐ گواس سے قبل کبھی بیت المقدس یا مسجدِ اقصیٰ دیکھنے کا تفاق نہیں ہوا تھا، جبکہ خود مشرکین مکہ میں بکثرت ایسے لوگ موجود تھے جن کی بسلسلہ تجارت ملک شام اور بیت المقدس کی طرف آمد و رفت رہتی تھی اور وہ بارہا مسجدِ اقصیٰ کا ناظراہ بھی کر رکھتے تھے، لہذا ہم

(۱) جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أُموَالَ الْيَتَامَى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا (النساء: ۱۰۰) ترجمہ: ”وہ لوگ جو قبیلوں کا مال ناقٹ کھاتے ہیں پیش وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں، اور عقریب وہ خود بھی آگ ہی میں جا پہنچیں گے۔“ یعنی اس آیت کی عملی تقدیر کا رسول ﷺ کو مشاہدہ کر دیا گیا۔ (۲) مصنف عبد الرزاق [۳۲۸/۵]

مشاورت کے بعد انہوں نے آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ تقاضا کیا: صَفَ لَنَا المسِّجَدَ یعنی مسجدِ قصیٰ کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیے..... جس پر آپ انہیں مسجدِ قصیٰ کے بارے میں بتاتے رہے، ان کے سوالات کے جوابات دیتے رہے..... مگر بعض سوالات انہوں نے ایسے کئے جن کے جواب میں آپ گوکچہ تردد ہونے لگا، کیونکہ ظاہر ہے کہ آپ نے بیت المقدس اور مسجدِ قصیٰ میں اپنے اس مختصر ترین قیام کے دوران وہاں کی ہر چیز کا بغور مشاہدہ تو نہیں کیا تھا..... مزید یہ کہ یہ بات تو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ اس بارے میں مشرکین مکہ کے ساتھ سوال و جواب کی نوبت آئے گی۔

چنانچہ اب ان کے مسلسل سوالات کے نتیجے میں آپ گوجب کچھ تردد ہونے لگا..... تو اللہ کی قدرت سے بطورِ مجزہ کیفیت یہ ہو گئی کہ آپ گیلے پردے ہٹادیئے گئے اور مسافتیں سمیٹ دی گئیں، اور آپ گویوں محسوس ہونے لگا گویا مسجدِ قصیٰ بالکل آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی موجود ہے (۱) اور تب آپ نہایت روانی کے ساتھ اور بلا کسی تردد کے ان کے ہر سوال کا جواب دینے لگے..... اس پر وہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے آپ کے بارے میں یوں کہنے لگے: أَمَا النُّفُثُ فَقَدْ أَصَابَ یعنی ”مسجدِ قصیٰ“ کی اوصاف و علامات تو بالکل درست بیان کی ہیں۔

یوں مشرکین مکہ نے رسول اللہ ﷺ کی اس سچائی کو جان بھی لیا..... اور پھر خوب جانچ بھی لیا..... مگر اس کے باوجود اس سچائی کو قبول نہیں کیا۔

(۱) جیسا کہ حدیث کے الفاظ ہیں: فَجِيءَ بِالْمَسِّجِدِ حَتَّىٰ وُضِعَ، فَنَعَثَ الْمَسِّجَدَ وَ أَنَا أَنْظُرُ إِلَيْهِ یعنی گویا کہ مسجد میرے سامنے ہی لا کر رکھ دی گئی اور میں یوں انہیں مسجد کے اوصاف و علامات بتاتا رہا گویا میں اپنی آنکھوں سے مسجد کا ناظراہ کر رہا ہوں..... (النائل فی السنن الکبریٰ: ۱۰/۱۲۸)

سفر اسراء و مراج میں حکمتیں:

☆ رسول ﷺ کیلئے تسلی و غنواری کا انتظام:

اس یادگار، اہم ترین، نیز انہائی محیر العقول قسم کے سفر یعنی "اسراء و مراج" سے قبل مسلسل کچھ عرصہ تک پے درپے ایسی مشکلات و صعوبات کا ایک سلسلہ چلتا رہا جو رسول ﷺ کیلئے حدود رجہ ڈنی و جسمانی صدمات اور پریشانیوں کا سبب بنتا رہا، مثلاً آپؐ کے مشق و مہربان پچھا اور سر پرست ابو طالب کی وفات اور پھر کچھ عرصے بعد ہی آپؐ کی وفات شعائر فیضہ حیات ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال جس کے نتیجے میں کیفیت یہ ہوئی کہ نہ باہر آپؐ گوسکون ملتا تھا اور نہ ہی گھر کے اندر دل لگتا تھا۔

نیز یہ کہ ابو طالب کے بعد کفار و مشرکین کی طرف سے ایذا رسانیوں کا سلسلہ بھی مزید شدت اختیار کر گیا جس کے نتیجے میں آپؐ نے طائف کا رُخ کیا، مگر وہاں اہل طائف کی طرف سے انہائی ظلم و جفاء اور پر لے درجے کی بدسلوکی کا سامنا کرنا پڑا اور پھر اس کیفیت میں طائف سے مکہ واپسی پر مشرکین مکہ کی طرف سے مزید استہزا و تمسخر اور طعن تشنیع کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلا۔

یہ ایک ہلکی سی تصویر ہے اس انہائی تکلیف دہ اور آلام و مصائب سے بھر پور دو رکی جس سے اُن دونوں آپؐ ﷺ کو گذرنا پڑ رہا تھا۔

ایسے میں خالق ارض و سماء کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے تسلی و غنواری کا انتظام کیا گیا، ملاقات کا ایک سلسلہ ہوا، آسمانوں پر بلا یا گیا، کہ اے ہمارے حبیب! اگر یہ تمام زمین آپؐ پر تنگ کر دی گئی تو کیا ہوا؟ ہم نے تو آپؐ کیلئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے

ہیں.....ابوطالب جیسا محسن و مددگار.....او رخدیجہؓ جسی ہمدرد فاشاعر شخصیات اگر نہیں رہیں تو کیا ہوا.....ہم تو موجود ہیں آپؐ کی تسلی و غنواری کیلئے.....طاائف والوں نے آپؐ کی میزبانی و خبرگیری کی بجائے اگر آپؐ کے ساتھ بدسلوکی کی ہے.....آپؐ پر پھر بر سائے ہیں.....اور آپؐ کا دل دکھایا ہے تو کیا ہوا.....؟ ہم جو موجود ہیں آسمانوں پر ان سے بہت بہتر میزبانی کیلئے۔

لہذا اس سفر معراج کے ذریعے جہاں ایک جانب رسول اللہ ﷺ کو عظیم ترین شرف اور بے مثال اعزاز سے نوازا مقصود تھا.....وہیں اس کے ساتھ ساتھ خالق ارض و سماء کی جانب سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے مسلسل دکھوں اور پریشانیوں کے بعد اب تسلی و غنواری کا انتظام بھی مقصود تھا۔

☆.....آئندہ پیش آنیوالے مراحل کیلئے تیاری:

رسول ﷺ کی حیات مبارکہ اگرچہ اب تک مسلسل مشتقوں اور آزمائشوں سے بھر پور تھی، لیکن اب آئندہ عنقریب اس سے بھی بڑھ کر مزید ایسا دوڑا نے والا تھا جس کیلئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر مزید پختہ ایمان و یقین از حد ضروری تھا، مثلاً ہجرت مدینہ، وہاں نئے ماحول میں نئے مسائل کا سامنا، اور پھر کفار و مشرکین کے خلاف غزوات کی ابتداء.....وغیرہ.....غرضیکہ دین اسلام کی روشنی جواب تک مکہ شہر کی چار دیواریوں تک محدود تھی، اب وقت آگیا تھا کہ یہ روشنی مکہ شہر سے باہر نکلے اور تمام دنیا ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کے نور سے جگگا اٹھے.....بالفاظ دیگر اب مشکل ترین اور فیصلہ کن مرحلہ قریب تھا.....اور ظاہر ہے کہ اس کیلئے یقیناً بہت بڑی عزیمت اور پختہ یقین ناگزیر تھا۔

جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے جب فرعون جیسے سرکش،

انہائی ظالم و جا برو مغرب و متکبر انسان کے پاس جانے اور اسے اللہ کا پیغام پہنچانے کا حکم دیا گیا تو پہلے انہیں اللہ کی قدرت کا کچھ مشاہدہ کرایا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَى﴾ (۱) یعنی ”اے موسیٰ آپ کے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟“

اور پھر ان کے ہاتھ میں موجود اس لاثی کو زمین پرڈالنے کا حکم دیا گیا، اور تب وہ لاثی بڑا ہرا تا ہوا سانپ بن گئی، اور جب اللہ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام نے اس سانپ کو اپنے ہاتھ سے پکڑا تواب وہ سانپ دوبارہ لاثی بن گیا۔ اور اسی طرح دوسری نشانی بھی دکھائی گئی کہ اپنا ہاتھ بغل میں ڈالنے کے بعد جب باہر زکا لاتوہ خوب چکنے لگا..... اور اس کے بعد اللہ کی طرف سے ارشاد ہوا: ﴿لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى﴾ (۲) یعنی ”اے موسیٰ ہم آپ کو اپنی بڑی نشانیاں دکھانا چاہتے ہیں“، اور پھر یہ حکم دیا گیا: ﴿إذْهَبْ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى﴾ (۳) یعنی ”اب آپ فرعون کی طرف جائیے، اس نے تو بڑی سرکشی مچا کھلی ہے“۔ مقصد یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک بہت بڑی ذمہ داری سونپنے جانے سے قبل اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کرایا گیا تاکہ اس طرح اللہ پر ان کا یقین و ایمان مزید پختہ ہو جائے اور اس فریضے کی راہ میں آئندہ آنے والی مشکلات کا سامنا کرتے وقت کسی قسم کی گھبراہٹ یا تردکاشکار ہونے کی بجائے وہ خوب ثابت قدم رہیں۔

بعینہ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں سفرِ معراج کے تذکرہ کے ضمن میں ارشاد ہے: ﴿لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا﴾ (۲) یعنی ”تاکہ ہم اسے اپنی قدرت کے کچھ نمونے دکھادیں“، اس آیت میں خود اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اس یادگار سفر کا مقصد بھی بیان

(۱) ط [۲۳] (۲) ط [۲۳] (۳) النازعات [۷۱] (۴) الاصراء / بنی اسرائیل [۱]

کیا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کو اپنی کی قدرت کے کچھ نمونوں کا مشاہدہ و نظارہ کرنا مقصود تھا۔

اسی طرح قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ﴾ (۱) ترجمہ: ”یقیناً اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے کچھ نشانیاں دیکھ لیں“، یعنی رسول ﷺ کو اس سفرِ معراج کے موقع پر اللہ کی قدرت کی بہت سی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ و نظارہ کرایا گیا۔

اور ظاہر ہے کہ اس مشاہدے سے مقصود یہی تھا کہ اللہ پر یقین و ایمان مزید پختہ و مستحکم ہو جائے..... یعنی دعوتِ دین کے سلسلہ میں اب آئندہ پیش آنے والے مزید مشکل، اہم ترین اور فیصلہ کن مراحل کیلئے تیاری مقصود تھی۔

سفرِ اسراء و معراج میں امت کیلئے سبق اور پیغام:

☆.....اللہ سے لوگانے کی ضرورت:

سفرِ معراج سے قبل مسلسل ایسے حالات چل رہے تھے جو رسول ﷺ کیلئے بڑی پریشانی اور ذہنی صدمات کا باعث تھے، مثلاً ابوطالب کی وفات، اس کے بعد جلد ہی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال، اسی دوران مشرکین مکہ کی طرف سے ایذا رسانی کے معاملے میں شدت و تیزی، اور پھر اہل طائف کی طرف سے انہائی بدسلوکی و سنگدلی کا مظاہرہ..... ایسی جال گدا صورت حال میں آپؐ نے طائف سے واپسی پر دورانِ سفر ایک مقام پر رک کر نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ سے دعاء و مناجات اور آہ و فریاد کا سلسلہ شروع کیا..... آپؐ کی اس دعاء کی قبولیت کیلئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے گئے، مزید یہ

کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے اپنے حبیب ﷺ کی دل جوئی و تسلیم قلب کی خاطر عالم بالا کی سیر، یعنی ”سفرِ اسراء و معراج“، کا انتظام بھی کیا گیا۔

یقیناً اس میں ہمارے لئے یہ نہایت اہم سبق ہے کہ انسان کو ہمیشہ ہی اپنے خالق و مالک کے ساتھ اپنا تعلق اور رشتہ مضبوط و مستحکم رکھنا چاہئے، بالخصوص پریشانی اور مصیبت کے وقت تو اللہ کی مکمل اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ اس سے دعاء و مناجات، آہ فریاد اور اس سے لوگا نے کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہئے۔

☆.....نماز کی پابندی کی ضرورت:

اسراء و معراج کے اس یادگار و اہم ترین موقع پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے اپنے حبیب ﷺ کو ”نماز“ کا تحفہ عطا کیا گیا، تمام اسلامی عبادات میں سب سے پہلے نماز کی فرضیت ہوئی، نماز کی فرضیت معراج کے موقع پر آسمانوں پر ہوئی، جبکہ باقی تمام عبادات کی فرضیت زمین پر ہوئی کہ جبریل امین علیہ السلام کسی عبادت کی فرضیت کی خبر لے کر آئے، اور پھر یہ کہ نماز کی فرضیت فرشتے کے توسط کے بغیر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے براہ راست ہوئی، آخرت میں سب سے پہلے نماز ہی کے بارے میں سوال ہوگا، رسول ﷺ نے آخری وقت میں بالکل آخری وصیت نماز ہی کے بارے میں فرمائی..... ان تمام ہاتوں سے دینِ اسلام میں نماز کی بہت بڑی اہمیت واضح و ثابت ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ رسول ﷺ کو پریشانیوں کے اُس دور میں بالآخر آسمانوں کا یہ سفر کرایا گیا، تسلی کا انتظام کیا گیا..... ہم بھی تو اللہ ہی کے بندے ہیں..... اور ہم بھی تو رسول ﷺ کے امتی ہیں..... ہمیں بھی تو پریشانیاں ستاتی ہیں..... کون ہے اس دنیا میں جسے کوئی بھی پریشانی نہ ہو..... دنیا کی اس زندگی میں دکھ اور سکھ خوشی اور غم، دھوپ اور چھاؤں،

نشیب اور فراز..... روشنی اور اندھیرا..... یہ سب کچھ توہر ایک کے ساتھ لگا ہوا ہے.....
ہر انسان کی یہی کہانی ہے..... یہی قانونِ قدرت ہے..... جس کے سامنے امیر و فقیر،
چھوٹے بڑے، خادم و مخدوم، حاکم و حکوم، سبھی بے بُس اور لا چار ہیں.....!
الہذا پر یشانی اور صدمے کے وقت ہم کیا کریں.....؟ ہم کہاں جائیں.....؟ کس کے سامنے
اپنا دکھڑا بیان کریں.....؟ اور کس سے فریاد کریں.....؟

اس اہم ترین سوال کا جواب یہی ہے کہ اللہ کی طرف سے جب اپنے حبیب ﷺ کیلئے
مشکلات کے اُس دور میں اور صدمات کے اُس بھنوں میں بذریعہ "معراج"، تسلی و تسکین
کا سامان کیا گیا..... اسی رات اسی موقع پر ہی اپنے حبیب ﷺ کی امت کیلئے، یعنی ہمارے
لئے بھی اسی تسلی و تسکین کا انتظام کر دیا گیا..... یعنی ہمارے لئے "نماز" کا تحفہ عطا
کیا گیا..... یہ "نماز" ہمارے لئے معراج ہے..... یہ نماز ہمارے لئے اللہ سے ملاقات
ہے..... یہ نماز اللہ سے دعاء و مناجات ہے..... یہ نماز اللہ اور بندے کے درمیان وابستگی
و تعلق کا وسیلہ و ذریعہ ہے..... یہ نماز اللہ کے سامنے اپنی بندگی و محتاجی کا عملی اقرار و اظہار
ہے..... یہ نمازوں کے ہوئے دل کی فریاد ہے..... اس نماز میں ٹوٹے ہوئے دل کیلئے تسلی کا
انتظام اور بے قرار روح کیلئے تسکین کا سامان ہے.....!

الہذا واقعہ "اسراء و معراج" سے سبق حاصل کرتے ہوئے ہمیں نماز کی مکمل پابندی کا خوب
اهتمام کرنا چاہئے۔

☆..... مسجد سے رشتہ جوڑنے کی ضرورت:

رسول ﷺ کو اللہ کے حکم سے اس سفرِ اسراء و معراج پر مسجد سے لے جایا گیا۔ یعنی عالم
بالا کے اس سفر کی ابتداء اور اس "روحانی پرواز" کا آغاز مسجد سے ہوا نہ کہ کسی اور مقام سے

یقیناً اس سے ”روحانی پرواز“ اور ”باطنی ارتقاء“ کیلئے مسجد کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ لہذا مسلمان کیلئے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں مسجد کے ساتھ اپنا رشتہ خوب جوڑ کر کر کے، یہی معنی و مفہوم اس حدیث کا بھی ہے جس میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ قیامت کے روز جب تمام کائنات میں کہیں کوئی سایہ نہیں ہوگا، اس روز سات قسم کے انسانوں کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے بطورِ خاص اپنے عرش کے نیچے سائے میں جگہ عنایت کی جائیگی، انہی میں سے ایک قسم کے لوگ وہ ہوں گے جن کا دنیا کی زندگی میں مسجد کے ساتھ ایسا مضبوط تعلق تھا کہ گویا ان کا دل بس مسجد کے ساتھ ہی جڑ کرہ گیا تھا..... !! (۱)

☆ ”اخلاقی بلندی“، کیلئے فکر و جستجو کی ضرورت:

رسول ﷺ کو اس سفرِ اسراء و معراج کے موقع پر ”بلندیوں“ پر لے جایا گیا اور ”عالم بالا“ کا مشاہدہ کرایا گیا۔

لہذا آپؐ کے امتی ہونے کی حیثیت سے ہماری بھی یہی کوشش و خواہش ہوئی چاہئے کہ ہمیں بھی ”بلندی“، ”نصیب ہو، اور ”پستی“ سے ہم محفوظ و ماموں رہیں۔ اور اس مقصد کیلئے ہم اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کا اہتمام کریں، نیز ”بلند“ اخلاق و عادات اور ”اعلیٰ“ کردار اپنائیں..... بری عادات اور گھٹیا حرکات سے اپنا دامن بچائے رکھیں..... کیونکہ ایمان، عمل صالح، نیز اعلیٰ اخلاق و کردار دراصل ”بلندی“ ہے، جبکہ اس کے برعکس برے کام کرنا اور بری عادات اپنانا ”پستی“ اور ”گراوت“ ہے..... لہذا جب ہمارے نبی

(۱) ملاحظہ و حدیث؛ سَبْعَةُ يُظَاهِرُهُ اللَّهُ فِي ظَلَّهِ يَوْمَ لَا ظَلَّ إِلَّا ظَلَّهُ رَجُلٌ قَلْبُهُ مُعْلَقٌ فِي الْمَسَاجِدِ (بخاری [۲۲۹] بابِ مَنْ جَلَسَ فِي الْمَسْجِدِ يُنْظَرُ الصَّلَاةَ وَفِي الْمَسَاجِدِ

کو اس سفر کے موقع پر ”بلندیوں“ پر لے جایا گیا، تو پھر امتی کی حیثیت سے ہمیں یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ ہم ”لپستی“ اور ”گراوٹ“ میں بیٹلا رہیں۔

ارشادِ رباني: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ، ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾ کا یہی معنی و مفہوم ہے۔ یعنی ”ہم نے انسان کو پیدا کیا، بہترین صورت میں، پھر اسے نیچوں سے نیچا کر دیا، لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، ان کیلئے اجر ہے، کبھی نہ ختم ہونے والا۔“ (۱)

ان آیات میں ”اسفل سافلین“ سے مراد عقیدہ و ایمان کی خرابی اور بد عملی کے ساتھ ساتھ اخلاق و کردار کا گھٹیا پن اور گراوٹ بھی ہے جس کی وجہ سے جہنم میں ان کا ٹھکانہ سب سے نیچے ہوگا۔

☆.....نوافل کی فضیلت:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلاں رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: (یا بلال! حَدَّثْنِی بِأَرْجَحِ عَمَلٍ عَمِلْتَهُ عِنْدَكَ فِي الْإِسْلَامِ، فَإِنِّي سَمِعْتُ اللَّيْلَةَ حَشْقَتْ نَعْلَيْكَ بَيْنَ يَدَيِّ فِي الْجَنَّةِ) یعنی: ”اے بلاں! قبولِ اسلام کے بعد آپ نے جو بہترین عملِ انجام دیا ہے مجھے اس کے بارے میں بتائیے؟ کیونکہ آج رات میں نے آپ کی جو یوں کی آواز جنت میں سنی ہے۔“

اس پر حضرت بلاں رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مَا عَمِلْتُ عَمَلًا فِي الْإِسْلَامِ أَرْجَى

(۱) سورۃ العنكبوت [۵-۶]

عندی مَنْفَعَةً، مِنْ أَنِّي لَا أَتَظَاهِرُ طُهُورًا تَامًا فِي سَاعَةٍ مِنْ لَيلٍ وَلَا نَهَارٍ، إِلَّا صَلَّيْتُ بِذَلِكَ الْطَّهُورِ مَا كَتَبَ اللَّهُ لِي أَنْ أَصْلِي) (۱) یعنی: ”مسلمان ہونے کے بعد میرا وہ عمل جو میری نظر میں سب سے زیادہ مفید اور بہترین ہے وہ یہ کہ رات یادن کے کسی بھی حصے میں جب بھی میں خوب اچھی طرح وضوء کرتا ہوں، تو اس وضوء کے بعد اللہ مجھے جس قدر بھی توفیق عطا فرمادے، میں کچھ نماز ضرور پڑھتا ہوں“۔

یعنی حضرت بلاں رضی اللہ عنہ اپنی یہ معمول بیان فرمائے ہیں کہ رات ہو یادن، جب بھی میں وضوء کرتا ہوں تو حسب توفیق کچھ نہ کچھ نوافل ضرور پڑھ لیتا ہوں۔

یہی وہ عمل ہے جس کی بناء پر حضرت بلاں رضی اللہ عنہ کو اللہ سبحانہ، و تعالیٰ کی بارگاہ میں اس قدر بلند اور عظیم مقام و رتبہ نصیب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج کے موقع پر جنت میں حضرت بلاں رضی اللہ عنہ کے قدموں کی آہٹ محسوس فرمائی۔

یقیناً اس سے نوافل کی فضیلت و اہمیت ثابت ہوتی ہے، لہذا حسب توفیق نوافل کی ادائیگی کا ضرور اہتمام کیا جانا چاہئے۔

☆..... ذکر اللہ کی فضیلت:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (لَقِيْتُ ابْرَاهِيمَ لَيْلَةً أُسْرِيَ بِي، فَقَالَ: يَا مُحَمَّدًا! أَقْرِئِ أُمَّتَكَ مِنِّي السَّلَامَ، وَأَخْبِرْهُمْ أَنَّ الْجَنَّةَ طَبِيْبَةُ التُّرْبَةِ، عَذْبَةُ الْمَاءِ، وَأَنَّهَا قِيَعَانُ، وَأَنَّ غَرَاسَهَا: سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ، وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَاللَّهُ أَكْبَرُ) (۲)

ترجمہ: ”شہر معراج کے موقع پر میری ملاقات ابراہیم [علیہ السلام] سے ہوئی، تب انہوں

نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”اے محمد! اپنی امت کو میر اسلام کہئے گا، نیز انہیں میرا یہ پیغام بھی پہنچا دیجئے گا کہ جنت کی مٹی تو نہایت خوشگوار ہے، وہاں کا پانی خوب میٹھا ہے، وہاں کی زمین ہموار ہے، اور اس کی گھاس ”سُبْحَانَ اللَّهِ وَ الْحَمْدُ لِلَّهِ، وَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَ اللَّهُ أَكْبَرُ“ ہے۔

لیعنی ”جنت“ توبہت ہی عمدہ مقام ہے اور وہاں کے مناظرا تھائی دلکش اور جاذب نظر ہیں..... لہذا ہر مسلمان کو خوب ذوق و شوق اور ہمت کے ساتھ جنت کے حصول کیلئے کوشش ڈھن جو کرنی چاہئے، اور اس مقصد کیلئے یہ بات بھی معلوم ہونی چاہئے کہ وہاں کی لمبھلاتی کھینچیوں اور سر بزرو شاداب باغوں میں پہنچنے کیلئے طریقہ یہ ہے کہ ”سُبْحَانَ اللَّهِ وَ الْحَمْدُ لِلَّهِ، وَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَ اللَّهُ أَكْبَرُ“ کا خوب ورد کرتے رہنا چاہئے۔
یقیناً اس سے ”ذکر اللہ“ کی بہت زیادہ اہمیت و فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

معراج کے بعد:

سفر اسراء و معراج سے واپسی کے بعد رسول ﷺ مزید ذوق و شوق اور ہمت و جذبے کے ساتھ خلقِ خدا کو پیغامِ حق پہنچانے میں مشغول و منہمک ہو گئے۔ البتہ اب آپؐ کی زیادہ توجہ قریش کی بجائے ان قبائل کی طرف تھی جو کہ شہر سے باہر مضافاتی علاقوں میں آباد تھے، مثلاً بنو عامر، غسان اور کنده وغیرہ، نیز مذہبی، تجارتی و معاشی امور کی خاطر یہ ورنہ مکہ سے آنے والے افراد یا قبائلی و فودو وغیرہ..... چنانچہ ان دونوں آپؐ نے اس سلسلے میں مختلف و فواد اور شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔

..... انہی دونوں مدینہ (جس کا نام اس دور میں یثرب تھا) سے تعلق رکھنے والے ”سوید

بن الصامت“، نامی ایک مشہور شاعر اور دانشور کی مکہ آمد ہوئی، یہ صاحبِ شعر و شاعری کے علاوہ مزید یہ کہ عوام و خواص کی مختلف محافل و تقریبات میں اپنے مخصوص لتشیں انداز میں ”کلامِ لقمان حکیم“ سنایا کرتے تھے، جس کی وجہ سے لوگ ان سے بہت متاثر تھے، اور اسی بناء پر عوام و خواص میں ان کی اچھی خاصی شہرت اور مقبولیت تھی..... نیز یہ کہ اپنے خاندان اور حسب و نسب کے لحاظ سے بھی کافی معزز سمجھے جاتے تھے۔

ان کی آمد کے موقع پر مشرکین مکہ کو یہ سوچ کر بڑی تشیش ہوئی کہ کہیں یہ صاحب رسول اللہ ﷺ سے متاثر ہو کر مسلمان نہ ہو جائیں، کیونکہ ان کے مخصوص انداز کی وجہ سے لوگ تو پہلے ہی ان سے بہت متاثر ہیں..... اور اگر یہ مسلمان ہو گئے..... تو پھر یہ ہر جگہ..... ہر محفوظ میں ”کلامِ لقمان“ کی بجائے ”قرآن“ سنایا کریں گے..... تب ہمارا کیا بنے گا؟ یہ بات سوچ کر مشرکین مکہ نے ہر ممکن کوشش کی کہ رسول ﷺ سے ان کی ملاقات نہ ہو سکے..... لیکن اس کے باوجود ملاقات ہو گئی، اس ملاقات کے موقع پر آپؐ نے انہیں دینِ اسلام کے بارے میں اور قرآن کے بارے میں بتایا، جس پر یہ کہنے لگے کہ میرے پاس تو خود بہت عمده کلام ہے..... یعنی کلامِ لقمان..... اور پھر آپؐ گویہ کلام سنایا، اس پر آپؐ نے فرمایا ”یقیناً یہ بہت عمده کلام ہے“، لیکن میرے پاس تو ”کلامِ اللہ“ ہے، جو کہ تمہارے پاس موجود اس ”کلامِ لقمان“ سے بہت بہتر ہے..... اور پھر آپؐ نے قرآن کریم کی چند آیات تلاوت فرمائیں، جس پر یہ صاحب انتہائی متاثر ہوئے، اور کہا کہ واقعی یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا..... پیشک یہ تو اللہ ہی کا کلام ہے.....!

چنانچہ سوید بن الصامت آپؐ کی دعوت پر بلیک کہتے ہوئے مسلمان ہو گئے، لیکن اس کے بعد انہیں رسول ﷺ کی صحبت و معیت میں رہنے کا موقع نہیں مل سکا اور جلد ہی اپنے شہر

مدینہ کی جانب واپس روانہ ہو گئے، جہاں واپسی کے چند روز بعد ہی اوس فخر رح کے مابین ایک جنگ کے دوران ان کی وفات ہو گئی۔

☆.....اسی طرح انہی دنوں حجاز اور یمن کے درمیان واقع "تمامہ" نامی علاقے سے تعلق رکھنے والے مشہور و معروف اور طاقتور قبیلے "الدوس" کے سردار "طفیل بن عمر والدوسی" کی مکہ آمد ہوئی، مشرکین مکہ نے ان کا نہایت گر مجوشی کے ساتھ استقبال کیا اور خوب آؤ بھگت کی، اس کے بعد انہیں رسول ﷺ سے خوب خونزدہ کرتے ہوئے خبردار کیا کہ (نحوہ بالله) اس شخص کا جادواں قدر طاقتور ہے کہ اس کی تائیش سے بچنا انتہائی مشکل ہے، الہذا تم اس شخص سے بہت دور رہنا..... اور خاص طور پر یہ کوشش کرنا کہ اس کی کوئی بات تمہارے کا نوں تک نہ پہنچنے پائے، ورنہ تمہارے لئے بڑی مشکل کھڑی ہو جائیگی، تمہاری یہ شان و شوکت اور سرداری بھی جاتی رہے گی..... نیز رسول ﷺ کے بارے میں اسے مزید خبردار کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ وہ اکثر بیت اللہ کے قریب ہی نظر آیا کرتے ہیں۔

چنانچہ مشرکین مکہ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے احتیاطی تدبیر کے طور پر بیت اللہ کی طرف رواگی کے وقت طفیل نے اپنے کا نوں میں روئی ٹھونس لی، تاکہ اگر وہاں رسول ﷺ موجود ہوئے تو ان کی کوئی بات ان کے کا نوں تک نہ پہنچ سکے..... اور جب یہ بیت اللہ کے قریب پہنچ اور طواف شروع کیا تو وہاں ان کی نظر رسول ﷺ پر پڑی جو اس وقت وہاں قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول تھے، کسی طرح آپؐ کی کچھ آوازان کے کا نوں میں پڑ گئی اور جو کچھ ان کے کا نوں نے سنایا سے یہ بہت متاثر ہونے لگے اور اس میں انہیں انتہائی حلاوت اور کشش محسوس ہونے لگی..... تب انہوں نے مزید خوب اچھی طرح روئی اپنے کا نوں میں ٹھوٹی..... تاکہ "سحر زدہ" نہ ہو جائیں..... لیکن بے اختیار ان کا دل اس انتہائی

مکر و لنشیں کلام کو دوبارہ سننے کیلئے بیقرار ہونے لگا..... آخر انہوں نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کرتے ہوئے سوچا کہ میں کوئی معمولی یا نکما انسان تو نہیں ہوں میں تو اپنے اتنے بڑے اور اس قدر طاقتور قبیلے کا سردار ہوں تو پھر اس شخص کے کلام سے اتنا خوف کس لئے؟ میں کوئی ناس بھج بچ تو نہیں ہوں میں غلمان ہوں داشمند ہوں اچھے اور بے کی مجھے خوب تمیز ہے اور میں تو نہایت فصیح و بلیغ ادیب اور پہنچا ہوا شاعر اور خطیب بھی ہوں مجھے درست اور غلط کلام کی خوب بیچان ہے تو پھر یہ اتنا خوف آخر کس لئے؟ مجھے اس شخص کا کلام سن لینا چاہئے اور تب میں خوف فیصلہ کر لوں گا کہ اس کا کلام صحیح ہے یا غلط اچھا ہے یا برا اور پھر بالآخر انہوں نے اپنے کانوں سے وہ روئی نکال پھینکی اور انتہائی دلچسپی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی تلاوت قرآن کی طرف متوجہ ہو گئے اور پھر کچھ دیر بعد جب رسول اللہ ﷺ وہاں سے اپنے گھر کی جانب روانہ ہوئے تو یہ بھی پیچھے ہو لئے اور آپؐ کے گھر پہنچ کر اپنا عارف کرایا آمد کا مقصد بیان کیا اور پھر مشرف باسلام ہو گئے!

اور پھر کمہ سے واپس اپنے قبیلے میں پہنچنے کے بعد نہایت سرگرمی اور زورو شور کے ساتھ دینِ اسلام کی تبلیغ شروع کر دی، جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ تمام قبیلے مسلمان ہو گیا اور اس سلسلے میں ایک خاص قابل ذکر بات یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے انتہائی جلیل القدر صحابی اور آپؐ کی احادیث مبارکہ کے ایک بہت بڑے ذخیرے کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا، وہ بھی انہی دنوں اپنے قبیلے کے سردار یعنی طفیل بن عمرو الدؤسی رضی اللہ عنہ کی تبلیغی کوششوں اور دعویٰ سرگرمیوں کے نتیجے میں ہی مسلمان ہوئے

تھے۔

نئی منزل کی امید:

رسول ﷺ کو دشته گیارہ برس سے مسلسل مکہ میں گلی گلی اور کوچہ کوچہ گھوم کر شب و روز پیغام حق پہنچانے میں مشغول تھے..... مگر..... اب اتنا طویل عرصہ گذر جانے کے بعد آپ ﷺ کو مکہ کی بجائے بہت دور ایک جگہ سے امید کی کرنیں پھوٹی ہوئی نظر آنے لگیں، اور اب ٹھنڈی ہوا کے جھونکے وباں سے آتے ہوئے محسوس ہونے لگے.....!

آپ کو خواب میں آپ کے ”دارالجہۃ“ کا مشاہدہ کرایا گیا، آپ نے خواب میں ایک ایسی جگہ دیکھی جہاں نخستان یعنی بھوروں کے باعث بکثرت تھے، ظاہر ہے کہ انہیاں کرام علیہم السلام کے خواب سچے ہوا کرتے ہیں، لہذا آپ یہ اشارہ سمجھ گئے کہ مجھے میرا ”دارالجہۃ“ دکھایا گیا ہے۔

چنانچہ آپ کا ذہن کبھی ”تہامہ“ کی جانب جاتا..... اور پھر کبھی آپ کو اپنا وہ سفر یاد آتا جو آپ نے بہت پچین میں..... صرف چھ سال کی عمر میں..... اپنی والدہ کے ہمراہ کیا تھا..... یعنی ”سفر مدینہ“..... جب آپ خوب غور فکر کرتے تو پچین کی ان بھولی بسری یادوں کے درمیان آپ کے تصور میں مدینہ (جو اس وقت ”یثرب“ تھا) کا جو نقشہ ابھر کر سامنے آتا..... وہ کچھ ایسا ہی تھا..... کہ ہر طرف پھیلے ہوئے بکثرت بھوروں کے باعث..... اور تب مدینہ کیلئے آپ کا شوق مزید بڑھ جاتا۔

اسی دورانِ نبوت کے گیارہویں سال ایام حج کے دوران ایک رات آپ ﷺ میں بیرون مکہ سے آئے ہوئے حاج کی اقامت گاہوں میں گھوم پھر کر دعوت دین اور پیغام حق پہنچانے میں مشغول تھے، اس موقع پر آپ کے ہمراہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، نیز

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی ہمراہ تھے، تب وہاں آپ ﷺ کی ملاقات چھ افراد سے ہوئی جو کہ ”یثرب“ یعنی مدینہ کے باشندے تھے، آپ نے انہیں اپنی نبوت نیز دین اسلام کے بارے میں بتایا، اور پھر انہیں یہ دین برحق قبول کرنے کی دعوت دی۔ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ سب کچھ سننے کے بعد یہ لوگ گھری سوچ میں پڑ گئے، باہم سرگوشی کے انداز میں یوں کہنے لگے ”کہیں یہی وہ آخری نبی نہ ہوں کہ جن سے ہمیں ہمارے یہودی پڑوئی ڈراتے رہتے ہیں“۔

درactual مدینہ اور مکہ کے ماحول میں ایک بہت بڑا فرق یہ تھا کہ مکہ کے باشندے اگرچہ عمار کعبہ اور اپنے جد امجد یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے تو واقف تھے، لیکن آسمانی ادیان، نبوت، یا اسی طرح آسمانی والہامی کتب کا ان کے بیہاں قطعاً کوئی تصور نہیں تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی شدیدترین مخالفت پر کمر بستہ تھے اور آپؐ کی بات قبول کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں تھے۔

جبکہ اس کے برعکس مدینہ میں یہودی کی بڑی تعداد تھی جو کہ نسل درسل صدیوں سے وہاں آباد تھے، اور وہ نہ صرف یہ کہ وہاں کے اصل باشندوں یعنی عربوں کو نبوت اور گذشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں بتاتے رہتے تھے بلکہ مزید یہ کہ وہ اپنی برتری اور ان کی کمتری جتنے کی غرض سے انہیں یہ کہہ کر خوف زدہ بھی کرتے رہتے تھے کہ اب آخری نبی کے ظہور کا وقت آپ کا ہے..... ان کا ظہور اب کسی بھی وقت متوقع ہے..... نیز یہ کہ جب وہ ظاہر ہو جائیں گے تو ہم ان کے ساتھ مل کر تم لوگوں کو خوب مارا پیٹ کریں گے، اور پھونکہ وہ اللہ کے نبی ہوں گے اس لئے اللہ کی طرف سے ان کیلئے نصرت و تائید بھی ضروری ہوگی..... لہذا ہمیشہ ہم غالب و فاتح ہوا کریں گے اور تم مغلوب و مقہور.....!

یہودی طرف سے اس قسم کی باتیں وقاوٰ قاستے رہنے کی وجہ سے مدینہ کے ان عرب باشندوں کے ذہنوں میں ”نبوت“ اور ”انبیاء“ کا تصور موجود تھا، اور یہ ان کیلئے کوئی نئی یا عجیب و غریب بات نہیں تھی کہ جسے رسول ﷺ کی زبانی وہ سنتے ہیں۔ یکسر ٹھکرایتے یار د کر دیتے، الہذا مشترکین مکہ کے بر عکس انہوں نے یہ بات سن کر کوئی جارحانہ رویہ اختیار نہیں کیا، اور نہ ہی کسی خاص حیرت یا تجھب کا اظہار کیا۔

اس کے علاوہ یہ کہ سالہا سال سے مدینہ میں ان کی کیفیت یہ چلی آ رہی تھی کہ یہ باہم جنگ و جدال میں مشغول تھے، ایک دوسرے کے خلاف برس پیکار تھے، اوس و خزر ج کے مابین تباہ کن جنگوں کے اس لامتناہی سلسلے نے انہیں بر باد کر کھا تھا، اپنے تما مترو سائل جنگ کی آگ میں جھونک دینے کے باعث معاشری طور پر یہ کنگال ہو چکے تھے، اور پر سے یہودی انہیں وقاوٰ قاستے مزید بڑی خطیر رقم بطور قرض دیتے، اور پھر سودہ کا سلسلہ چلتا رہتا، جس کی وجہ سے یہ مزید کنگال..... جبکہ یہودی مزید خوشحال ہوتے چلے جاتے اگر کبھی اوس و خزر ج میں صلح کے امکانات نظر آنے لگتے تو یہ یہودی اپنی عیاری و مکاری اور خفیہ سازشوں کے ذریعے فتنے کی اس آگ کو دوبارہ بھڑکا دیتے۔

یہ ایسی خوفناک صورتِ حال تھی کہ جس کی وجہ سے مدینہ کے یہ عرب قبائل انتہائی اضطراب اور بے چینی میں بیتلاتھے، لڑتے لڑتے اب وہ تنگ آچکے تھے، اور ان کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح اس خوفناک جنگ سے اب انہیں نجات نصیب ہو سکے کہ جس نے انہیں تباہ و بر باد کر کے رکھ دیا ہے.....!

یہی وجہ تھی کہ ایسی پریشان کن صورتِ حال میں جب انہوں نے حج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی زبانی دین اسلام کے بارے میں سنا..... تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے، اور باہم

سرگوشیاں کرنے لگے کہ ”هم تو پہلے ہی بری طرح بر باد ہیں..... اگر یہود کو رسول اللہ ﷺ کے ظہور کی خبر ہوگئی تو پھر ایسا نہ کہ وہ ہم سے پہلے ہی مسلمان ہو جائیں، اور یوں آپ ﷺ کو وہ اپنے ساتھ ملا لیں..... اگر ایسا ہوا تو اس کا یقینی نتیجہ یہ ہو گا کہ ہماری تباہی و بر بادی کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہو جائے گا..... جبکہ اگر یہود سے قبل ہم مسلمان ہو جائیں، تو شاید اس طرح اس دینِ برحق کی برکت سے ہمیں باہم قتل و خوزریزی کے اس عذاب سے نجات نصیب ہو جائے اور ہمارے حالات دوبارہ سدھ رجائیں۔

چنانچہ وہ کچھ دیر آپس میں اسی بارے میں تبادلہ خیال اور سرگوشیاں کرتے رہے..... اور پھر جلد ہی باہمی صلاح و مشورے کے اس سلسلے کے بعد انہوں نے قبولِ اسلام کیلئے اپنی آمادگی کا اظہار کیا، اور رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کرتے ہوئے مشرف بالسلام ہو گئے۔

اور یوں مناسکِ حج سے فراغت کے بعد یہ چھ افراد پہلی بار ”توحید“ کا نور اپنے ہمراہ لئے ہوئے مکہ سے مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

بیعتِ عقبہ اولیٰ:

دوسرے سال یعنی نبوت کے بارہویں سال موسمِ حج کے موقع پر مدینہ سے جاجن ج بیت اللہ کا جو قافلہ آیا، اس میں بارہ افراد ایسے تھے جنہوں نے مکہ میں رسول اللہ ﷺ سے خفیہ ملاقات کا منصوبہ بنارکھا تھا، ان میں سے پانچ افراد انہی چھ میں سے ہی تھے جن کی گذشتہ سال آپؐ سے ملاقات ہوئی تھی اور بت وہ آپؐ کی دعوت پر بلیک کہتے ہوئے مشرف بالسلام ہو گئے تھے، جبکہ ان کے علاوہ سات نئے افراد تھے، یوں ان کی کل تعداد بارہ تھی۔

ایام حج کے دوران پہلے سے طشدہ منصوبے کے مطابق ایک اندھیری رات میں منی میں عقبہ کے مقام پر انہوں نے رسول ﷺ سے ملاقات کی اور آپؐ کے دست مبارک پر بیعت کی، ایام حج کے بعد یہ لوگ واپس مدینہ چلے گئے، روانگی سے قبل انہوں نے رسول ﷺ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان کی دینی تعلیم و تربیت کی غرض سے مسلمانوں میں سے اگر کوئی ان کے ہمراہ مدینہ جائے تو بہت اچھی بات ہوگی..... اس پر آپ ﷺ نے نوجوان صحابی حضرت مصعب بن عسیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ہمراہ روانہ فرما دیا۔ جو کہ آپؐ کے پہلے سفیر کی حیثیت سے نیز پہلے معلم کے طور پر مدینہ پہنچے، اور پھر ان کی مسلسل جدو جہد اور سعی پیغمبر کے نتیجے میں بہت جلد وہاں مدینہ کے ہر گھر میں اور ہر گلگی کوچے میں دینِ اسلام اور پیغمبر اسلام کا چرچا ہونے لگا..... گھر گھر تو حید کی شمع روشن ہونے لگی، اور یوں مدینہ شہر "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" کے نور سے جگمگا نے لگا۔

بیعت عقبہ ثانیہ:

اگلے ہی سال یعنی نبوت کے تیر ہویں سال مدینہ سے آئے ہوئے حاج بیت اللہ کے درمیان پچھترائیسے افراد تھے (۱) جنہوں نے اپنی آمد سے قبل ہی رسول ﷺ کے ساتھ منی میں خفیہ ملاقات طے کر کری تھی، اور یہ پیغام بھی بھجوایا تھا کہ اب آپؐ مکہ چھوڑ کر ہمارے پاس مدینہ تشریف لے آئیے۔

چنانچہ ایک اندھیری رات جب آپ ﷺ طشدہ منصوبے کے مطابق عقبہ میں ان سے ملاقات کی غرض سے مکہ سے منی کی طرف روانہ ہونے لگئے تو آپ ﷺ کے چچا حضرت

(۱) ۳۷ مرداور دعورتیں؛ نسیہ بنت کعب اور اسماء بنت عمرو۔

عباسؑ نے ساتھ جانے پر اصرار کیا، حالانکہ وہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اپنے پرانے دین پر ہی قائم تھے، لیکن اپنے بھتیجے (یعنی رسول اللہ ﷺ) کے ساتھ محبت و شفقت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اس بات کو گوار نہیں کیا کہ اس قدر رخڑھے مولیٰ لیتے ہوئے ان کا بھتیجہ تہاواہاں جائے..... ایک توراستے میں قدم قدم پر مشرکین مکہ کی طرف سے خطرہ..... اور اس کے علاوہ مزید یہ کہ انہیں کچھ اندازہ ہو چکا تھا کہ اس ملاقات میں آپؐ شاید اب مستقل طور پر مکہ سے مدینہ منتقل ہو جانے کے بارے میں ان لوگوں کے ساتھ کچھ گفت و شنید کریں گے اور اس سلسلے میں کچھ اہم معاملات طے کئے جائیں گے.....!

چونکہ یہ انہائی نازک معاملہ تھا..... لہذا حضرت عباسؑ کی یہ خواہش تھی کہ اس اہم اور حساس ترین معاملے پر گفت و شنید کے موقع پر وہ بھی موجود ہوں اور فریقین کے مابین اس بارے میں جو کچھ بھی طے ہو وہ ان کی موجودگی میں ہو، تاکہ ان کا پیارا بھتیجہ کسی مشکل میں نہ پھنس جائے.....!

اپنے چچا کے اصرار کو دیکھتے ہوئے آپؐ انہیں ہمراہ لے جانے پر آمادہ ہو گئے، اور یوں یہ دونوں حضرات اندر ہیری رات میں..... چھپتے چھپاتے..... مکہ سے منی جا پہنچے، جہاں مدینہ سے آئے ہوئے ان افراد کے ساتھ ملاقات ہوئی اور گفت و شنید کا آغاز ہوا۔

اس موقع پر ان افراد نے آپؐ کے دست مبارک پر قبولِ اسلام کی بیعت کی، اور اس کے بعد آپؐ کو مستقل طور پر مدینہ چلے آنے کی باقاعدہ دعوت دی.....!

یہی وہ اہم ترین موقع تھا جس کی زناکت کے پیش نظر آپؐ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ ساتھ چلنے پر مصروف تھے، چنانچہ اس مرحلے پر دونوں طرف سے خوب قول و فرار کا سلسلہ ہوا اور تکلف کو ایک جانب رکھتے ہوئے خوب صاف صاف بتیں ہوئیں..... تاکہ فریقین میں

سے کسی کے ذہن میں کوئی ابہام یا کوئی اندریشہ باقی نہ رہے۔

دورانِ گفتگو ایک موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر تم ہمارے بھتیجے کو اپنے شہر چلے آنے کی دعوت دینے کے بعد پھر وہاں خاطر خواہ طریقے سے ان کی حفاظت نہ کر سکے..... تو..... بہتر ہو گا کہ ابھی سے بتا دو..... کیونکہ ہم ان کی حفاظت کرتے چلے آئے ہیں..... اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے..... !!

اس پر مدینہ کے ان باشندوں نے کہا کہ اللہ کی قسم ہم زندگی بھر خود اپنی جان و مال، اپنی عزت و آبرو، نیز اپنے اہل و عیال سے بڑھ کر رسول ﷺ کی حفاظت کریں گے، اور اس مقصد کیلئے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

تب اس موقع پر انہی میں سے ایک شخص مزید یوں گویا ہوا: ”ہماری اس ملاقات میں جب صاف گوئی اس حد تک پہنچ چکی ہے تو پھر میں بھی ایک اندریشہ کا اظہار کرہی دوں..... کہ مختلف عرب قبائل کے ساتھ ہمارے مختلف قسم کے معاهدات ہیں، نیز خود مدینہ شہر کے اندر موجود یہود کے ساتھ کئے گئے ہمارے معاهدات کا ایک سلسلہ چلا آ رہا ہے..... لیکن اب ہمارے قبولِ اسلام اور پھر آپؐ کے ساتھ اس معاهدے کے بعد وہ تمام معاهدات کا عدم تصور کئے جائیں گے..... اور یوں اے اللہ کے رسول! آپ کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے اور آپ کو اپنے شہر میں پناہ دینے کی وجہ سے گویا ہم پورے عرب میں تہارہ جائیں گے..... ہمیں قریشؓ مکہ و دیگر تمام عرب قبائل کی دشمنی..... حتیٰ کہ خود اپنے شہر مدینہ کے اندر موجود قبائل یہود کی دشمنی و مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا..... اور آئندہ چل کر جب اللہ کی طرف سے آپ کو فتح و نصرت اور غلبہ عطا کیا جائے گا، تب اگر آپ اپنے شہر مکہ کی محبت، نیزاپی قوم کے ساتھ فطری محبت و کشش کی وجہ سے ہمیں چھوڑ کرو اپس مکہ چلے آئے.....

تب ہم تجھنور میں تن تھارہ جائیں گے..... اور تب ہمارا کیا بنے گا.....؟؟؟
رسول ﷺ نے اس شخص کی یہ گفتگو نہایت توجہ اور تحمل سے سنی، اور پھر ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے یہ یادگار الفاظ ارشاد فرمائے: ”میرا جینا اور میرا مرنا اب صرف تھارے ساتھ ہی ہوگا۔“

اور یوں اس موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں مدینہ کے ان باشندوں نے رسول ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ یہ یادگار بیعت تاریخ میں ہمیشہ کیلئے ”بیعت عقبہ ثانیہ“ کے نام سے مشہور ہو گئی۔

☆ بیعت عقبہ ”اولیٰ“ اور ”ثانیہ“ میں فرق یہ تھا کہ پہلی بیعت کے موقع پر صرف ان چیزوں کی بیعت لی گئی تھی کہ جن کا تعلق ”عقیدہ و ایمان“ اور ”اخلاقیات“ سے تھا، مثلاً یہ کہ ”اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرا سکیں گے..... چوری نہیں کریں گے..... زنا سے بچتے رہیں گے.....“ وغیرہ۔

جبکہ دوسرا بیعت کے موقع پر ان مذکورہ باتوں کے علاوہ مزید اس چیز کی بیعت بھی لی گئی تھی کہ رسول ﷺ کی مدینہ منتقلی کی صورت میں آپ کی حفاظت اور آپ کی طرف سے مدافعت و حمایت کی خاطروہ کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے..... بڑی سے بڑی جنگ لڑنے..... اور سرحد کی بازی لگادیں کیلئے ہمہ وقت مستعد و آمادہ رہیں گے..... آپ کی حفاظت کی خاطر تن، من، دھن سب ہی کچھ قربان کر دیں گے۔

یا اس حقیقت کو یوں سمجھ لیا جائے کہ پہلی بیعت کے موقع پر بیعت کے الفاظ بعینہ وہی تھے جو کہ ”بیعت النساء“ کے نام سے معروف ہیں اور جن کا تذکرہ سورہ المتحمہ کی اس آیت میں ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَأِ يَعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكَنَ﴾

بِاللَّهِ شَيْئًا وَ لَا يَسْرِقَنَ وَ لَا يَزْنِيْنَ وَ لَا يَقْتُلَنَ أَوْلَادَهُنَ وَ لَا يَأْتِيْنَ
بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِيْنَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَ وَ أَرْجُلِهِنَ وَ لَا يَعْصِيْنَكَ فِي مَعْرُوفٍ
فِي بَيْعِهِنَ وَ اسْتَغْفِرَلَهُنَ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱)

مقصد یہ کہ آپ ﷺ عورتوں سے جب کبھی بیعت لیا کرتے تو اس وقت الفاظ یہی ہوا کرتے تھے جو اس آیت میں مذکور ہیں، اور جتن کا تعلق فقط عقیدہ و ایمان اور اخلاقیات سے ہے، دینِ اسلام یا پیغمبر اسلام کی حفاظت کی خاطر جنگ یا قتال کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

جبکہ دوسری بیعت کے موقع پر دینِ اسلام نیز پیغمبر اسلام کی حفاظت کی خاطر ہر قسم کی جنگ لڑنے یا قربانی دینے کی بیعت بھی لی گئی۔ کیونکہ بدی ہوئی صورتِ حال میں اب وقت کا تقاضا یہی تھا۔



(۱) سورۃ المتحنۃ آیت: ۱۲۔

الحمد للہ آج تاریخ ۲/ ذوالقعدہ ۱۴۳۳ھ، مطابق ۲۰ نومبر ۲۰۱۲ء بروز جمعرات یہ بابِ مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبَّ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ

ہجرت مدینہ

نبوت کے تیرہویں سال حج کے مہینے میں ”بیعت عقبہ ثانیہ“ کے کچھ عرصے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے جانشیار حجاج کرام رضوان اللہ علیہم جمعین کو مکہ سے نئی منزل یعنی مدینہ کی جانب ہجرت کا حکم دیا، اور تقریباً دو ماہ کے اندر اندر تمام صحابہ کرام ہجرت کر گئے، اور مکہ میں صرف اکاڈ کا مجبور و مجبوس افراد ہی باقی رہ گئے۔

وطن کی سر زمین میں یقیناً بڑی کشش ہوتی ہے اور وطن کی محبت بہت مضبوط ہوا کرتی ہے..... مگر اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مقابلے میں ہر کشش، ہر تعلق، اور ہر محبت بیچ ہے۔ رسول ﷺ کے جانشیار حجاج کرام کا یہی عقیدہ و ایمان تھا..... اسی کے مطابق ان کا عمل بھی تھا..... اور یہی ان کا کردار بھی تھا.....!

چنانچہ رسول ﷺ کی طرف سے ہجرت کے اس حکم کی تعمیل میں وہ اپنا وطن، اپنا شہر، اپنی سر زمین، اپنا مال و اسباب، اپنا کار و بار، اپنا گھر بار، اپنی زمیں جائیداد..... سبھی کچھ چھوڑ کر..... خالی ہاتھ روانہ ہو گئے..... اور اس مقصد کیلئے انہوں نے ایسی تکلیفیں اور صعوبتیں خنده پیشانی سے برداشت کیں کہ جن کے تصور سے ہی رو نگئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہجرت کا حکم آنے کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے کیفیت یہ ہوئی کہ مکہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا، صرف چند مجبور و مجبوس قسم کے افراد ہی رہ گئے، اس کے علاوہ خود رسول ﷺ نیز حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ابھی تک مکہ میں تھے، کیونکہ ان دونوں حضرات کوتا ہنوز خود رسول ﷺ نے روانگی سے روک رکھا تھا۔

اس دوران حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے متعدد بار رسول ﷺ سے ہجرت کی

اجازت مانگی تھی، لیکن ہر بار آپ گئی طرف سے جواب یہ ملا تھا کہ: یا ابابر! لا تَعْجَلْ
لَعْلَ اللَّهُ يَجْعَلْ لَكَ صَاحِبَا..... یعنی ”اے ابو بکر! جلدی نہ کرو، شاید اللہ تمہارے
لئے کسی اچھے ہمسفر کا انتظام کر دے“۔ اور رب حضرت ابو بکرؓ کے دل میں ایک تمنا کروٹ
لیتی اور ایک آرزو جاگ اٹھتی اور وہ اس سوچ میں پڑھاتے کہ کاش میرا وہ
”اچھا ہمسفر“ خود رسول ﷺ ہی ہوں۔

انہی دنوں ایک روز مشرکین مکنے اپنا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا جس میں تمام رؤسائے
قریش سر جوڑ کر بیٹھے اس بارے میں غور و فکر اور تبادلہ خیال کرتے رہے کہ رسول ﷺ
کے ساتھ آخراب کیا سلوک کیا جائے اور اس نئے دین کی نشوشا نت کی روک تھام کیلئے
کیا فیصلہ کن اقدامات کئے جائیں؟

ان میں سے کسی نے مشورہ دیا کہ رسول ﷺ کو ہمیشہ کیلئے قید تھائی میں ڈال دیا جائے،
کسی نے کہا کہ ملک بدر کر دیا جائے۔ آخر تما متر بحث و مباحثہ کے بعد وہ اس رائے پر متفق
ہوئے کہ نعوذ باللہ آپ ﷺ کو قتل کر دیا جائے۔ جیسا کہ اس ارشادِ بانی میں اسی طرف اشارہ کیا
گیا ہے: ﴿وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ،
وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ، وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَا كِرِينَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور وہ وقت یاد
کیجھ جب کافروںگ آپ کے بارے میں تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں، یا
آپ کو قتل کر ڈالیں، یا آپ کو ملک بدر کر دیں، اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے، اور اللہ اپنی
تدبیر کر رہا تھا، اور اللہ تو بہترین تدبیر کرنے والا ہے)

ان رؤسائے قریش نے آپ ﷺ کے قتل کی مذموم و ناپاک سازش کو عملی جامہ پہنانے

کیلئے طریقہ یہ سوچا کہ مختلف قبائل سے متعدد نوجوانوں کا انتخاب کیا جائے جو کہ آج رات آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیں، اور پھر جب آپ حسب معمول رات کے آخری پھر عبادت کی غرض سے بیت اللہ کی جانب روانگی کیلئے اپنے گھر سے باہر نکلیں تو یہ سب ایک ساتھ اپنی تواروں سے حملہ کر کے آپ کو قتل کر دالیں..... اور چونکہ ان سب قاتلوں کا تعلق قبیلہ قریش کے جدا جد اخاند انوں اور مختلف شاخوں سے ہو گا، لہذا ہوشم تنہا کس کس سے لڑیں گے.....؟ اور اتنے سارے خاندانوں سے کس طرح قصاص کا مطالبہ کریں گے.....؟ اور مجبوراً اب خون بہا کے مطلبے پر ہی اکتفاء کریں گے..... چنانچہ صورت حال کے تمام پہلوؤں کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ ناپاک منصوبہ تیار کر لیا گیا، اور جلد از جلد اسی رات ہی اسے عملی جامہ پہنانے کے عزم بالجزم کے ساتھ وہ طواغیت وہاں سے رخصت ہوئے۔ دوسری جانب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ وحی رسول اللہ ﷺ کو رو سائے قریش کے اس ذموم منصوبے کے بارے میں آگاہ کر دیا گیا اور اسی رات مکہ سے ہجرت کر جانے کا حکم خداوندی لئے ہوئے جبریل امین نازل ہوئے۔

اس حکم کی تعلیل میں رسول اللہ ﷺ اُس دن خلاف معمول پتی دوپھر میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے، اور ہجرت کے اس حکم کے بارے میں انہیں مطلع فرمایا۔ اس پر ابو بکرؓ نے عرض کیا: الصُّحْبَةِ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ یعنی ”اے اللہ کے رسول اس سفر میں کیا میں آپ کے ہمراہ چلوں؟“ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: نَعَمْ، الصُّحْبَةِ يَا أَبَا بَكْرَ. یعنی: ”ہاں اے ابو بکر! اس سفر میں تم میرے ”ہمسفر“ ہو گے۔“ اور تب فرط سرست کی وجہ سے ابو بکرؓ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے..... ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے..... اور ابو بکر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے.....!!

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اُس وقت یہ تمام منظردیکھ رہی تھیں..... وہ فرماتی ہیں کہ اُس روز جب میں نے اپنے والد (ابو بکر) کو فرط مسرت کی وجہ سے روتے ہوئے دیکھا..... تو اُس وقت زندگی میں پہلی بار مجھ پر یہ حقیقت مکشف ہوئی کہ انسان جس طرح بہت زیادہ غم اور صدمے کے وقت روتا ہے..... اسی طرح بہت زیادہ خوشی کے وقت بھی روتا ہے..... انسان کی آنکھوں سے بہنے والے یہ آنسو کبھی ”غم کے آنسو“ ہوا کرتے ہیں، اور کبھی ”خوشی کے آنسو“، اس سے قبل مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔

اور پھر آپ ﷺ اپنے ”رفیق سفر“ کو چند ضروری ہدایات دینے کے بعد اپنے گھر واپس تشریف لے آئے۔

اور جب رات ہوئی، ہر طرف اندر ہمراجھا گیا، تب روسائے قریش کی طرف سے مقرر کردہ مسلح نوجوانوں کا ایک چاق و چوبنڈستہ وہاں آپنچا، اور آتے ہی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کر لیا، تاکہ آپ حسب معمول جب رات کے آخری پھر عبادت کی غرض سے بیت اللہ کی جانب روانگی کیلئے گھر سے نکلیں گے تب یہ سب یکبارگی آپ پڑوٹ پڑیں گے.....!

رسول ﷺ کے پاس مشرکین مکہ کی بہت سی امانتیں تھیں، اس رات آپ نے وہ تمام امانتیں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتے ہوئے انہیں تاکید فرمائی کہ ”میری روانگی کے بعد یہ تمام امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچادیں، اور اس کے بعد مکہ سے ہجرت کرنا۔“

اس کے بعد رسول ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ”اے علی! آج رات تم

میرے بستر پر سوجاً اور میری چادر اوڑھو۔

اُس رات رسول ﷺ کے بستر پر سونا یقیناً موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، یا یوں سمجھ لیا جائے کہ اُس رات آپؐ کے بستر پر سونا گویا خودشی کرنا تھا..... لیکن حضرت علیؓ بلا چون وچرا آپؐ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً ہی آپؐ کے بستر پر لیٹ گئے اور آپؐ کی چادر اوڑھ لی، یقیناً نوجوانی میں یوں بغیر کسی ادنیٰ تأمل یا تردود کے اللہ اور رسول ﷺ کے کسی بھی حکم کی تعمیل کی خاطر اپنی جان تک کی بازی لگادینے کیلئے ہم وقت مستعد اور تیار رہنا..... یہی وہ بے مثال ایمانی جذبہ تھا کہ جس کی عکاسی اُس موقع پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل سے ہوتی ہے..... حالانکہ اُس وقت وہ بالکل نو عمر تھے، یقیناً اس سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بڑی فضیلت و منقبت ثابت ہوتی ہے۔

اس کے بعد رسول ﷺ رات کے آخری پھر قرآن کریم کی آیت: ﴿وَ جَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدَّاً وَ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدَّاً فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبَصِّرُونَ﴾ (۱) پڑھتے ہوئے اپنے گھر سے باہر تشریف لائے، اپنی مٹھی میں کچھ خاک لی، اور پھونک مار کر اسے ان مسلح نوجوانوں کی جانب اڑا دیا، اور نہایت اطمینان کے ساتھ ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے..... لیکن نہ تو انہیں کچھ نظر آیا..... اور نہ ہی انہیں کچھ علم ہو سکا..... اور وہ رات بھر اس اطمینان کے ساتھ وہاں پھرہ دیتے رہے کہ رسول ﷺ اندر اپنے گھر میں موجود ہیں..... !!

رسول ﷺ اُس رات اپنے گھر سے روانگی کے بعد سیدھے اس شخص کے گھر پہنچ کر جس

(۱) سورۃ یس [۹]

پر اس وقت آپ ﷺ کو سب سے زیادہ بھروسہ تھا، یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، اور پھر فرائی وہ دونوں رات کی تاریکی میں گھر کے عقبی دروازے سے نکل کر ایک نئی منزل کی جانب روانہ ہو گئے..... مدینہ منورہ کمک مردم سے شمال کی جانب واقع تھا، لیکن یہ دونوں حضرات بالکل مخالف سمت میں یعنی جنوب کی طرف چل دیئے، رات کے اندر ہیرے میں دشوار گزار پہاڑی راستوں پر کہ جہاں ہر طرف نوکیلے سنگ ریزوں کی بھرمار تھی..... دونوں مسلسل پاپیدہ چلتے رہے.....، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کبھی رسول ﷺ کے آگے چلتے..... کبھی پیچھے..... کبھی دائیں..... اور کبھی بائیں..... یوں وہ بار بار اپنی جگہ تبدیل کرتے..... گویا بڑی بے چینی میں مبتلا ہوں..... آپؐ نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو دریافت فرمایا کہ اے ابو بکر! کیا بات ہے.....؟ اس پر ابو بکرؓ نے جواب دیا کہ ”اے اللہ کے رسول! کبھی مجھے یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی دشمن سامنے کہیں چھپا بیٹھا ہو اور وہ اچانک سامنے سے ظاہر ہو کر آپؐ کو کوئی نقصان پہنچائے، اس لئے میں آپؐ کے آگے چلنے لگتا ہوں..... اور پھر یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی تعاقب کرنے والا کہیں پیچھے سے اچانک آجائے، یہ سوچ کر میں آپؐ کے پیچھے آ جاتا ہوں..... پھر یہ فکر ستانے لگتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دائیں یا بائیں کوئی دشمن کہیں گھات لگائے بیٹھا ہو، اس لئے میں کبھی آپؐ کے دائیں چلنے لگتا ہوں اور کبھی آپؐ کے بائیں..... !!

اسی کیفیت میں یہ دونوں حضرات مسلسل چلتے رہے..... یہاں تک کہ تقریباً پانچ میل (یعنی تقریباً آٹھ کلومیٹر) کی مسافت پیدل طے کرنے کے بعد ایک انتہائی بلند و بالا پہاڑ کے دامن میں پہنچ، اور انتہائی کٹھن اور مشکل ترین راستے طے کرتے ہوئے اس کی چوٹی پر واقع ایک غار کے سامنے جا پہنچ جو کہ ”غارِ ثور“ کے نام سے معروف ہے۔

اس غار کے دہانے پر پہنچنے کے بعد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ سیہیں توقف فرمائیے، پہلے میں اکیلا اندر جا کر غار کا جائزہ لے لوں کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلے سے ہی یہاں کوئی دشمن چھپا بیٹھا ہو..... چنانچہ ابو بکر رضی اللہ عنہ تہاں اندر گئے، اچھی طرح جائزہ لیا، اور خوب صفائی وغیرہ بھی کی، ادھر ادھر چند چھوٹے بڑے سوراخ نظر آئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ لاحق ہوا کہ کہیں ان سوراخوں میں کوئی موذی جانور نہ ہو، کہ جو رسول ﷺ کیلئے تکلیف واذیت کا باعث بن جائے یہ سوچ کر انہوں نے اپنے لباس سے کچھ کپڑا پھاڑ کر اس کے ذریعے ان سوراخوں کو بند کر دیا، اور پھر باہر آ کر رسول ﷺ کی خدمت میں گذارش کی کہ یا رسول اللہ! اب آپ اندر تشریف لے آئیے جس پر آپ ﷺ غار کے اندر تشریف لے آئے، اور اس کے بعد یہ دونوں حضرات اس غار میں تین دن مقیم رہے۔

دوسری طرف مکہ میں وہ مسلح نوجوان رات بھر مسلسل رسول ﷺ کے گھر کا محاصرہ کئے کھڑے رہے، اس دوران کبھی کبھی وہ کسی سوراخ سے اندر جھانک بھی لیتے اور مطمئن ہو جاتے کہ رسول ﷺ بدستور اندر گھر میں موجود ہیں اور اپنے بستر پر سو رہے ہیں!

لیکن صبح ہونے پر جب اس بستر سے رسول ﷺ کی بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ نمودار ہوئے تو ان مشرکین کی خفت و شرمساری اور چھنجھلاہٹ کی انتہاء نہ رہی، انتہائی شرمندی و افسردگی کے عالم میں سر جھکائے اور منہ لٹکائے ہوئے وہاں سے چل دیئے، اور جا کر اپنے سرداروں کو اس صورتِ حال سے مطلع کیا، جس پر وہ سب طیش میں آگئے اور انتہائی غیظ و غضب، نیز حیرت و پریشانی کی اس ملی جملی کیفیت میں ایک دوسرا کامنہ تکنے لگے!

اور پھر وہ سب رسول ﷺ کے گھر پہنچ، وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جا پکڑا خوب

تحقیق و تفییش کی گئی..... حتیٰ کہ انہیں زد کوب بھی کیا گیا..... لیکن یہ سب کچھ بے سود اور لا حاصل ہی رہا، ان سے کوئی مفید معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

آخر ان رو سائے قریش کا سر غنہ ابو جہل اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا کہ ”اب سب سے پہلے ابو بکر کے گھر کی تلاشی لی جائے“، چنانچہ وہ سب نہایت سرگرمی و تیزی کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے، دروازے پر دستک دی، جس پر اندر سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ تمودار ہوئیں، ان کے آتے ہی ابو جہل نے نہایت کرخت اور تند و تیز لمحے میں پوچھا کہ ”لڑکی! تمہارا باپ کہاں ہے؟“ حضرت اسماءؓ نے جواب دیا کہ ”مجھے نہیں معلوم“، ابو جہل نے اصرار کرتے ہوئے بار بار اپنا سوال دہرایا..... اور ہر بار حضرت اسماءؓ کی طرف سے وہی جواب ملا.....

تب ابو جہل کہنے لگا کہ ”محمد بھی غائب..... اور..... ابو بکر بھی غائب..... مطلب صاف ظاہر ہے..... یعنی وہ دونوں اب ہمارے چنگل سے نکل چکے ہیں.....“ اورتب اس نے اپنے ساتھیوں کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا..... اور جاتے جاتے طیش میں آ کر اس بدجنت نے حضرت اسماءؓ کے چہرے پر اس قدر زور سے ٹھپٹھپ مارا کہ ان کے کان سے بائی اڑ کر دور جا گری.....!

اس کے بعد تمام شہر مکہ میں نہایت سرگرمی کے ساتھ ان دونوں حضرات کی تلاش شروع کر دی گئی، ان کے تعاقب میں مختلف اطراف میں متعدد دستے روانہ کئے گئے، تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے، ہر طرف ناکہ بندی کر دی گئی، چپے چپے پرسراغ رسائیں پھیل گئے.....!

جب کچھ حاصل نہ ہوا تو آخر اعلان عام کیا گیا کہ ”جو کوئی ان دونوں کو زندہ یا مردہ پکڑ کر لا بیگا

یا ان کے بارے میں کوئی منید اطلاع دے گا..... اسے سوانح بطور انعام پیش کئے جائیں گے.....“

ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا انعام تھا، کیونکہ اس معاشرے میں ان کیلئے اونٹ بہت بڑی چیز تھی، کہ اس پر وہ سواری بھی کیا کرتے تھے، نقل و حمل اور بار برداری کا وسیلہ بھی یہی تھا، اس کا گوشت بھی کھایا جاتا تھا..... غرضیکہ ان کیلئے اونٹ ہی سمجھی کچھ تھا..... ایسے میں اگر کسی کو مفت میں بیٹھے بٹھائے ایک دونوںیں یادوں بیس نہیں بلکہ پورے سوانح مل جاتے تو یقیناً اس کی تو نسلیں سنورجا تیں!

چنانچہ اس انعام کے اعلان کو سننے کے بعد تو وہاں ہر کوئی دیوانہ ہی ہو گیا..... راتوں کی نیند اور دن کا چین سکون جاتا رہا..... اب ہر کوئی اپنے تمام کام کا ج چھوڑ چھاڑ کر..... بس ان دونوں کی تلاش میں ہی سرگردان ہو گیا۔

آخر ایک روز یہ لوگ تعاقب کرتے کرتے اُس غار کے دہانے پر جا پہنچ کر جس میں وہ دونوں حضرات پناہ لئے ہوئے تھے، حتیٰ کہ ان کی آوازیں اور ان کی باہمی گفتگو غار کے اندر سنائی دینے لگی۔

اس قدر نازک ترین صورتِ حال کی وجہ سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر بیشان ہو گئے، اور عرض کیا کہ ”اے اللہ کے رسول! مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے، البتہ مجھے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ کہیں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، اس لئے کہ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو پھر پوری امت کا کیا بنے گا.....؟“ یعنی یہ تو پوری امت کا خسارہ ہو گا۔

تب آپ ﷺ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: مَا ظَنْكَ يَا أَبَا بَكْرٍ بِإِثْنَيْنِ، اللَّهُ ثَالِثُهُمَا؟ یعنی ”اے ابو بکر! ایسے دو انسان کہ جن کے ساتھ تیسرا خود اللہ ہو، ان کے

بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟“ مقصد یہ کہ محض دونیں ہیں، بلکہ ہمارے ساتھ اللہ کی معیت و نصرت بھی شامل حال ہے، لہذا فکر کی کوئی بات نہیں۔

اسی واقعے کی طرف قرآن کریم میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے: ﴿إِلَّا تَنْصُرُوا فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذَا أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْرَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَّا﴾ (۱) ترجمہ: (اگر تم ان (نبی ﷺ) کی مد نہیں کرو گے تو اللہ نے ہی ان کی مدد کی اُس وقت جبکہ انہیں کافروں نے نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے، جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے)

اُس غار کی بیت کچھ ایسی تھی کہ اس کا دہانہ نیچے تھا، جبکہ دہانے کے بعد اندر فوراً ہی کچھ بلندی تھی، یعنی غار کے اندر کا منظر دیکھنے کیلئے ضروری تھا کہ نیچے جھک کر یا بیٹھ کر اندر اوپر کی جانب جھانا کا جائے، جھکے بغیر اندر کا منظر دیکھنا ممکن نہیں تھا، جبکہ اندر بیٹھے ہوئے ان دونوں حضرات کو باہر کھڑے ہوئے ان افراد کے پاؤں نظر آ رہے تھے۔

اللہ کی شان ملاحظہ ہو کہ یہ تعاقب کرنے والے دشمن شب و روز ہر جگہ مارے مارے پھر رہے تھے، چپے چپے انہوں نے چھان مارا تھا، حتیٰ کہ تعاقب کرتے ہوئے اس پہاڑ پر اتنی بلندی تک بھی آ گئے..... اس غار کے دہانے تک بھی آ پہنچے..... لیکن انہیں اتنی توفیق نہ ہو سکی کہ ذرہ جھک کر اندر جھا بک ہی لیں..... یقیناً اُس وقت ان سے اس توفیق کا سلب کر لیا جانا اللہ ہی کے حکم سے تھا۔

رسول ﷺ اور آپؐ کے مسفر یعنی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں تین دن تین رات

مسلسل اس غار میں مقیم رہے، اس دوران حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے عبداللہ بن بھر کہ میں گھوم پھر کر صورتِ حال کا جائزہ لیتے..... روسائے قریش کی گفتگو سنتے..... اور رات کی تاریکی میں وہاں جا کر ان دونوں حضرات کو صورتِ حال سے مطلع کرتے تاکہ اس صورتِ حال کے مطابق کوئی اگلا قدم اٹھایا جائے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ایک غلام، جس کا نام عامر بن فہیر تھا وہ علی الصباح اس راستے پر بکریاں چراتا تاکہ عبداللہ بن ابی بکرؓ کے قدموں کے نشانات مٹ جائیں، نیز اس دوران مناسب موقع پا کر وہ اس غارتک بھی جا پہنچتا، اور ان دونوں حضرات کو بکریوں کا دودھ بھی پیش کیا کرتا۔

اس طرح اس غار میں جب تین دن گذر گئے اور ان کی تلاش، تعاقب، اور بھاگ دوڑ کے اس سلسلے میں کچھ کی آئی..... تب وہاں سے روانگی کی غرض سے یہ دونوں حضرات غار سے باہر تشریف لائے۔

چونکہ حفاظتی اقدام کے طور پر طے یہ پایا تھا کہ مکہ سے مدینہ سفر کیلئے عام راستہ اختیار کرنے کی بجائے کوئی ایسا غیر معروف اور گمنام راستہ اختیار کیا جائے گا جو کہ نسبہ ویران اور غیر آباد ہو، جہاں مسافروں کی آمد و رفت اور نقل و حرکت بہت کم ہوتی ہو..... لہذا غارِ ثور سے روانگی کے موقع پر پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق عبداللہ بن اُریقط نامی ”رہبر“ بھی وہاں آپنچا، جس کی خدمات اسی مقصد کیلئے حاصل کی گئی تھیں، جو کہ قابل بھروسہ بھی تھا، نیز یہ کہ ویران اور خفیہ راستوں سے خوب واقف بھی تھا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کافی پہلے سے ہی اس سفر کیلئے دو اونٹیاں تیار کر کر چکیں، اور شک سے بچنے کیلئے انہیں اپنے پاس رکھنے کی مجاہے اس ”رہبر“ کے حوالے کر

رکھا تھا۔ چنانچہ اس غار سے نکل کر جب آگے روائی کام مرحلہ آیا تو، پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق یہ رہبر وہاں آمد کے موقع پر یہ دونوں اونٹیاں بھی ہمراہ لایا۔

عظمیم خاتون: ☆

جب یہ دونوں حضرات اونٹیوں پر سوار ہو چکے تو عین موقع پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بھی کھانا لئے ہوئے وہاں پہنچیں، جو کہ انہوں نے بڑے ہی شوق اور اہتمام کے ساتھ ان دونوں حضرات کیلئے ”زادراہ“ کے طور پر تیار کیا تھا۔

اُس زمانے میں اونٹ پر جو گدی ہوا کرتی تھی جس پر سوار ہیٹھتا تھا، سوار کسی رسی کے ذریعے اپنا کچھ مختصر سامان بھی اسی گدی کے ساتھ لٹکادیا کرتا تھا، اُس روز اسماءؓ جب یہ کھانا لا لیں تو اب اس برتن کو اونٹ پر رکھی ہوئی اس گدی کے ساتھ لٹکانے کیلئے کوئی رسی وہاں دستیاب نہیں تھی، تب اسماءؓ نے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر دو حصوں میں تقسیم کیا، ایک حصے کو مل دے کر اس سے رسی تیار کی، اور پھر اس سے کھانے کے اُس برتن کو اونٹ پر رکھی ہوئی گدی کے ساتھ لٹکا دیا..... اسی واقعے کی نسبت سے اسماءؓ تاریخ میں ہمیشہ کیلئے ”ذات الطالقین“ یعنی ”اپنے دوپٹے کے دو حصے کر دینے والی“ کے لقب سے مشہور ہو گئیں۔ (۱)

اس کے بعد حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے بھیگی پلکوں کے ساتھ ان دونوں حضرات کو رخصت کیا..... اور تب ان کے دل میں اندیشوں اور سوسوں کا ایک طوفان برپا ہونے لگا کہ نہ جانے..... اللہ کے رسول ﷺ اور ان کے ہمراہ میرے پیارے باباجان.....

(۱) بعض کتب تاریخ میں دوپٹے کی بجائے اس پلکے کا تذکرہ ہے جو کہ اُس دور میں عورتیں عموماً اپنی کمر کے گرد باندھا کرتی تھیں، تاکہ کام کا ج کرتے وقت بابس ادھر ادھر اڑنے اور کام کا ج میں رکاوٹ بننے کی بجائے ایک جگہ کارہے۔ اسماءؓ نے اپنے اس پلکے کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ واللہ اعلم۔

نہ جانے یہ دونوں حضرات اپنی منزل تک پہنچ بھی پائیں گے..... یا خدا خواستہ.....؟ اور پھر اسی کیفیت میں..... انہی اندیشوں اور وسوسوں کا ایک طوفان دل میں لئے ہوئے وہ وہاں سے واپس چل دیں..... کیمہ و تنہا.....

اس نازک ترین موقع پر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا یہ تاریخی کردار..... عورت ہونے کے باوجود..... کمزور و ناتوان مخلوق ہونے کے باوجود..... اس قدر خطرات مول لے کر..... کہ جہاں قدم قدم پر دشمنوں، سراغ رسانوں، اور کھوجیوں کا جال بچھا ہوا تھا..... اور پھر اس قدر دشوار گزار اور انتہائی خطرناک پہاڑی راستے..... کہ جہاں قدم قدم پر موت گھات لگائے بیٹھی تھی..... ان تمام مشکلات کے باوجود داس نازک ترین موقع پر اس خاتون کا یوں تن تنہا..... پیدل سفر کرتے ہوئے..... اور موت سے آنکھیں ملاتے ہوئے..... وہاں چلے آنا..... محض ان دونوں حضرات کو کھانا پہنچانے کیلئے..... اور اس تاریخی اور خطرناک سفر پر ان حضرات کی روائی کے وقت..... اپنی بھیگی پلکوں کے ساتھ..... انہیں رخصت کرنے کیلئے..... اور کپکپاتے ہوئوں کے ساتھ..... انہیں سلامتی کی دعا دینے کیلئے..... یقیناً اس سے اس خاتون کی عظمت ظاہر ہوتی ہے..... (۱)

(۱) یہاں یہ ذکر ہے بھی ہو جائے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے والد بھی صحابی تھے، دادا بھی، بھائی بھی، شوہر بھی، اور بیٹا بھی (والد: ابوکبر صدیق۔ دادا: ابوتفاف۔ بھائی: عبد اللہ اور عبد الرحمن۔ شوہر: زیبر بن العوام۔ بیٹا: عبد اللہ بن زیبر، رضی اللہ عنہم، جمعیں)

جبکہ ان کی بہن نصرف یہ کہ صحابی تھیں، بلکہ ام المؤمنین بھی تھیں، یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔ ایس خانہ ہمہ آفتتاب است..... !!

غارِ ثور سے روانگی:

تین دن غار میں قیام کے بعد اب وہاں سے آگے روانگی ہوئی، اس موقع پر رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے ہمسفر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں اپنی اپنی اونٹی پر سوار تھے، ان حضرات نے اختیاطی تدبیر کے طور پر مدینہ کی جانب فوری سفر کی جائے پہلے کافی دور تک بالکل مخالف سمت میں یعنی یمن کی جانب سفر کیا، اور پھر کافی مسافت طے کرنے کے بعد اپنارخ تبدیل کر لیا، اور بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ غیر معروف اور ویران راستے پر مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

اُدھر ہر طرف نہایت زورو شور اور سرگرمی کے ساتھ تلاش کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا، انہی تلاش کرنے والوں میں سراقد بن مالک المدد الجی نامی ایک شخص بھی تھا (۱) ایک روز وہ اپنے گاؤں میں اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ بیٹھا ہوا تھا، محفل جمی ہوئی تھی، ایسے میں ان لوگوں نے دور کافی فاصلے پر دو اشخاص کو اونٹیوں پر سفر کرتے ہوئے دیکھا، تب ان میں سے کچھ لوگ چلانے لگے کہ یہ تو ضرور محمد ﷺ اور ابو بکر ہیں اور پھر ان میں سے ہر کوئی اُس بڑے انعام کے لائق میں نہایت بیتابی کے ساتھ ان دونوں کے تعاقب میں جانے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔

سراقد کو بھی مکمل یقین ہو گیا کہ یہ دونوں سواروں ہی ہیں، یعنی رسول ﷺ اور حضرت ابو بکر..... لیکن سراقد نے سوچا کہ یہ اتنا بڑا انعام میرے ہاتھ سے کیوں نکل جائے کوئی دوسرا کیوں لے اڑے یہ انعام (سو اونٹ) تب سراقد اپنے ساتھیوں کا مذاق اڑاتے

(۱) بعد میں سراقد مسلمان ہو گئے تھے۔

ہوئے انہیں یوں کہنے لگا کہ ”تم سب دیوانے ہو گئے ہو.....سو افٹوں کے لاٹھ میں تم لوگوں کا یہ حال ہو گیا ہے..... یہ محمد اور ابو بکر ہرگز نہیں ہو سکتے..... یہ تو کوئی اور لوگ ہیں، کیوں خود کو بلا وجہ ہلکان کرنا چاہتے ہو؟ آرام سے بیٹھے رہو تم سب لوگ“
لیکن خود سراقدہ کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ یہ دونوں سوار وہی حضرات ہی ہیں، اور اب اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا.....

کچھ دریوہ اسی جگہ اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھا رہا تاکہ کسی کو اس پر شک نہ ہو..... اور پھر کچھ دری بعد بہانہ بناتے ہوئے کہنے لگا کہ مجھے گھر میں ایک بہت ضروری کام پڑ گیا ہے..... یوں وہ وہاں سے اٹھا اور اپنے گھر چلا آیا، گھر پہنچتے ہی فوراً اپنے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہوا، اور گھر کے عقبی راستے سے نکل کر..... اپنے دوستوں کی نگاہوں سے پہنچا ہوا..... اپنے گھوڑے کو سر پٹ دوڑا تا ہوا..... ان دونوں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا..... اور بہت جلد ان کے اس قدر قریب جا پہنچا کہ اب اس نے انہیں پچان بھی لیا، اس موقع پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نہایت پریشانی کے عالم میں بار بار مر مر کر اس کی جانب دیکھ رہے تھے، جبکہ رسول اللہ ﷺ مسلسل آگے کی جانب دیکھتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے، اور تلاوتِ قرآن میں مشغول و منہمک تھے۔

اس انعام کے لاٹھ میں سراقدہ بن مالک جب اپنے گھوڑے کو سر پٹ دوڑا تا ہوا دواں تھا کہ اس دوران اچا بک اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ گھوڑے کی پشت سے نیچے جا گرا..... مگر وہ نہایت مستعدی اور پھرتی کے ساتھ اٹھا اور دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑے کو ایڈ لگائی..... لیکن کچھ ہی دری بعد اس کے گھوڑے نے پھر ٹھوکر کھائی..... سراقدہ دوبارہ گرا، لیکن فوراً ہی اٹھا اور پھر تعاقب میں رواں دواں ہو گیا..... البتہ اس بات پر

بہت حیرت تھی کہ اس کے گھوڑے کو مسلسل دوبار یہ ٹھوکر کس طرح لگی.....؟ اور اب تیسری بار ایسی صورت حال پیش آئی کہ جس سے اس کے ہوش و حواس ہی اڑنے لگے..... ہوا یہ کہ دوڑتے دوڑتے اپانک اس کے گھوڑے کی الگی دونوں ٹانگیں گھٹنوں تک زمین میں ڈھنس گئیں..... حالانکہ وہ کوئی ایسی نرم یا رتیلی زمین بھی نہیں تھی..... اور پھر جب اس نے نیچے اتر کر گھوڑے کو اٹھانے کی کوشش کی..... اور گھوڑا اٹھا..... اور اس کی ٹانگیں جب زمین سے نکلیں..... تو عین اس جگہ سے ایک دھواں سامنودار ہوا اور فضاء میں بند ہو کر تحلیل ہونے لگا.....!

سراقہ یہ منظر دیکھ کر انتہائی حیرت زدہ رہ گیا، اور اسے رسول اللہ ﷺ کی صداقت و حقانیت کا مکمل یقین ہو گیا، اور اب وہ بآواز بلند پاپرنے لگا: **الْأَمَانُ يَا مُحَمَّدٌ الْأَمَانُ يَا مُحَمَّدٌ لِعْنِي** "اے محمد! مجھے امان چاہئے....."

اللہ کی شان..... وہ شخص جو ابھی محض کچھ دیر قبیل تک نہایت جوش و خروش اور سرگرمی کے ساتھ تھا، میں چلا آرہا تھا..... جسے اپنی جرأت و بہادری پر ناز تھا..... اور جسے قیمتی انعام کے لائچے نے بے چین کر کھا تھا..... دیکھتے ہی دیکھتے..... اب وہی شخص مجبور..... ولاچاڑ..... خود اپنی سلامتی اور عافیت کیلئے فریاد کرنے لگا..... اور خود اپنے لئے پناہ طلب کرنے لگا..... اور وہ بھی کس سے.....؟ رسول اللہ ﷺ سے..... جو کہ اس وقت خود پناہ کی تلاش میں تھے.....؟؟

آخر اس کی اس قدر آہ و پاک پر رسول اللہ ﷺ نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا، اور قریب چلے آنے کا اشارہ فرمایا، تب وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس تعاقب پر معدرت کرنے لگا.....

رسول ﷺ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”اے سراقد، اُس وقت تمہاری کیا کیفیت ہو گی جب کسریٰ کے لگن تمہارے ہاتھوں میں ہوں گے؟“

رسول ﷺ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سن کر سراقد حیرت زدہ رہ گیا..... کہ آپؐ جو اس وقت خود پناہ کی تلاش میں ہیں بے گھر اور بے وطن ہیں کس طرح سراقد کو اتنی بڑی خوشخبری سنارہے ہیں کہ روئے زمین کی سب سے عظیم ترین قوت یعنی سلطنتِ فارس کے فرمازدا ”کسریٰ“ کے لگن سراقد کے ہاتھوں میں آنے والے ہیں؟؟؟(۱)

مزید یہ کہ اس موقع پر اس نے اظہارِ عقیدت کے طور پر اپنا سامان نیز کچھ اشیائے خور دنوں ش آپؐ کی خدمت میں پیش کیں، لیکن آپؐ نے مذدرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ”ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہاں البتہ تم اس ملاقات کو منحی رکھنا“

یعنی یہ جو ہماری تمہاری ملاقات ہوئی ہے اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا، اسے صیغہ راز میں ہی رہنے دینا۔ اس پر اس نے یہ وعدہ کیا کہ وہ کسی کو اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔

تب سراقد وہاں سے واپس روانہ ہو گیا، راستے میں اسے جہاں کہیں بھی کوئی ایسا شخص نظر آیا جو رسول ﷺ کے تعاقب میں سرگردان تھا سراقد نے اسے یوں کہا کہ ”میں آگے بہت دور تک خوب اچھی طرح تلاش کر کے آرہا ہوں یہاں ان کا کوئی نام و نشان نہیں ہے لہذا اب تمہیں آگے جانے اور خود کو بلا وجہ ہلکا ن کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے“ اور یوں وہ ہر تعاقب کرنے والے کو واپس بھیجنا گیا.....

(۱) خلیفہ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دور غلافت میں جب حضرت سعد بن ابی و قاص رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں فارس فتح ہوا اور بہت بڑی مقدار میں مال غنیمت مدینہ پہنچا جس میں کسریٰ کے لگن بھی تھے، تب حضرت عمرؓ نے سراقد کو بلوایا اور وہ لگن اس کے ہاتھ میں پہنائے۔

اللہ کی قدرت ملاحظہ ہو کہ جو شخص تھوڑی در قبل تک رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تلاش میں سرگردان تھا..... ان کا جانی دشمن اور خون کا پیاسا تھا..... اب وہی جا شارب بن کروہاں سے لوٹا..... اور اب وہی ان کا محافظ بن گیا.....

مدینہ میں آمد:

اس طویل سفر کے بعد آخر کار رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ہمسفر یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ / ربع الاول ۱۷ نبوی بروز پیر مدینہ کے مضافات میں پہنچ گئے۔ چونکہ آپ ﷺ کی مکہ سے روانگی کی بغیر مدینہ پہنچ چکی تھی اس لئے اہل مدینہ نہایت بیتابی کے ساتھ آپؐ کی آمد کے منتظر تھے، اور وہ ہر روز صحح ہوتے ہی شہر کی حدود سے باہر نکل کر آپؐ کے استقبال کیلئے وہاں کھڑے ہو جاتے..... اور آپؐ کی آمد کا نہایت بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے..... اور وہ بے چین کیوں نہ ہوتے..... کہ..... آنے والا مہمان آخر کوں تھا.....؟ وہ عزیز ترین مہمان خاتم الانبیاء سید البشر بلکہ سید الخلق ایسا مہمان جس کیلئے وہ سب اپاتخت من دھن سمجھی کچھ نجحا و کر دینے کیلئے بیقرار تھے..... وہ عظیم مہمان کہ جس کا نام نامی اور اسم گرامی ”محمد بن عبد اللہ“ تھا..... اس پیارے مہمان کا انتظار انہیں بیقرار کئے ہوئے تھا.....!!

اس دور میں کوئی ٹیلی فون یا ٹیلی گرام یا دیگر ذرائع اتصالات کا تو کوئی وجود نہیں تھا..... لہذا بس..... آنے جانے والے مسافروں سے وہ مسلسل پوچھتے رہتے کہ ”کیا کوئی سوار..... کوئی قافلہ..... کوئی مسافر..... تمہیں راستے میں نظر آیا.....؟؟“ اور پھر اسی کیفیت میں جب دھوپ تیز ہو جاتی..... تب وہ سب اپنے اپنے گھروں کی طرف واپس لوٹ جاتے۔

اُس روز بھی وہ لوگ صح سے انتظار کرتے کرتے واپس اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئے تھے، اسی دوران ایک یہودی جو کہ بھجور کے درخت پر چڑھا ہوا تھا، اس نے دور سے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آتے دیکھا، تو اس نے ان دونوں کو فوراً ہی پہچان لیا (۱) اور مدینہ کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے باؤز بلند چلانے لگا..... کہ: ”تمہارے نبی آگئے..... تمہارے نبی آگئے.....“ جس پر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک جمع غیر مراکھا ہو گیا..... بڑے چھوٹے بڑے چھوٹے جوان..... مردوں اور عورتوں کی بہت بڑی تعداد وہاں آپنی..... ہر کوئی رسول اللہ ﷺ کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے بیتاب تھا.....! رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ہمسفر یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مدینہ شہر کے اندر داخل ہونے کی بجائے ”قباء“ نامی مضافاتی بستی میں پڑا وڈا اور تین دن یہیں قیام فرمایا۔ اس دوران مسجد قباء کی بنیاد بھی رکھی گئی، جس کی فضیلت خود قرآن کریم میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: ﴿لَمَسْجِدٌ أَسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أُولَئِيَ الْأَحْقَاقِ أَن تَقُومَ فِيهِ﴾ (۲) یعنی ”وہ مسجد کہ جس کی بنیاد روزِ اول سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں“۔

اسی دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپؐ کی تاکید کے مطابق مشرکین مکہ کی امانیتیں ان

(۱) جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے : ﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَ هُمْ﴾ (ابقرۃ: ۳۶) یعنی ”وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی ہے وہ انہیں یوں پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں“۔

مقصد یہ کہ گذشتہ آسمانی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ اور آپؐ کی علامات و خصائص کا اس قدر مفصل تذکرہ ہے کہ جس کی وجہ سے اہل کتاب آپؐ گوئوب پہچانتے ہیں اور آپؐ کی صداقت و حقانیت کو خوب جانتے ہیں۔

[۱۰۸] (التوبہ)

کے حوالے کر دینے کے بعد مکہ سے سفر کرتے ہوئے ”قباء“ میں رسول اللہ ﷺ سے آملا۔

☆..... قباء سے اندر و ان مدینہ شہر کی جانب روانگی:

”قباء“ نامی اس مضافاتی بستی میں تین دن قیام کے بعد دونوں حضرات اندر و ان مدینہ شہر کی جانب روانہ ہوئے، اس موقع پر یہ دونوں الگ الگ اونٹی کی بجائے اب ایک ہی اونٹی پر سوار تھے، اس دوران رسول اللہ ﷺ کو دھوپ کی شدت سے بچانے کیلئے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے رومال سے مسلسل آپ کے سر مبارک پر سایہ کئے ہوئے تھے۔

اس دوران کتنی ہی بستیوں سے اور کتنے ہی گلی محلوں سے گذر رہوا..... کتنے ہی قبائل کے مسکن راستے میں آئے..... جس قبیلے کے مسکن سے گذر رہوتا..... وہاں ہر کوئی دیدہ و دل فرش را کئے ہوئے نظر آتا..... بار بار آوزیں بلند ہوتیں ”هَلْمٌ إِلَيْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ..... هَلْمٌ إِلَى الْعَدَدِ وَالْعُدَّةِ..... وَالسِّلَاحِ وَالْمَنَعَةِ.....“ یعنی: ”اے اللہ کے رسول، ہمارے پاس تشریف لائیے..... ہمیں خدمت کا موقع مرحمت فرمائیے..... اے اللہ کے رسول..... آپ دیکھ لیجئے کہ ہماری تعداد کتنی زیادہ ہے..... اور ہمارے پاس سامان جنگ کی کس قدر بہتات ہے..... ہم کتنی اچھی طرح آپ کی حفاظت کا فریضہ انجام دینے کے قابل ہیں.....“

یوں دیوانہ وار ہر قبیلے والے یہی صدائیں بلند کرتے اور یہی اصرار کرتے اور رسول اللہ ﷺ کی میربانی کا شرف حاصل کرنے کیلئے بچھے بچھے جاتے !!

ایسے میں بسا اوقات بہت سے لوگ آگے بڑھ کر آپ کی اونٹی کی مہار پکڑ لیتے تاکہ اونٹی یہیں بیٹھ جائے اور آپ یہیں پڑا ڈال دیں لیکن ہر بار آپ نہایت شفقت و محبت سے انہیں سمجھاتے اور بار بار اپنی زبان مبارک سے یہ الفاظ دھراتے: ”دَعُوهَا

..... فَإِنَّهَا مَأْمُورَةٌ، یعنی ”لوگو! میری اونٹی کو چھوڑ دو..... کیونکہ یہ تو اللہ کے حکم سے چل رہی ہے.....“

تمام راستے میں چھوٹے بڑے..... بوڑھے..... جوان اور بچے..... مردا و عورتیں..... سب ہی راستے کے دونوں جانب صفت کھڑے تھے..... گویا آج تمام مدینہ شہر ہی الہ آیا تھا..... اور اس دوران بچیاں نہایت دل کش انداز میں، خوب ترنم کے ساتھ..... بیک آواز خیر مقدمی اشعار گارہی تھیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّةِ الْوَدَاعِ

وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلَّهِ دَاعِ

أَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِينَا جَئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاعِ

مفہوم: ”آج تو ہمارے شہر مدینہ میں چودھویں کا چاند نکل آیا ہے..... اللہ کی طرف سے ہم پر یہ تو ایسا احسان عظیم ہو گیا ہے کہ..... جس کی وجہ سے اب ہم پر ہر لمحہ اللہ کا شکر بجا لانا ضروری ہو گیا ہے..... اے ہماری جانب بھیجے جانے والے اللہ کے رسول یقیناً آپ تو ایسا دین لائے ہیں کہ جسے قبول کرنا سب کیلئے لازمی ہے.....!!۔“

اسی کیفیت میں اونٹی مسلسل چلتی رہی..... چلتی رہی..... کتنے ہی گلی کوچے آئے اور گذر گئے آخر چلتے چلتے ایک جگہ پہنچ کر اونٹی اچانک رک گئی کچھ دیرا دھر ادھر نگاہ دوڑائی اور اس کے بعد بیٹھ گئی لیکن پھر فروائی اٹھی چند قدم آگے چلی اور پھر رُک کر گردن گھما گھما کر پیچھے اسی جگہ کی جانب دیکھنے لگی اس کے بعد واپس مڑی دوبارہ اسی جگہ آئی اور بیٹھتے ہی

فوراً اب اپنی گردن زمین کے ساتھ ٹکادی..... یعنی اشارہ دیدیا کہ منزل مقصود یہی ہے..... جس منزل کی تلاش میں مکہ سے سینکڑوں میلیوں کی مسافت طے کرتے ہوئے چلے آ رہے ہیں..... وہ منزل یہی ہے..... اورتب رسول اللہ ﷺ نیز آپؐ کے ہمسفر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں اونٹی سے نیچے اتر آئے..... اور یہ یعنیہ وہی مقام تھا کہ جہاں آج مسجد نبوی آباد ہے..... !!

اونٹی سے نیچے اترتے ہی آپؐ نے دریافت فرمایا کہ ”یہ سامنے سب سے قریب جو دروازہ نظر آ رہا ہے، یہ کس کا ہے؟“ جواب ملا کہ ”یہ دروازہ ابوالیوب انصاریؓ کا ہے“ تب آپؐ اس دروازے کی جانب بڑھے..... ابوالیوب انصاریؓ نے جب یہ منظر دیکھا..... تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا..... اور وہ دیوانہ وار آپؐ کی جانب لکپے..... اور یوں اس نئے شہر میں مدینہ میں سید الاولین والآخرین اشرف الانبیاء والمرسلین خیر البشر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی میزبانی کا عظیم شرف حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہ کو نصیب ہوا..... ذلیک فضلُ اللّٰهِ يُؤتیهِ مَن يَشَاء آپؐ سات ماہ مسلسل انہی کے گھر میں تشریف فرمائے۔

رسول ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد چند روز ہی گذرے تھے کہ اس دوران حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبد اللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی نیز قیادت ایک مختصر ساقفلہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچا اور آپؐ سے آلا، اس مختصر قافلے میں آپؐ ﷺ کے اہل خانہ میں سے ام المؤمنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا، ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، آپؐ کی صاحبزادیوں میں سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، نیز حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا، ان کے علاوہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جو کہ اس

وقت کافی کم س تھے اور ان کی والدہ ام ایکن رضی اللہ عنہا شامل تھیں۔

سفر ہجرت میں ہمارے لئے سبق اور پیغام:

☆..... اللہ پر توکل:

اس تاریخی اور یادگار ترین سفر میں امت کیلئے یقیناً سب سے پہلا سبق یہی ہے کہ حالات کیسے ہی کھٹکن اور مشکل ترین کیوں نہ ہوں..... بہر صورت صرف اور صرف اللہ پر توکل و اعتماد کیا جائے، اسی سے التجاء و فریاد کی جائے، اور اسی سے مدد طلب کی جائے.....
اس سفر کے دوران ہر ایک ایک قدم پر، اور با خصوص غاریشور میں قیام کے دوران جب مشرکین مکہ تعاقب کرتے ہوئے اس غار کے دہانے تک آپنچے تھے..... رسول اللہ ﷺ کی سیرت و کردار میں توکل علی اللہ کی ایسی نادر و نایاب مثالیں نظر آتی ہیں کہ شاید تمام انسانی تاریخ میں ایسی کوئی اور مثال نہیں مل سکے گی۔

☆..... توکل کی حقیقت:

البتہ اس مناسبت سے یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ اس تاریخی موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے مبارک عمل سے ہمیشہ کیلئے امت کو ”توکل کی حقیقت“ بھی بتا دی۔
چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس تاریخی اور انتہائی خطرناک سفر کے موقع پر آپ نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر تمام توکل اور غیر متزلزل اعتماد اور بھروسے کے باوجود ہر وہ سبب اختیار کیا جو اس سلسلے میں مفید ثابت ہو سلتا تھا، مثلاً:

☆..... اس سفر کے بارے میں انتہائی رازداری بر تی گئی۔

☆..... مکہ سے روانگی کے فوری بعد شمال یعنی مدینہ کی جانب چلنے کی بجائے بالکل مخالف

سمت یعنی جنوب کی جانب سفر کیا گیا۔

☆..... مسلسل سفر جاری رکھنے کی بجائے ابتداء میں چند روز ”غایر ثور“ میں توقف کیا گیا، تا کہ تلاش اور تعاقب کا سلسلہ جب کچھ ٹھہڈا پڑ جائے تب وہاں سے آگے اصل سفر کا آغاز کیا جائے۔

☆..... اصل سفر پر روانہ ہوتے وقت معروف راستے کی بجائے گنمام اور ویران راستے اختیار کیا گیا۔

☆..... اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے رسول ﷺ کو تمام جہاں والوں کیلئے ”رہبر“ بنا کر بھیجا گیا تھا، مگر اس کے باوجود اس سفر ہجرت کے موقع پر آپؐ نے ”احتیاطی تدیر“ کے طور پر عبداللہ بن اُبی قط نامی ”رہبر“ کی خدمات حاصل کیں۔

☆..... قدموں کے نشانات مٹانے کیلئے عامر بن فہیرہ نامی چروائے کو پیشگی تاکید کی گئی کہ وہ اس راستے پر اپنی کمریاں چڑائے، نیز کمریوں کا دودھ بھی انہیں پہنچادیا کرے۔

غرضیکہ رسول ﷺ نے محض بیٹھائے یہ دعویٰ کرنے کی بجائے کہ اپنے اللہ پر مجھے مکمل بھروسہ ہے..... آپؐ نے اس سفر کی تیاری کے سلسلے میں انتہائی کوشش اور محنت و مشقت کی، ہر اس سبب کو اختیار کیا جو اس سفر کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں اللہ کے حکم سے نافع و مفید ثابت ہو سکتا تھا۔

یقیناً اس سے ”توکل کی حقیقت“ سمجھ میں آتی ہے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھ رہنے اور ”توکل“ کا دعویٰ کرنے کی بجائے، خوب کوشش، جدوجہد اور محنت و مشقت کیا کرے، ہر اس سبب کو اختیار کرے جو ”مقصود“ تک پہنچنے کیلئے نافع و مفید ثابت ہو سکتا ہو، اور اس کے بعد معاملہ اللہ پر چھوڑ دے، خود کو اللہ کے حوالے کر دے، خوب گڑگڑا کر اور دل لگا کر

اللہ سے مناجات اور دعا و فریاد کرے یہ ہے ”توکل کی حقیقت“۔

پرندہ جب اپنے گھونسلے سے نکلتا ہے، تب اللہ اسے رزق عطا فرماتا ہے، وہی اللہ اس کمزور مخلوق کو اس کے گھونسلے کے اندر بیٹھے بٹھائے بھی یقیناً رزق عطا فرماسکلتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا جب وہ گھونسلے سے باہر آتا ہے محنت کرتا ہے تلاش و جستجو کرتا ہے تب اللہ کی طرف سے اس کیلئے رزق کا انتظام کیا جاتا ہے۔

لہذا قانونِ قدرت یہی ہے کہ انسان جو کچھ کر سکتا ہے وہ ضرور کرے اور اس کے بعد اللہ پر توکل کرتے ہوئے معاملہ اس کے حوالے کر دے اور پھر جو بھی نتیجہ ظاہر ہو اس پر راضی و قانع رہے اسی کا نام ”توکل“ ہے۔

☆ امانت و دیانت :

اُس دور میں مشرکین مکہ کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنی تمام فیقیٰ اشیاء حفاظت کی غرض سے رسول اللہ ﷺ کے پاس بطور امانت رکھوایا کرتے تھے، ہجرت کی رات آپ ﷺ نے وہ تمام امانتیں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتے ہوئے انہیں تاکید فرمائی کہ ”میری روائگی کے بعد تم یہ تمام امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچا دینا، اور اس کے بعد مکہ سے ہجرت کرنا“۔

مشرکین مکہ کے کردار کا یہ عجیب تصاد تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یقیناً ان کے کردار کا یہ ایک بڑا عجوبہ تھا کہ ایک طرف تو وہ سب رسول اللہ ﷺ کے خون کے پیاس سے تھے اور آپؐ کی جان کے درپے تھے جبکہ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف یہ عجیب صورتِ حال تھی کہ آپس میں تمام مرمحبوں اور قربتوں کے باوجود وہ باہم ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے کیلئے قطعاً تباہی نہیں تھے پورے شہر مکہ میں اگر انہیں بھروسہ تھا، تو صرف

رسول ﷺ پر ہی تھا..... اسی نے اپنی امانتیں وہ سب ہمیشہ بلا خوف و خطر آپؐ کے پاس ہی رکھوایا کرتے اور پھر بے فکر ہو جایا کرتے تھے!

اور پھر اس موقع پر رسول ﷺ کی بے مثال امانت و دیانت بھی قابل غور ہے کہ آپؐ نے لمحہ بھر کیلئے بھی یہ نہیں سوچا کہ میرا یوں گھر سے بے گھر، اور وطن سے بے وطن ہو جانا اور یہ تمام مشکلات اور یہ نقصانات ان سب کی اصل وجہ تو یہی مشرکین مکہ ہی ہیں لہذا کیوں نہ میں یہاں سے چلتے چلتے ان کی یہ تمام امانتیں اپنے ہمراہ لیتا چلوں تاکہ اس طرح میرے اس نقصان کی کچھ تلافی تو ہو سکے کہ جس کا سبب خود یہی مشرکین مکہ ہی ہیں!

لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا اور آپؐ ایسا کس طرح کرتے؟ کہ خود آپؐ نے ہی تو اپنی امت کو یہ شہری تعلیم دی تھی کہ: (أَدِّ الْأَمَانَةَ إِلَى مَنِ ائْتَمَنَكَ، وَ لَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ) (۱) ترجمہ: (جس نے تمہارے پاس کوئی امانت رکھوائی ہو، تم اس کی امانت اس کے حوالے کر دو، اور جس کسی نے تمہارے ساتھ خیانت کی ہو، تم اس کے ساتھ ہرگز خیانت نہ کرو)۔

یعنی اگر کوئی تمہارے پاس اپنی کوئی چیز بطور امانت رکھوائے، اس کے بعد جب بھی وہ اپنی امانت کا تم سے مطالبہ کرے، تم بلا چون وچار فوراً اس کی امانت اصل حالت میں پوری طرح اور بغیر کسی کمی میشی کے اس کے حوالے کر دو، اگرچہ اس نے کبھی تمہارے ساتھ کوئی خیانت و بد دیانتی کی ہو لیکن تم جواب میں اس کے ساتھ ایسا نہ کرو،

چنانچہ اپنی امت کیلئے جس طرح رسول ﷺ کی یہ شہری اور بے مثال تعلیم تھی، یقیناً آپؐ

کا اپنا طریقہ عمل اور اخلاق و کردار بھی ایسا ہی بے مثال اور روشن تھا..... آپؐ اپنے بدترین مخالفین اور اپنے جانی دشمنوں کی وہ امانتیں اپنے ہمراہ نہیں لے گئے بلکہ وہ تمام تر امانتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتے ہوئے انہیں ان کے مالکوں کے حوالے کرنے کی تاکید و تلقین فرمائی۔

امانت و دیانت کے حوالے سے تمام دنیاۓ انسانیت ایسی روشن مثال پیش کرنے سے ہمیشہ عاجز و قاصر ہی رہے گی!.....!

لہذا مسلمان ہونے کی حیثیت سے اور آپ ﷺ کے امتی اور نام لیوا ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ واقعہ ہجرت کے تعلق سے ہم ”امانت و دیانت“ کے سلسلے میں اپنے گریبان میں جھانکیں اپنے ضمیر کو چھبھوڑیں اور اپنے اخلاق و کردار کو ٹھوٹلیں !!

فہیمتی ترین محتاج: دین و ایمان:

رسول ﷺ اور آپؐ کے جان شار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، اس مقصد کیلئے انہوں نے اپنی تجارت، زمیں جانیداد، گھر بار وغیرہ سب ہی کچھ قربان کر دیا، حالانکہ آپ ﷺ نیز آپؐ کے جان شار ساتھیوں کو راہ حق سے بر گشتہ کرنے کیلئے مشرکین مکہ نے ”ترہیب“ کے ساتھ ساتھ ”ترغیب“ میں بھی کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی، یعنی ہر قسم کی بدسلوکی، ایذاء رسانی، اوغلیم و تعددی کے ساتھ ساتھ ہر قسم کا لالج بھی دیا، مختلف حیلوں بہانوں سے مسلمانوں کو بہکانے اور وغلانے کی سر توڑ کوششیں کیں، اور ہر قسم کے حربے آزمائے غرضیکہ مسلمان اگر ان مشرکین مکہ کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے دین اسلام کو ترک کر دیتے، تو نہ صرف یہ کہ ان پر ظلم و تشدد کا سلسہ بند کر دیا جاتا اور انہیں ان کی دولت اور زمین و جائیداد

سے زبردست محروم نہ کیا جاتا..... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مزید یہ کہ انہیں بہت کچھ دیا جاتا اور انعام و اکرام سے نواز جاتا۔

لیکن اس کے باوجود حضرات صحابہؓ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، زندگی بھر کی جمع پونچی را ہ حق میں لٹا کر..... بس ایمان کی دولت کو غاصبوں اور لیڑوں سے بچانے کیلئے وہاں سے ہجرت کر گئے.....

اس سلسلے میں مثالیں تو بہت سی ہیں، لیکن یہاں صرف ایک مثال ذکر کی جا رہی ہے: حضرت صحیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ جب سفر ہجرت پر روانہ ہونے لگے تو مشرکین مکہ نے ان کا راستہ روکا، اور یوں کہنے لگے کہ ”اے صحیب! تم ملکِ روم سے یہاں خالی ہاتھ آئے تھے، اور پھر یہاں ہمارے شہر مکہ میں رہتے ہوئے تم نے تجارت کی اور یہ تمام روپیہ پیسہ جمع کیا، لہذا ہم تمہیں یہاں سے ہرگز جانے نہیں دیں گے“ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ ”ٹھیک ہے، میرا تمام روپیہ پیسہ فلاں جگہ موجود ہے..... وہ تم وہاں سے لے لو..... اور مجھے جانے دو“

اس پر وہ مشرکین مکہ خوش ہو گئے اور انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ غرضیکہ اس طرزِ عمل سے حضرت صحیب بن سنان رومیؓ نے ہمیشہ کیلئے دنیا کے انسانیت کو یہ انمول پیغام دیا کہ مومن کیلئے سب سے اہم ترین دولت ایمان کی دولت ہے، کہ سب کچھ لٹا کر بھی اگر اس دولت کو چالا جائے تو یہ بہت بڑے فائدے کا سودا ہے۔

اسی واقعہ کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ أَبْتَغَاهُ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَؤُوفٌ بِالْعِبَادِ﴾ (۱)

ترجمہ: (لوگوں میں سے ایک وہ بھی ہے جو اپنی جان تک فروخت کر دیتا ہے اللہ کی رضا حاصل کرنے کیلئے، اور اللہ تو بنزوں پر بڑا ہی مہربان ہے)

یعنی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جاں ثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نظر میں دنیا کی ہر دولت سے زیادہ، بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز اور قیمتی ترین متاع ”ایمان“ کی دولت تھی، اور ان کا یہ نظر یہ تھا کہ مال و دولت باقی رہے یا نہ رہے، جان بچے یا نہ بچے، مگر ”ایمان“ بہر صورتِ سلامت رہے۔

چنانچہ واقعہ ہجرت ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے کہ ہم اپنے دلوں کو ٹوٹ لیں، اپنے گریباں میں جھامکیں، اپنی ایمانی کیفیت کا حساب کریں، اور پنے اخلاق و کردار کا جائزہ لیں، اور اس عظیم اور تاریخی سفر، یعنی ”سفرِ ہجرت“ میں پوشیدہ اس پیغام کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ ”ہم جن کے نام لیوا اور ارمتی ہیں..... جن سے محبت کے ہم دعویدار ہیں..... ان کا نظر یہ اور انداز فکر تو یہ تھا کہ جو کچھ لٹتا ہے لٹ جائے، مگر ایمان سلامت رہ جائے..... یہی واقعہ ہجرت کا پیغام ہے۔

☆..... ہجرت سے مقصود نئے معاشرے کا قیام:

واقعہ ہجرت کے حوالے سے یہ بات بھی ذہن نشیں رکھی جائے کہ رسول اللہ ﷺ، نیز حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مکہ سے مدینہ کی جانب یہ ہجرت محض مشرکین مکہ کے ظلم و استبداد سے نجات اور ان کی ایذا اور سانیوں سے فرار کی خاطر نہیں تھی.....

بلکہ ان کی اس ہجرت سے اصل مقصود ایک نئے اور ایسے مثالی معاشرے کا قیام تھا کہ جس کی بنیاد عقیدہ وایمان، حق و صداقت، اور عدل و انصاف پر ہو، جہاں کسی کے ساتھ کسی قسم کی ظلم و زیادتی، نا انصافی اور حق تلفی کا کوئی تصور نہ ہو، جہاں ہر ایک کی جان و مال اور عزت و آبرو مکمل محفوظ ہو، کیونکہ ایسے مثالی معاشرے کا قیام بھی ضروریاتِ دین میں سے ہے۔

☆.....اسلامی کلینٹر کا آغاز:

☆ اس دنیا میں جتنی اقوام ہیں اور جتنے مذاہب وادیاں کے پیروکار ہیں ان سبھی کے بیہاء کیفیت یہ نظر آتی ہے کہ ان میں سے کسی کے سال کا آغاز ہوتا ہے ان کی کسی اہم ترین اور محبوب و محترم شخصیت کی پیدائش سے، چنانچہ وہ لوگ ہمیشہ نئے سال کی آمد کے موقع پر اس حوالے سے خوشیاں مناتے ہیں۔

اس کے بعد کسی کا نیا سال شروع ہوتا ہے ان کی کسی اہم شخصیت کی وفات کے دن سے، لہذا یہ لوگ ہمیشہ رونے و ہونے اور غم منانے میں ہی مشغول و منہک رہتے ہیں۔

جبکہ اسلام تو ”اللہ“ کا دین ہے، اور اللہ تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ کیلئے ہے، نہ اس کی کوئی ابتداء ہے اور نہ ہی اس کی کوئی انتہاء ہے، لہذا اسلامی سال کا تعلق نہ تو کسی کی پیدائش سے ہے اور نہ ہی کسی کی وفات سے..... بلکہ اسلامی سال کا آغاز تو ”واقعہ ہجرت“ سے ہوتا ہے۔

☆ رسول ﷺ کے مبارک دور میں متعدد ایسے واقعات پیش آئے جو کہ تمام مسلمانوں کیلئے انتہائی مسرت کا باعث بنے..... جبکہ اسی طرح بہت سے ایسے واقعات بھی تو اتر کے ساتھ پیش آتے رہے جو کہ انتہائی رنج و غم اور بڑے صدمے کا سبب بنے۔

لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اسلامی سال کے آغاز کیلئے مسروتوں سے بھرپور کسی واقعہ کا انتخاب نہیں کیا گیا..... کیونکہ ہمیشہ خوشیاں منانے رہنا اور اصل مقصد سے غافل ہوجانا دینِ اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔

بعینہ اسی طرح کسی اندوہنا ک واقعے کو بھی اسلامی سال کے آغاز کیلئے منتخب نہیں کیا گیا، کیونکہ ہمیشہ غم منانا، روتے رہنا، اور پست ہمتی کا شکار ہوجانا بھی یقیناً مسلمان کی شان کے

خلاف ہے۔

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ ”اسلامی سال“، کا آغاز ”واقعہ ہجرت“ سے کیا گیا، تاکہ ہمیشہ نئے سال کی آمد کے موقع پر وہ قیمتی ترین سبق اور وہ اہم ترین پیغام ذہنوں میں تازہ ہوتا رہے کہ جو اس تاریخی واقعے میں ہمارے لئے پوشیدہ ہے..... یعنی: اللہ پر سچا ایمان، حقیقی توکل، امانت و دیانت کی ضرورت و اہمیت، دین و ایمان کی حفاظت کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کیلئے ہمہ وقت مستعد رہنے کا جذبہ و شعور حق کی سر بلندی کی خاطر جہد مسلسل اور سعی پیغم..... نیز ہر قسم کے حالات میں صراطِ مستقیم پر مکمل استقامت کے ساتھ گام زن رہنا.....!

☆ اسلامی کیلڈر کے آغاز کیلئے ”واقعہ ہجرت“ کے انتخاب کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ یہ اس قدر عظیم الشان اور ایسا بے مثال واقعہ ہے کہ جس کے نتیجے میں اسلامی تاریخ ہمیشہ کیلئے بدلتی..... دینِ اسلام جو کہ ہجرت سے قبل محض مکہ شہر کے اندر محصور تھا، اب ہجرت کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے زمان و مکان کی تمام حدود قیود کو توڑتا ہوا امشرق و مغرب میں..... شمال اور جنوب میں..... دنیا کے ہر خطے..... اور ہر گوشے میں جا پہنچا۔

مکہ میں مسلمان انتہائی کمزور اور مظلوم و مجبور تھے، بے بُسی و کسپہری کی زندگی بسر کر رہے تھے، جبکہ ہجرت کے بعد ان کیلئے اب ایک نئی اور بدلتی ہوئی زندگی کا آغاز ہوا..... ایسی زندگی جو کہ ان کی کمی زندگی سے یکسر مختلف تھی۔

غرضیکہ ”واقعہ ہجرت“ چونکہ مسلمانوں کیلئے دینی، معاشری، سیاسی..... غرضیکہ ہر لحاظ سے ہمیشہ کیلئے انتہائی خوشگوار تبدیلی کا ” نقطہ آغاز“ ثابت ہوا..... لہذا اسلامی سال کا آغاز بھی واقعہ ہجرت سے ہی کیا گیا۔

نئی زندگی:مدینہ میں دینی، معاشرتی، و سیاسی صورت حال:

رسول ﷺ نے بعثت سے قبل اپنی حیاتِ طیبہ کے چالیس سال اس دنیا میں گزارے، اور پھر جب آپ ﷺ کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے نبوت عطا کی گئی تو اب آپ ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی کا آغاز ہوا، آپ ﷺ کی یہ پیغمبرانہ زندگی تینیس سال کے عرصے پر محیط ہے، جس میں سے ابتدائی تیرہ سال آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں گزارے، اور پھر بھرت کا حکم نازل ہونے پر آپ ﷺ کہ میں سے مدینہ (اُس دور میں جسے یہ رہب کہا جاتا تھا) بھرت فرمائے، جہاں آپ ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری دس سال گزارے۔

رسول ﷺ کی تیرہ سالہ ”مکی زندگی“، کو جس طرح تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، اسی طرح دس سال کے عرصے پر محیط اس ”مدنی زندگی“، کوچھ تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے؛

☆.....پہلا دور:

مدینہ آمد کے بعد سے سنہ ۶ ہجری میں پیش آنے والے ”صلحِ حدیبیہ“ کے واقعے تک کا چھ سالہ دور، جس کے دوران چھپے ہوئے اندر وہی دشمنوں، نیز پیر وہی دشمنوں نے مختلف مشکلات پیدا کیں، متعدد جنگوں کی نوبت آئی، بالآخر ”صلحِ حدیبیہ“ کے نتیجے میں صورتِ حال میں تبدیلی رو نہما ہوئی۔

☆.....دوسرا دور:

صلحِ حدیبیہ کے بعد دو سالہ دور، اس صلح کی وجہ سے چونکہ رسول ﷺ نیز آپ ﷺ کے جان

شارسا تھیوں کو شرکیں مکہ کی طرف سے قدرے بے فکری میسر آئی تھی، لہذا اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ ﷺ نے تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیتے ہوئے مختلف سربراہانِ مملکت، فرمانرواؤں، اور حکمرانوں کے نام دعویٰ خطوط ارسال فرمائے۔ تاہم یہ امن عارضی ثابت ہوا، شرکیں مکہ کی طرف سے مسلسل عہد شکنی کے نتیجے میں بالآخر دو سال کا عرصہ گذرنے کے بعد سنہ ۸ ہجری میں اس معاهدہ صلح کا خاتمہ ہو گیا۔

☆.....تیسرا دور:

سن ۸ ہجری ماہ رمضان میں فتح مکہ کے تاریخی واقعہ سے سن ۱۱ ہجری ماہ ربیع الاول میں رسول اللہ ﷺ کی اس جہان فانی سے رحلت تک کا تقریباً ڈھانی سالہ دور۔ اس دور میں چونکہ فتح مکہ کے نتیجے میں مشرکین کا غلبہ ختم ہو گیا، ان کی شان و شوکت جاتی رہی..... اور وہ ظاہری و نفسیاتی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے..... جس کے نتیجے میں ملکِ عرب کے طول و عرض میں لوگ فوج درفعہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے..... دور دراز کے علاقوں سے لوگ بڑی تعداد میں بڑے بڑے وفود کی شکل میں دینِ اسلام قبول کرنے کیلئے مدینہ آنے لگے..... اس دو سالہ دور میں ان وفود کا مستقل تانتا بندھار ہا۔

☆.....نیا معاشرہ:

ہجرتِ مدینہ سے مقصود یہ نہیں تھا کہ محض مشکلات سے نجات کی خاطر کسی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی جانب ”نقل مکانی“ کر لی جائے۔ بلکہ اصل مقصد ایک نئے معاشرے کا قیام تھا کہ جس کی بنیاد عقیدہ و ایمان پر ہو، جس کا پنا کوئی شخص ہو، کوئی قانون ہو، کوئی دستور ہو..... ورنہ محض ”نقل مکانی“ کی تو کوئی

ضرورت نہیں تھی۔

ہجرت کے بعد اب اس نئی جگہ پر ہر مسلمان کا یہ فرض تھا کہ وہ اس نئے معاشرے کی تنقیل کیلئے محنت و کوشش اور فکر و جتو کرے، ہر کوئی اپنی ذمہ داری نبھائے اور اپنا فرض پورا کرے..... اور اس سلسلے میں ان سب کے متفقہ قائد اور ہبر وہنماء خود رسول ﷺ تھے۔

مکی دور میں تمام مسلمان اگرچہ عقیدہ دایمان کے معاہلے میں یقیناً ہم متفق و متحد تھے، لیکن ان کا کوئی مستقل معاشرہ نہیں تھا، وہ سب وہاں متفرق اور منتشر تھے، الگ الگ ملوں اور بستیوں میں..... کسی ایک محلے میں اکا دکا مسلمان..... دور دراز کسی دوسرے محلے میں دوچار مسلمان..... لہذا مکی دور میں مسلمانوں کی کوئی مستقل معاشرتی زندگی نہیں تھی۔

یہی وجہ ہے کہ مکی دور میں قرآن کریم کی جو سورتیں یا جو آیات نازل ہوئیں ان میں صرف ایسی بنیادی تعلیمات تھیں کہ جن پر ہر کوئی اپنی جگہ انفرادی طور پر عمل کر سکتا تھا، ان میں اجتماعی یا معاشرتی مسائل کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔

لیکن اب یہاں مدینہ میں وہ سب کیجا تھے، آزاد تھے، مکمل خود مختار بھی تھے، اب اس نئے اور آزاد و مکمل خود مختار معاشرے کیلئے نئے قانون، نئے آئین، اور نئے دستور کی ضرورت تھی، کیونکہ اب تو گویا یا قاعدہ ایک نئی مملکت وجود میں آچکی تھی..... اس نوزاںیدہ مملکت کو کس طرح چلانا ہے؟ یہاں قواعد و قوانین کیا ہوں گے؟ معیشت اور روزگار کے مسائل کا حل کیا ہوگا؟ اندر وہی ویروں نی خطرات سے کس طرح نپٹا جائے گا؟ جغرافیائی و نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا کیا انتظام ہوگا؟ نیز اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل..... تجارت، سیاست، معیشت و اقتصاد سے متعلق امور..... وغیرہ..... یقیناً یہ سب کچھ بہت بڑا چیز تھا۔

اور پھر مزید یہ کہ اس بڑے چیخ سے پنٹے کیلے اس شہر، اس علاقے، اس ماحول، نیز وہاں آباد لوگوں کے مذہبی، سیاسی، معاشرتی، و معاشرتی امور اور ان کے پس منظر سے مکمل واقفیت و آگاہی ضروری تھی، تاکہ کوئی بھی قاعدہ و قانون یا آئین و دستور ترتیب دیتے وقت ان تمام امور کو ٹھوڑا خاطرا اور مدد نظر کھا جاسکے۔

چنانچہ اُس وقت مدینہ کے باشندوں کی صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ انہیں درج ذیل تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

☆.....صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین:

سب سے پہلی قسم کے لوگ رسول اللہ ﷺ کے جاں ثناًر صحابہ کرام تھے جو آپؐ کے محض ایک اشارے پر ہمہ وقت اپنا تن من دھن سب ہی کچھ قربان کر دینے کیلئے آمادہ و تیار رہتے تھے۔ پھر ان صحابہ کرام کی دو قسمیں تھیں، مہاجرین و انصار:

☆ ”مہاجرین“ وہ حضرات تھے جو دراصل مکہ کے باشندے تھے، اور محض اپنے دین و ایمان کی حفاظت کی خاطر اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنا گھر بیار، اپنا کار و بار..... اور اپنا سبھی کچھ..... مکہ میں چھوڑ کرو ہاں سے خالی ہاتھ اور بے سرو سامان مدینہ چلے آئے تھے۔

☆ جبکہ ”النصار“ مدینہ ہی کے اصل باشندے تھے اور دین اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی بدستور اپنے شہر میں اور اپنے گھروں میں ہی آباد تھے، لہذا (اس لحاظ سے) ان دونوں یعنی مہاجرین و انصار کے حالات کافی مختلف تھے۔

☆..... مقامی مشرکین:

یہ لوگ ابھی تک اپنے آبائی دین یعنی شرک و بت پرستی پر ہی قائم تھے، اور ان کی بھی دو

فتیمیں تھیں:

☆ ایک تو وہ لوگ کہ جواب تک، یعنی رسول ﷺ کی مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد بھی متعدد تھے کہ اپنے آباؤ اجداد کے دین پر ہی بدستور قائم رہیں..... یا یہ کہ اب دینِ اسلام قبول کر لیں.....؟

ایک طرف آباؤ اجداد کے دین سے محبت نے انہیں پریشان کر کھاتھا، اس دین کو چھوڑ کر کوئی نیا دین اپنالیزنا ان کی نظر میں گویا اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ غداری و بیوفائی کے متراوٹ تھا..... جبکہ دوسری طرف یہ کہ مدینہ میں اب وہ جہاں جاتے..... جس طرف ان کی نگاہ اٹھتی..... ہر طرف مسلمان ہی نظر آتے..... لہذا اب اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے ان مسلمانوں کے درمیان اجنبی بن کر ہنا، بہت مشکل محسوس ہوتا تھا..... یوں یہ لوگ ابتداء میں کچھ عرصہ ڈھنی کشمکش میں بیتلار ہے..... اور بڑے ترد دکا شکار ہے..... لیکن جلد ہی انہیں شریح صدر ہو گیا اور انہوں نے دینِ اسلام قبول کر لیا اور یوں ہمیشہ کیلئے بہت ہی اچھے اور سچے مسلمان ثابت ہوئے۔

☆ جبکہ دوسرے وہ لوگ تھے کہ جو اپنے ظاہری دنیاوی مفادات کی خاطر بظاہر مسلمان ہو گئے..... یعنی یہ ”ابن الوقت“، قسم کے لوگ تھے، اور چڑھتے سورج کے بچاری تھے، کہ دنیاوی مفادات کی خاطر بظاہر مسلمان ہو گئے..... لیکن..... دل ہی دل میں اپنے پرانے دین اور پرانے طور طریقوں کو ہی اچھا سمجھتے رہے..... گویا ”زبان پر کچھ..... اور دل میں کچھ.....“ یوں آئندہ چل کر یہ لوگ ”منافقین“ کہلاتے۔

یہ منافقین ہمیشہ رسول ﷺ کو نیز دیگر تمام مسلمانوں کو پریشان کرتے رہے، بیرونی دشمنوں کے ساتھ مسلمانوں کیلئے قدم قدم پر مشکلات پیدا کرتے رہے، اور در پردہ

سازشوں کے جال بنتے رہے..... اور ان تمام معاوقین کا سر غنہ ”عبداللہ بن ابی“ تھا۔ دراصل رسول اللہ ﷺ کی مدینہ منورہ تشریف آوری سے قبل وہاں عرصہ دراز سے صورتِ حال کچھ ایسی چلی آ رہی تھی کہ باہمی قبائلی جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا، جس نے مدینہ کے تمام باشندوں کو ہلاکان اور ٹھہرائیں کر رکھا تھا، آپس کی ان خونزیزیوں اور رتبہ کاریوں سے وہ تنگ آ چکے تھے، اور اب وہ اس مصیبت سے مستقل نجات کا کوئی پائیدار حل چاہتے تھے۔ آخر خغور فکر کے بعد پہلی بار وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ نسل درسل چلی آنے والی ان طویل اور خونزیز جنگوں کے پیچھے اقتدار کی خواہش کا فرماء ہے، اور یہ تمام ترسہ کشی محض حصول اقتدار کیلئے ہے..... اور تب انہوں نے سوچا کہ ”اقتدار“ کی اس ”ہوس“ سے جان چھڑائی جائے..... اور تمام قبائل متفقہ طور پر کسی ایک شخص کو اپنا ”بادشاہ“ تسلیم کر لیں۔

چنانچہ ان سب نے متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ عبد اللہ بن ابی ان کا بادشاہ ہوگا..... اور پھر اس کیلئے ایک شاہی تخت کا انتظام کیا گیا..... شاہی تاج بھی تیار کیا گیا..... حتیٰ کہ اس کی تخت نشینی اور تاج پوشی کی تاریخ بھی مقرر کر لی گئی..... اور اس مقصد کیلئے تمام ترا نظمات کرنے کے لئے۔

لیکن عین انہی دنوں رسول اللہ ﷺ اپنے رب کے حکم کی تعیل کرتے ہوئے اپنے آبائی شہر مکہ مکرمہ سے بھرت فرماء کہ مدینہ منورہ آپنچے..... جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبد اللہ بن ابی کا بادشاہ بننے کا وہ خواب ادھورا رہ گیا..... اسے اپنے خواب کی تعبیر نہ مل سکی..... ظاہر ہے کہ اس کیلئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا..... لہذا رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی مدینہ آمد سے انتہائی ناگوار گذری..... اور پھر بظاہر اسلام قبول کر لینے کے باوجود وہ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف مکروہ فریب اور سازشوں کے تانے بننے میں پیش پیش رہا..... حتیٰ کہ اپنی انہی نہ موم

ومروہ حرکتوں کی وجہ سے ہمیشہ کہلائے ”رئیس المناقین“ کے لقب سے مشہور ہو گیا۔

☆..... یہود:

مدینہ میں یہودی بڑی تعداد میں آباد تھے، جو کہ دراصل مقامی باشندے نہیں تھے، اصل میں ان کا تعلق ملکِ شام کے مختلف علاقوں سے تھا، لیکن جب وہاں مختلف جنگوں اور خونزیزوں کے نتیجے میں، اور بالخصوص رومیوں کے غلبہ اور تسلط کے بعد جب وہاں ان کیلئے حالات ناساز گارہوتے گئے تو وہ اپنا وطن چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر منتشر ہونے لگے، اسی سلسلے میں بڑی تعداد میں وہ حجاز کے مختلف علاقوں اور بالخصوص خیبر اور مدینہ (جس کا نام اُس وقت یثرب تھا) میں بھی آ کر برس گئے۔

ان کی اصل زبان عبرانی تھی، لیکن انہوں نے رفتہ رفتہ عربی زبان سیکھ لی، مقامی رسم و رواج اور طور طریقے اپنالئے، اور یوں لسانی، ثقافتی اور تمدنی لحاظ سے مقامی آبادی میں خوب رج بس گئے، حتیٰ کہ مقامی آبادی کا ہی ایک حصہ بن گئے۔

یہودیوں کو اپنے دین کی نشر و اشاعت سے کوئی عرض نہیں تھی، کیونکہ وہ خود کو باقی لوگوں سے اعلیٰ و افضل تصور کرتے تھے، لہذا انہیں یہ بات ہرگز قبول نہیں تھی کہ دوسرا کوئی اس شرف اور اعزاز میں ان کے ساتھ حصے دار بنے۔

مقامی لوگوں کو یہ جاہل، گنوار اور حقیر سمجھتے، جب موقع ملتا پہنچتا ہے مکروہ فریب کے ذریعے انہیں لوٹ لیتے، انہیں دھوکہ دیتے، ان کا مال دبایتے، ان کا حق چھین لیتے..... اور اس حرکت کو وہ اپنا پیدائشی اور جائز حق قرار دیتے..... حتیٰ کہ ان کی اسی مذموم حرکت کی طرف خود فرقہ آن کریم میں بھی اشارہ کیا گیا: ﴿.....ذلک بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِلَيْسَ عَلَيْنَا فِي

الْأَمِينَ سَبِيلٌ (۱) ترجمہ: یا اس لئے کہ انہوں نے یہ کہہ رکھا ہے کہ ہم پران جاہلوں کے حق کا کوئی گناہ نہیں ہے)

یعنی یہ لوگ پیدائشی طور پر اپنا یہ جائز حق سمجھتے تھے کہ ہم چونکہ دوسروں سے بہت اعلیٰ و افضل ہیں اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڑلے ہیں جبکہ یہ مقامی افراد تو بس جاہل، گنوار اور حقیر و مکتر قسم کے لوگ ہیں لہذا ہم اگر اپنی عیاری و مکاری کے ذریعے ان کا حق دبایتے ہیں اور انہیں لوٹ لیتے ہیں تو اس میں قطعاً کوئی تباہت نہیں کیونکہ یہ تو ہیں ہی اسی قابل کہ ہم انہیں لوٹاہی کریں

اُن دنوں وہاں مدینہ میں ان یہودیوں کے دو پسندیدہ ترین مشاغل تھے، جادو ٹونہ اور تجارت۔

جادو ٹونہ میں یہ بہت پہنچے ہوئے تھے، بس یہی ان کا شہب و روز کا مشغله تھا حتیٰ کہ خود رسول ﷺ پر بھی انہوں نے جادو کیا۔

اسی طرح تجارت میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی، اور یہ اس حقیقت سے خوب آگاہ تھے کہ کسی بھی معاشرے پر اپنا اسلط قائم رکھنے کیلئے معاشی برتری بہت ضروری ہے جائز و ناجائز ہر قسم کے ہتھکنڈے اپنا کر کسی بھی صورت بس اپنی اجارہ داری اور معاشی برتری قائم رکھی جائے دوسروں کو بہر صورت اپناحتاج بنانے کر رکھا جائے کوئی کتنا ہی بیت ناک، خونخوار، اور طاقتور شیر ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر چند دن کیلئے اس کا دانہ پانی بند کر دیا جائے اور اسے بھوکا پیسا سار کھا جائے تو وہ خود بخود قابو میں آجائے گا یہ ان کا انداز فکر تھا، اور پھر اسی کے مطابق ان کا طرز عمل بھی تھا، لہذا تجارت اور معیشت پر

ان کی خوب مضبوط گرفت تھی۔

مزید یہ کہ مکروفریب، عیاری و مکاری، اور سازشوں کے تانے بننے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

چنانچہ یہ لوگ مقامی افراد کو، اور بالخصوص ان میں سے جو صاحبِ حیثیت اور قبائلی سردار قسم کے لوگ ہوتے، انہیں یہ جان بوجھ کرائی نازیا حرکتوں اور بربی عادتوں پر اکساتے کہ جن کیلئے مال کی ضرورت ہوتی..... انہیں برائی کا راستہ دکھانے اور بربی عادتوں میں بنتلا کر دینے کے بعد اس نئے اور بربے شوق کی تکمیل کیلئے انہیں سود پر روپیہ پیسہ بھی مہیا کرتے..... اور یوں ان کی اخلاقی و معاشرتی بربادی کے ساتھ ساتھ..... مالی طور پر بھی انہیں مفلس و کنگال کرتے چلتے..... اور اپنے شکنجه میں کستے چلتے جاتے.....!

اس کے علاوہ یہ کہ یہ یہودی مختلف مقامی قبائل کو آپس میں لڑواتے، خود خفیہ اور پس پرده رہتے ہوئے ان میں باہمی اختلافات اور فتوں کو ہوادیتے، جس کے نتیجے میں عرصہ دراز تک جاری رہنے والی بڑی خوزیر جنگوں کی نوبت آتی، اور ان جنگوں کیلئے مقامی افراد کو اسلحہ کی جب ضرورت پیش آتی تو اسلحہ و دیگر سامان جنگ خریدنے کی غرض سے یہ یہودی انہیں بڑی بڑی رقمیں سودی قرض پر مہیا کرتے..... اور یوں مقامی افراد آپس میں لڑتے لڑتے مسلسل کمزور نا تواں ہوتے چلتے، اپنے تمام ترو سائل ان تباہ کن جنگوں کی آگ میں جھونک دیتے..... جبکہ یہودی اپنی صفوں میں اتفاق و اتحاد اور اپنی بستیوں میں امن و امان کی وجہ سے مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلتے جاتے..... نیز اس سودی قرضے کی وجہ سے مقامی افراد مسلسل محتاج و کنگال جبکہ یہودی اپنی تجویریاں بھرتے چلتے جاتے.....!

اس صورتِ حال میں رسول ﷺ و دیگر مسلمانوں کی جب مکہ سے مدینہ آمد ہوئی تو یہ چیز یہودِ مدینہ کو سخت ناگوار محسوس ہوئی، ان کی کتابوں میں رسول ﷺ کے بارے میں جو تذکرہ تھا، اور جو واضح نشانیاں بیان کی گئی تھیں..... ان کی وجہ سے وہ دینِ اسلام اور پیغمبر اسلام کی حقانیت و صداقت سے بخوبی آگاہ تھے..... لیکن اس کے باوجود مغض اپنی ضد اور عناد اور حبِ باطن کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں سے سخت نالاں تھے اور ہر وقت عداوت و مخالفت پر آمادہ و مکربستہ رہتے تھے۔

☆..... ان داخلی اور اندرونی پریشانیوں کے علاوہ مزید یہ کہ مسلمان ابھی مدینہ میں سکھ کا سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ مشرکین مکہ کے بارے میں مسلسل ایسی خبریں آنے لگیں کہ وہ خوب زورو شور کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کی تیاریوں میں مشغول ہیں، تاکہ مدینہ میں مسلمانوں کے سنبھلنے اور پھلنے پھولنے سے پہلے ہی ان کا خاتمه کر دیا جائے.....

الہزادمی زندگی میں مسلمانوں کو ابتداء سے ہی اندرونی خفیہ دشمنوں (یعنی منافقین اور یہود) کے علاوہ مزید یہ کہ مشرکین مکہ کی طرف سے بھی بڑے اندیشے اور تشویش کا سامنا تھا۔ یہ تھے وہ حالات..... اور یہ تھے وہ اندرونی و بیرونی خطرات جن کے درمیان رسول ﷺ نے اس نوزائدہ اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔



الحمد لله آج بتارتیخ / جمادی الاولی ۱۴۳۲ھ، مطابق ۱۸ مارچ ۲۰۱۳ء بروز پیغمبر یہ بابِ کمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبَّ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ

نئے معاشرے کی تشكیل کیلئے

فوری اقدامات

رسول ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نئے معاشرے کی تشكیل اور اس نو زائدہ اسلامی ریاست کی تأسیس کی غرض سے چند فوری اور بیاناد قسم کے اقدامات کئے جن کے اثرات و ثمرات آئندہ چل کر انتہائی مفید اور دور رس ثابت ہوئے۔

☆.....مسجد نبوی کی تعمیر:

رسول ﷺ ہجرت کے موقع پر جب مکہ سے سفر کرتے ہوئے مدینہ منورہ تشریف لائے تھے، اُس موقع پر آپؐ کی اونٹی مختلف گلیوں، محلوں، نیز مختلف قبائل کے مساکن میں سے گذرتی ہوئی مسلسل آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی، راستے میں بار بار لوگ دیوانہ وار آگے بڑھ کر اس اونٹی کو روکنے کی کوشش کرتے اور اور انتہائی عقیدت و محبت کے ساتھ رسول ﷺ کی خدمت میں گزارش کرتے کہ ”اے اللہ کے رسول! بس یہیں ہمارے محلے میں رُک جائیے..... ہمیں خدمت کا موقع عنایت فرمائیے..... لیکن آپؐ بار بار یہی ارشاد دہراتے:

”دُعُوهَا فَإِنَّهَا مَأْمُورَةٌ“ یعنی ”اسے چھوڑ دو، یہ اللہ کے حکم سے چل رہی ہے“

بالآخر چلتے چلتے وہ اونٹی مدینہ کے مشہور خاندان ”بنو بجارت“ کے محلے میں ایک جگہ جا کر رُک گئی تھی، اور پھر کچھ دیر ادھر ادھر گردان گھمانے کے بعد اسی جگہ بیٹھ گئی تھی..... اور یہ جگہ حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے دروازے کے عین سامنے تھی۔

مدینہ منورہ میں چند دن گذرنے کے بعد رسول ﷺ نے جب مسلمانوں کیلئے روزانہ

پانچ وقت کی نماز بجماعت کی ادائیگی کی غرض سے مسجد کی تعمیر کا فریضہ فرمایا تب اس مقصد کیلئے جس جگہ کا انتخاب کیا گیا، اتفاقاً یہی جگہ تھی کہ جہاں آپؐ کی اونٹی آکر رکھی تھی۔ چنانچہ تعمیر مسجد کے مبارک کام کا آغاز کیا گیا، اس کام میں رسول ﷺ اپنے صحابہ کرام کے شانہ بشانہ مستقل طور پر بنس نفیس شریک رہے..... آپؐ اس موقع پر لکڑی، پتھر، مٹی وغیرہ و دیگر سامان تعمیر اپنے کندھوں پر اٹھا کر ادھر ادھر لے جاتے رہے..... غرضیکہ تعمیر مسجد کے اس مشکل اور کٹھن کام میں آپؐ اپنے اہتماء سے انتہاء تک خود شریک رہے۔

☆☆ رسول ﷺ کی ہربات میں اس قدر تاثیر کیوں تھی؟ آپؐ کی ہربات فوراً مخاطب کے دل کی گہرائیوں میں کیوں اُتر جاتی تھی؟ اس کی بہت بڑی وجہ یہی تھی کہ آپؐ کے قول فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا، آپؐ جب بھی دوسروں کو کسی کام کا حکم دیتے تو سب سے پہلے خود وہ کام انجام دیتے..... دوسروں سے پیش پیش رہتے..... اور یوں آپؐ کے قول فعل میں مطابقت کی وجہ سے لوگ آپؐ کی گفتگو سے..... آپؐ کی شخصیت سے..... اور آپؐ کی تعلیمات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے.....!

قول فعل میں مطابقت کے اسی زریں اصول کا عملی نمونہ ہمیں ”تعمیر مسجد“ کے موقع پر بھی خوب واضح نظر آتا ہے کہ آپؐ دوسروں کو اس کام میں شرکت کی ترغیب دینے کے بعد خود کسی ایک جگہ آرام سے بیٹھنہیں گئے..... بلکہ آپؐ بنس نفیس اس کام میں شریک رہے..... دوسروں سے آگے رہے..... یہی وجہ تھی کہ آپؐ کو اس طرح محنت و مشقت کرتے ہوئے دیکھ کر صحابہ کرام کے دلوں میں بھی جذبہ تازہ ہو جاتا..... ہمتیں بلند ہو جاتیں..... تحکاوت سے چور ہو جانے کے باوجود وہ خوب ہنسی خوشی اور انہائی ذوق و شوق اور دل جمعی کے ساتھ اس مقدس کام میں مگن رہتے..... اور اسی موقع پر ان میں سے

کسی نے یہ یادگار شعر کہا تھا:

لَئِنْ قَعَدَنَا وَ النَّبِيُّ يَعْمَلُ لَذَاكَ مِنَا الْعَمَلُ الْمُضَلُّ

یعنی ”هم اگر اپنی جگہ بیٹھے رہیں..... جبکہ ہمای آنکھوں کے سامنے اللہ کے نبی ﷺ کا مکان

اور محنت و مشقت میں مشغول رہیں..... یقیناً یہ تو بہت ہی بڑی گمراہی ہو گی.....!

چنانچہ اسی طرح محنت و مشقت اور ایسے ہی بے مثال جذبے کے ساتھ تعمیر مسجد کا مبارک
کام انجام دیا گیا اور یہ کام تخت و خوبی پائی تکمیل کو پہنچا۔

اس مسجد کی عمارت بہت ہی سیدھی سادھی تھی، فرش ریت اور کنکریوں کا تھا..... چھت
کھجور کے پتوں کی..... ستون کھجور کے تنوں کے..... جبکہ دیواریں کچھی تھیں..... جب کبھی

بارش ہوتی تو چھت پٹکنے لگتی، اور پیروں میں کچھر نمازیوں کیلئے پریشانی کا باعث بن جاتا۔

رسول ﷺ نے مدینہ منورہ میں اپنی تشریف آوری کے فوری بعد جو تعمیر مسجد کا کام انجام
دیا، اور پھر اس کام میں بخوبی نفیس خود بھی شرکت فرمائی..... یقیناً اس سے اسلامی معاشرے
میں مسجد کی اہمیت و ضرورت واضح ہوتی ہے..... حقیقت یہ ہے کہ مسجد اسلامی معاشرے کی
پہچان ہے، جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی بستی ہو گی، وہاں مسجد ضرور نظر آئے گی.....!

مدینہ منورہ میں رسول ﷺ کی تعمیر فرمودہ یہ مسجد مسلمانوں کیلئے عبادت گاہ بھی
تھی..... روحانی و مادی علوم کی عظیم درسگاہ بھی..... داخلی و خارجی تعلقات کی تعلیم و تربیت
کا ادارہ بھی..... اور عسکری تربیت کا مرکز بھی..... اس مسجد کے سامنے آج کے بڑے بڑے
علمی و ثقافتی عسکری ادارے بیچ ہیں..... اور اسی مسجد سے ہی علم و معرفت کا..... اور نور کا وہ
سیلا ب پھوٹا..... کہ جس کی شاعروں نے ساری دنیا کو منور کر دیا..... !!

☆.....مُواخَّة:

مدنی زندگی کے آغاز میں دوسرا جو فوری اور اہم ترین اقدام کیا گیا وہ ”مُواخَّة“ تھا، جس کے لفظی معنی ہے ”آپس میں بھائی بھائی بنادیں۔“

رسول ﷺ کے ساتھیوں میں سے کچھ مہاجرین تھے، جن کا تعلق شہر مکہ سے تھا، اور جو محض اپنے دین و ایمان کی حفاظت کی خاطر اپنا شہر، اپنا گھر باراً اپنا کاروبار، اپنی زمین جانیداً اور اپنا سبھی کچھ مکہ میں چھوڑ کر اللہ و رسول ﷺ کے حکم کی تعیل میں خالی ہاتھ مدینہ چلے آئے تھے، جو اصل میں مفلس و نادر نہیں تھے، وہاں مکہ میں ان کے پاس سبھی کچھ تھا، ان میں سے اکثر وہاں اپنے گھروں میں خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن اب یہ افراد جب خالی ہاتھ مدینہ پہنچے تو ان کی فوری آباد کاری اور ان کیلئے بنیادی ضروریات کی فراہمی یقیناً بہت بڑا مسئلہ تھا۔

قرآن کریم میں انہی حضرات کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿لِلْفَقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَ يَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ هُمُ الصَّابِرُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (ان مہاجر مسکینوں کیلئے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے نکال دیئے گئے ہیں، وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضا مندی کے طلبگار ہیں، اور اللہ کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی سچے لوگ ہیں)

اس آیت میں اللہ سبحانہ، و تعالیٰ کی طرف سے حضرات مہاجرین کی فضیلت، ان کا مقام و مرتبہ، ان کا اخلاص، اور ان کا سچا اور حقیقی مومن ہونا بیان کیا گیا ہے..... ظاہر ہے کہ یہ

بہت بڑی بات ہے.....!

جبکہ اس کے فوری بعد اگلی آیت میں خالق ارض و سماء کی طرف سے انصارِ مدینہ کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: ﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحْجُّونَ مَنْ هَا جَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلُحُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور وہ لوگ جنہوں نے اس گھر (مدینہ) میں اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنائی ہے، اور وہ اپنی طرف ہجرت کر کے آئے والوں سے محبت کرتے ہیں، اور مہاجرین کو جو کچھ دے دیا جائے اُس پر وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے، بلکہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں، گو خود کتنے ہی سخت ضرورتمند ہوں، بات یہ ہے کہ جو کوئی بھی اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا وہی کامیاب و با مراد ہے)

اس آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے انصارِ مدینہ کے بے مثال جذبہ ایثار کی تعریف بیان کی گئی ہے کہ یہ حضرات خود تنگی و محتاجی کے باوجود جو کچھ انہیں میسر آتا ہے سبھی کچھ اپنے مہاجر بھائیوں کیلئے قربان کر دیتے ہیں..... اس سلسلے میں اپنے دلوں میں ذرہ برابر تنگی و انقباض اور ناگواری محسوس نہیں کرتے..... انہوں نے تو ان مہاجرین کی مدینہ آمد سے قبل ہی ایمان بھی تیار کر رکھا تھا..... اور ان کیلئے ٹھکانہ بھی تیار کر رکھا تھا..... غرضیکہ انصارِ مدینہ نے اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے گھروں میں جگہ دی..... اپنے دلوں میں بسا یا، سر آنکھوں پر بٹھایا..... اپنا سب کچھ ان کے حوالے کر دیا..... ان کیلئے اپنے گھروں کے دروازے بھی کھول دیئے..... اور..... اپنے دلوں کے دروازے بھی کھول دیئے..... اور

ہمدردی وایثار کے ایسے نمونے پیش کئے کہ تاریخ عالم میں اس کی مثال نہیں مل سکے گی !!.....

☆.....النصار کے دلوں میں اپنے مہاجر بھائیوں کیلئے ایثار کا یہ بے مثال جذبہ اپنی جگہ لیکن حقیقت کی دنیا میں محض جذبات سے کام نہیں چلتا.....محض جذبات سے نہ کسی کا پیٹ بھر سکتا ہے.....اور نہ ہی گھروں کے چولھے جل سکتے ہیں.....اس چیز کیلئے تو حقیقت کو مدینہ نظر کھندا پڑتا ہے.....اور اس وقت حقیقت یہی تھی کہ النصار مدینہ بہت زیادہ خوش حال نہیں تھے.....ان کے مالی حالات ایسے نہیں تھے کہ ان پر مہاجرین کا اضافی بوجھ بھی ڈال دیا جائے.....یہی وہ حقیقت تھی جسے مدینہ نظر رکھتے ہوئے اُس موقع پر رسول ﷺ نے النصار پر بہت زیادہ بوجھ نہیں ڈالا..... بلکہ، بہت ہی ہلکی چکلکی سی ذمے داری ہر انصاری کو سونپی.....یعنی ہر ایک انصاری کے ذمے اپنے صرف ایک مہاجر بھائی کی ذمے داری۔ اور یوں آپ نے مہاجرین والنصار کے درمیان تاریخی ”رضیۃ مؤاخاة“ قائم فرمایا، یعنی ایک ایک انصاری کو ایک ایک مہاجر کا بھائی بنادیا..... یوں آپ نے مہاجرین والنصار کو ہمیشہ کیلئے اس بے مثال اُخوت کے رشتے میں پروردیا۔

☆.....اس تاریخی موقع پر جہاں انصار کا اپنے مہاجر بھائیوں کیلئے جذبہ ہمدردی وایثار قابل ذکر ہے.....وہیں مہاجرین کا یہ اعلیٰ ترین اخلاق، ان کے دلوں میں یہ احساس، اور ان کا یہ جذبہ بھی آب زر سے لکھ جانے کے قابل ہے کہ انہوں نے انصار کی اس خوش اخلاقی اور شرافت سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی کہ بس ہمیشہ کیلئے ”مفت خورے“ بن کر..... اور انصار پر بارگراں بن کر..... اسی طرح انہی کے گھروں میں بیٹھے رہتے ایسا کرنے کی بجائے حضرات مہاجرین نے ”مؤاخاة“ کے اس رشتے میں بندھنے کے بعد

اپنے انصاری بھائیوں کا دل و جان سے شکر یہ ادا کیا..... اور پھر فوراً ہی رزق حلال کیلئے تلاش جستجو اور جدوجہد میں مشغول منہمک ہو گئے..... ان میں سے ہر کوئی جلد از جلد خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوششوں میں لگ گیا..... یوں شب و روز کی مسلسل محنت و مشقت اور تگ و دو کے نتیجے میں وہ سب اپنا بوجھ خود اٹھانے کے قابل ہو گئے..... !!

☆..... یہاں یہ بات بھی قبلی ذکر ہے کہ مدینہ میں اوس و خرزج و دیگر قبائل سالاہ سال سے باہم بسر پیکارتے، ان میں نسل درسل خوزیریوں کا اور تباہ کاریوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چلا آ رہا تھا..... ان کی باہم دشمنی ضرب المثل تھی.....

لیکن اب کلمہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ پر ایمان کی بدولت..... ان کی صورت حال یکسر بدل گئی..... پہلے جن کی دشمنی ضرب المثل تھی..... اب ان کا ”ایثار“ ہمیشہ کیلئے ضرب المثل بن گیا..... پہلے ایک ہی شہر (مدینہ) کے باشندے ہونے کے باوجود وہ آپس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاس سے تھے..... لیکن اب مسلمان ہو جانے کے بعد نہ صرف یہ کہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے..... بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ بہت دور دراز..... یعنی مکہ سے آئے ہوئے مہاجرین کے ساتھ بھی وہ اخوت و محبت کے ایسے بے مثال اور لازوال رشتہ میں بندھ گئے کہ انسانی تاریخ میں شاید ایسی کوئی اور مثال نہیں مل سکے گی۔ یقیناً یہ ”اللہ پر سچے اور حقیقی ایمان“ ہی کا کرشمہ تھا، اور یہ چیز آج تمام امت مسلمہ کو ”عوت غور و فکر“ دے رہی ہے۔

☆..... بیثاق مدینہ:

مدنی زندگی کے آغاز میں تیرسا جو فوری اور اہم ترین اقدام کیا گیا وہ ”بیثاق مدینہ“ کے نام سے معروف معاہدہ تھا جو رسول ﷺ نے اُس وقت وہاں موجود دیگر اقوام، خصوصاً یہود کے ساتھ کیا، یہ معاہدہ دولتِ اسلامیہ کے قیام کی طرف پیش قدمی کے سلسلے میں اہم

ترین اقدام کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس معاهدے میں تمام شرکاے معاهدہ کے حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا اور اس سے متعلق تمام تفصیلات طے کی گئیں، گویا یہ معاهدہ بنیادی دستور کی حیثیت رکھتا تھا۔

نیز اس معاهدے میں یہ بھی طے کیا گیا کہ تمام شرکاے معاهدہ باہم مل جل کر رہیں گے، ایک دوسرے کا مکمل احترام کریں گے، ایک دوسرے کیلئے ہمیشہ نیک نیتی، خلوص اور خیر سکالی کا اظہار کریں گے، آپس میں ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی کوئی سارش نہیں کریں گے، ایک دوسرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

یہی وجہ تھی کہ اس معاهدے کو ”معاہدة صلح“، ”نیز“ ”معاہدة عدم جارحیت“ کے نام سے بھی تاریخ میں یاد کیا جاتا ہے۔

نیز یہ بھی طے کیا گیا کہ کسی بھی بیرونی دشمن کی طرف سے حملے کی صورت میں تمام شرکاے معاهدہ مشترک طور پر دفاع کریں گے۔

مدنی زندگی کے آغاز اور دولتِ اسلامیہ کے قیام کے بالکل ابتدائی دنوں میں ہی رسول اللہ ﷺ نے اس معاهدے کے ذریعے مدینہ میں موجود دیگر تمام اقوام کیلئے اپنی طرف سے نیک نیتی اور خیر سکالی کا اظہار فرمایا، نیز تمام دنیا کو روزِ اول سے ہی یہ پیغام دے دیا کہ دینِ اسلام مل جل کر رہے کا سبق سکھاتا ہے، دینِ اسلام بقائے باہمی، تحمل، برداشت، اور رواداری کی تاکید و تلقین کرتا ہے.....

رسول ﷺ نے اس معاهدے کے ذریعے روزِ اول سے ہی دیگر تمام اقوام کے ساتھ مل جل کر رہنے کے اس اصول کو اپناتے ہوئے نئے دور کا آغاز فرمایا.....

لیکن دوسری طرف نیک نیتی، یا خیر سکالی کے جذبات کا کوئی نام و نشان تک نظر نہیں آتا تھا،

بلکہ وہاں تو مسلسل خفیہ سازشوں کا ایک لائقاً ہی سلسلہ تھا..... جس نے مرودقت کے ساتھ رفتہ رفتہ بڑے فتنوں کی شکل اختیار کر لی۔



الحمد لله آج بتاریخ / ۱۲ / جمادی الاولی ۱۴۳۲ھ، مطابق ۲۲ مارچ ۲۰۱۳ء بروز التوار

یہ بابِ کامل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيم

مشرکین مکہ کے خلاف غزوات

کا مختصر تذکرہ اور تنقیدی جائزہ:

رسول ﷺ نے تو ”بقائے باہمی“ کے سہری اصول کو اپناتے ہوئے مدنی زندگی کے بالکل آغاز میں ہی ”یثاقِ مدینہ“ کے ذریعے وہاں آباد غیر مسلم اقوام کیلئے جذبہ خیر سگالی کا اطہار فرمایا، لیکن افسوس کہ دوسری طرف مسلمانوں کیلئے کوئی خیر سگالی نہیں تھی، بلکہ وہاں تو شہب و روز مسلمانوں کے خلاف نفرتوں اور سازشوں کے تانے بانے بنے جا رہے تھے، اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ افسوس ناک اور قیچی ترین کردار ”ریس المنافقین عبد اللہ بن ابی“ کا تھا۔

انہی نامساعد حالات میں مزید پریشانی یہ کھڑی ہو گئی کہ رسول ﷺ کو باوثق ذراع سے یہ اطلاع ملی کہ اُدھر مکہ میں مشرکین بھی مسلسل مسلمانوں کے خلاف جلد از جلد کوئی فیصلہ کن اقدام کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کیلئے زورو شور کے ساتھ منصوبہ بندی کی جارہی ہے، کیونکہ مشرکین کو یہ بات ہرگز گوار نہیں تھی کہ مسلمان ان کے شکنخ سے نکلنے کے بعد اب مدینہ میں جا کر سکون و اطمینان کی زندگی بس رکریں، وہاں پہلتے پھولتے رہیں اور ان کی قوت لاحق تھی کہ جس پر سفر کرتے ہوئے ان کے تجارتی قافلے مکہ سے ملک شام آتے جاتے تھے، اور وہ شاہراہ مدینہ کے قریب سے گذرتی تھی۔

ایسی ہی صورت حال میں ایک روز مشرکین مکہ کے چند سرداروں کی طرف سے مدینہ میں ”ریس المنافقین عبد اللہ بن ابی“ کو ایک خط موصول ہوا، جس میں مشرکین مکہ کی طرف سے

اسے خبردار کرتے ہوئے یہ تحریر کیا گیا تھا کہ ”ہم یہ بات ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی ہمارے شہر مکہ سے نکلنے کے بعد اب تمہارے شہر مدینہ میں چیز و سکون کی زندگی بسر کریں اور پھلتے پھولتے رہیں..... لہذا تم سے ہمارا یہ پرواز و مطالبه ہے کہ تم ان مسلمانوں کو جلد از جلد اپنے شہر سے نکال باہر کرو..... اور اگر تم نے ہماری اس ہدایت پر عمل نہ کیا تو یاد رکھو..... ہم بہت جلد تمہارے شہر پر تباہ کن حملہ کریں گے..... اور تب صرف مسلمانوں کوہی نہیں..... ان کے ساتھ ساتھ تم سب کوہی ہم مدینہ سے نکال باہر کریں گے۔“

اس خط میں مشرکین مکہ کی طرف سے مدینہ میں موجود متناقین و یہود کو ظاہراً اگرچہ ”دھمکی“ دی گئی تھی..... لیکن درحقیقت یہ ان کیلئے ”دھمکی“ نہیں بلکہ بہت بڑی خوشخبری تھی کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ و دیگر مسلمانوں کی مدینہ آمد سے انتہائی نالاں اور ناخوش تھے، اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ لوگ مدینہ سے نکل جائیں..... اور پھر ہمارے وہی پرانے دن لوٹ آئیں..... اور اس مقصد کیلئے ان کی دلی خواہش تھی کہ کاش انہیں کسی بڑی قوت کی پشت پناہی حاصل ہو سکے۔

لہذا ب مشرکین مکہ کی طرف سے جب انہیں یہ دھمکی موصول ہوئی تو انہوں نے اسے دھمکی کی بجائے اپنے لئے بہت بڑی خوشخبری سمجھا..... اور اب مسلمانوں کے خلاف یہ اندر و فی و شمن اور بیرونی دشمن دونوں متحد اور یکجا ہو گئے، اور پھر ان بد لے ہوئے حالات میں مسلسل ایسے ٹھوس ثبوت، پے در پے شواہد و دلائل اور آثار و قرآن نظر آتے رہے جن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو مکمل یقین ہو گیا کہ یہ اندر و فی و بیرونی دشمن مل کر کسی بھی وقت مسلمانوں کیلئے کوئی بڑی مشکل پیدا کر سکتے ہیں، نیز یہ کہ اس گھن جوڑ کے نتیجہ میں مشرکین مکہ کسی بھی

وقت مدینہ پر کوئی بڑا اور اچاک حملہ کر سکتے ہیں۔

ایسی صورت حال میں رسول ﷺ نے بھی اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد کسی بھی مشکل کا سامنا کرنے کیلئے تیاریاں شروع کر دیں..... اور آپ ﷺ و دیگر تمام مسلمان ڈنی طور پر اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اپنی حفاظت و سلامتی کیلئے جو کچھ بن بڑے گا وہ ضرور کریں گے..... خواہ اس مقصد کیلئے تھیماراٹھانابڑیں..... یامیدان میں نکل کر باقاعدہ جنگ لڑنی پڑے.....!

غزوہ بدر:

چنانچہ ایسے ہی حالات میں ہجرت کے بعد دوسرے ہی سال مشرکین مکہ کا ایک لشکر جو کہ ہر قسم کے سامانِ حرب و ضرب سے مسلح تھا، مسلمانوں پر حملے کی غرض سے مدینہ کی جانب روانہ ہوا، رمضان کے مبارک مہینے میں مدینہ شہر سے کچھ فاصلے پر واقع ”بدر“ نامی مقام پر مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان یہ بھی باقاعدہ جنگ تھی، عجب کیفیت تھی، ایک طرف ایک ہزار آزمودہ کا رجنگ بوجو..... سامانِ جنگ کی بہتات..... جبکہ دوسرا طرف محض مٹھی بھر..... تین سوتیرہ افراد..... جنہیں سامانِ جنگ کی شدید قلت کا سامنا تھا..... اس مختصر سی بے سروسامان جماعت کو کسی صورت ”فوج“ نہیں کہا جا سکتا تھا.....!

لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو ”ساز و سامان“ اور ”کثرتِ تعداد“ کی بجائے مسلمانوں کا اپنے اللہ پر خالص ایمان، سچا توکل، اور جذبہ سرفوشی کام آیا..... چنانچہ انہوں نے انتہائی شجاعت و بہادری اور ثابت قدی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا..... جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرکین مکہ کے پاؤں اکھڑ گئے..... ان کے متعدد بڑے بڑے سردار اور نامی گرامی قسم کے

شہسوار اس جنگ میں مارے گئے، اور وہ بہت زیادہ جانی و مالی نقصان اٹھانے کے بعد مدیان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

یوں مسلمانوں کے حق میں اس جنگ کا بہت ہی اچھا نتیجہ برآمد ہوا، جبکہ مشرکین مکہ کی صفوں میں صفتِ ماتم بچھ گئی..... اور وہ بدترین شکست و ہزیبت اور ذلت و رسولی کا داغ لئے ہوئے وہاں سے واپس مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔

غزوہ اُحد:

مٹھی بھر مسلمانوں کے ہاتھوں اس بدترین شکست اور ذلت و رسولی کی وجہ سے مشرکین مکہ کے دلوں میں چونکہ انتقام کے شعلے خوب بھڑک رہے تھے..... اس لئے ان سے زیادہ عرصہ صبر نہ ہوسکا..... اور اگلے ہی سال پہلے سے بہت زیادہ تیاری اور جوش و خروش کے ساتھ وہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے کی غرض سے مدینہ کی جانب روانہ ہوئے..... بھرت کے تیسرے سال شوال کے مہینے میں مدینہ شہر کے مضامات میں واقع ”اُحد“ نامی مشہور و معروف پہاڑ کے دامن میں یہ دوسری جنگ لڑی گئی، اس موقع پر دشمن کی تعداد تین ہزار تھی جبکہ ان کے مقابلے میں مسلمان صرف سات سو تھے..... لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے اللہ پر توکل کرتے ہوئے بہادری کے ایسے جو ہر دھماکے کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے..... اور یوں گویا مسلمانوں کی فتح یقینی ہو گئی..... لیکن وہ ”تیرانداز“ جنہیں رسول اللہ ﷺ نے ایک پہاڑی راستے پر مقرر فرمایا تھا، انہوں نے جب دیکھا کہ دشمن شکست کھا کر بھاگ رہا ہے..... تو وہ اپنی جگہ سے اتر آئے..... اُدھر بھاگتے ہوئے دشمن نے جب یہ منظر دیکھا تو موقع غنیمت جانتے ہوئے پلٹ کر مسلمانوں پر عقب سے پوری قوت کے ساتھ حملہ کر دیا

اور یوں صورتِ حال یکسر بدل کر رہ گئی..... جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو شدید پریشانی کا اور بڑے تقصیان کا سامنا کرنا پڑا.....

البته ”احد“ کے موقع پر مسلمانوں کی یہ ”بھول“ انہیں ہمیشہ کیلئے یہنا قابل فراموش ”سبق“ سکھائی گئی کہ انہیں ہر حال میں اللہ اور رسول ﷺ کے ہر حکم کی تعمیل کرنا چاہئے ورنہ نتیجہ ایسا ہی برآمد ہو گا.....!

غزوہ خندق:

اسی طرح ہجرت کے پانچویں سال پیش آنے والے ”غزوہ خندق“ (جسے ”احزاب“ بھی کہا جاتا ہے) کے موقع پر صورتِ حال یہ ہوئی کہ ”غزوہ احد“ کے محض دو سال بعد مشرکین مکہ دوبارہ آئے، اور اس بار مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا پختہ عزم لے کر آئے، اس موقع پر ان کی تعداد دس ہزار تھی، رسول ﷺ نے حفاظتی تدابیر کے سلسلے میں اپنے صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا، آخر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے پر مدینہ شہر کے اطراف میں کافی وسیع و عریض اور گہری خندق کھودی گئی، اس مشکل ترین اور انتہائی پُر مشقت کام میں آپ ﷺ بنفسِ نفس اپنے جان شار사 تھیوں کے شانہ بثانہ شرکیک رہے، بلکہ پیش پیش رہے۔

مشرکین کا شکر جب وہاں پہنچا تو ”خندق“ کو دیکھ کروہ جیرت زدہ رہ گئے، اور لاکھ کو شش کے باوجود وہ اسے پار نہ کر سکے، بس خندق کے اُس پار سے ہی تیروں کی بارش بر ساتے رہے، اور مدینہ شہر کا محاصرہ کر کے بیٹھ گئے۔ اس جان لیوا محاصرے نے جب طول پکڑا تو مدینہ شہر کے اندر اشیائے خور دنوں کی شدید قلت ہونے لگی۔ مسلمانوں کو جب بھوک اور

پیاس ستائی تو اس تکلیف کی شدت کو مکہ کرنے کیلئے پیٹ پر پھر باندھ لیتے.....تاکہ بھوک کی یہ شدت ان کے عزم و استقلال کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے.....اور یونہی شب وروز گذرتے رہے۔

آخر ایک رات بہت تیز آندھی آئی، طوفانی جھکڑ پوری طاقت سے چلنے لگے، بخت سردی کا موسم تھا، اوپر سے ایسی سیاہ اور بھیا نک رات.....اور پھر تیز رفتار آندھی اور گرد و غبار کا ایسا خوفناک طوفان آیا.....کہ.....ان کے خیمے اکھڑ گئے، برتن الٹ گئے، کھانے پینے کا تمام سامان ریت میں مل گیا، خالی برتن ہوا میں اڑاڑ کر ان کے سروں سے ٹکرانے اور انہیں زخم کرنے لگے.....گھوڑے اور اونٹ بدحواس ہو کر.....اور رسیاں تراکر سر پٹ ادھر ادھر دوڑنے لگے.....اور انہیں پاؤں تلے کھلنے لگے.....بالآخر اس بلائے ناگہانی سے گھبرا کروہ سب وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے.....جب صحیح کی روشنی پھیلی تو مسلمانوں نے اپنے سامنے صاف میدان دیکھا.....شمنوں کا دور دور تک کوئی نام و نشان نظر نہ آیا.....یہی وہ کیفیت ہے جس کا قرآن کریم میں سورۃ الاحزاب میں تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔

قیمتی ترین سبق:

رسول ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران جتنے غزوات پیش آئے.....ان سب میں ہمیں جو میدانی صورتِ حالاور پھر جو نتیجہ نظر آتا ہے.....اس میں ہمیشہ کیلئے یہ انتہائی قیمتی ترین سبق اور پیغام پوشیدہ ہے کہ کسی بھی جنگ میں فتح یا نشاست کا دار و مدار تعداد کی کثرت یا قلت پر نہیں ہے.....نہ ہی اس چیز کا تعلق سامانِ جنگ کی کثرت یا قلت سے ہے.....اگرچہ ان چیزوں کی بھی اپنی جگہ یقیناً بڑی اہمیت ہے، کیونکہ اسباب وسائل کو اختیار کرنا

ضروری ہے..... لیکن فتح اور کامیابی کا اصل دار و مدار اس بات پر ہے کہ ”نیت خالص ہو، اور جذبہ صادق ہو“ کیونکہ میدان کارزار میں ہتھیار توٹ سکتے ہیں..... لیکن جذبہ اگر سچا ہو تو وہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا.....!!

اسلام بزویر شمشیر نہیں پھیلا:

”غزوات“ کے تذکرے کے موقع پر یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ بہت سے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ”اسلام بزویر شمشیر پھیلا ہے..... اور یہ کہ رسول ﷺ نے خوب توار چلا چلا کر..... لوگوں کو ڈراؤ را کر..... زبردستی مسلمان بنایا.....“

بیمار ذہنیت رکھنے والے ان افراد کا یہ دعویٰ سراسر غلط اور باطل ہے، ان کی یہ بات مکمل طور پر بے بنیاد اور حقائق کے منافی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول ﷺ نے اسلام توار کی نوک سے نہیں پھلایا..... بلکہ اسلام تو آپؐ کے حسن اخلاق، بلند کردار اور آپؐ کی مسلسل دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں پھیلا ہے..... اسلام دین رحمت ہے، اسلام امن و امان کا دین ہے، اسلام سلامتی کا دین ہے، اسلام ہر انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا حکم دیتا ہے، انسانی خون کی جتنی قدر و قیمت اور حرمت و عظمت دین اسلام میں ہے اس کی مثال شاید کہیں اور نہیں مل سکے گی۔

قرآن کریم میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ: ﴿.....أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَانَمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَ مَنْ أَحْيَاهَا فَكَانَمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا.....﴾ (۱) ترجمہ: (..... جو شخص کسی کو بغیر اس کے کروہ قاتل ہو ز میں میں فساد برپا کرنے والا ہو، قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا، اور جو

شخص کسی ایک کی جان بچالے اس نے گویا تمام لوگوں کو زندہ کر دیا.....)

یعنی قرآن کریم میں اس ارشادِ بانی کی رو سے ایک انسان کا ناجنح خون کر دینے والا شخص تمام انسانیت کا قاتل ہے، جبکہ جس کسی نے محض کسی ایک انسان کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانیت کو بچالیا..... گویا وہ تمام انسانیت کا حسن ہے اور نجات دہنده ہے.....!

اسی طرح قرآن کریم میں اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جس مشہور و معروف اور انہائی جامع و مفصل دعاء کا تذکرہ ہے، اس میں یہی کیفیت نظر آتی ہے کہ انہوں نے اس دعاء میں سب سے پہلے اللہ سے امن و امان کی نعمت کا سوال کیا، جیسا کہ ارشادِ بانی ہے: ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا﴾ (۱) ترجمہ: (اور جب ابراہیم نے کہا کہ: اے میرے رب! تو بنا دے اس شہر کو امن کی جگہ)

اور پھر اس کے بعد آگے چل کر اسی دعاء میں اللہ سے اپنے لئے نیزاپنی ذریت اور اہل و عیال کیلئے عقیدہ و ایمان کی سلامتی کا سوال کیا، اس کے بعد نماز کی توفیق کا سوال کیا..... اور پھر رزق کی فراوانی اور خوشحالی مانگی۔

لہذا اس دعاء میں جو ترتیب وارد ہوتی ہے، اس سے یہی بات واضح و ثابت ہوتی ہے کہ امن و امان اور سلامتی و عافیت اس قدر اہم چیز ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اللہ سے اسی چیز کا سوال کیا..... اور اس کے بعد باقی چیزیں مانگیں..... یقیناً جب امن و امان کی نعمت نصیب ہوگی، انسان کی جان و مال محفوظ ہوگی، تبھی تو انسان اللہ کی عبادت کا فریضہ نجاح دینے کے قابل ہو سکے گا، جان و مال محفوظ ہوگی تبھی تو انسان مسجد جا سکے گا، اور تبھی نجح بیت اللہ کیلئے سفر ممکن ہوگا، اور تبھی تو انسان اپنے لئے اور اپنے اہل و عیال کیلئے

(۱) ابراہیم [۳۵]

رزق حلال کی تلاش میں گھر سے نکل سکے گا، محنت مشقت کر سکے گا..... یہ ہے دین اسلام کی تعلیم، اور یہی چیز رسول ﷺ کی سیرت مبارکہ میں بھی واضح نظر آتی ہے۔
ہاں البتہ جب مخالفین اور دشمنوں کی طرف سے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے، معاملہ حد سے تجاوز کر گیا، زبردستی جنگ مسلط کردی گئی..... تب رسول ﷺ نے بھی اپنی حفاظت اور دفاع کی خاطر جو راستہ مناسب سمجھا وہ اختیار کیا۔

☆☆ اس سلسلے میں بہت بڑا ثبوت یہی ہے کہ دشمنوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی سب سے پہلے جس آیت میں اجازت دی گئی اس انداز ہی کچھ اس طرح ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿أَذْنَ لِلَّٰهِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا وَ إِنَّ اللَّٰهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّٰهُ﴾ (۱)
ترجمہ: (جن کے خلاف جنگ لڑی جا رہی ہے انہیں مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے،
کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے، بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے، یہ وہ ہیں جنہیں ناقہ ان
کے گھروں سے نکال دیا گیا، محض اس وجہ سے کہ انہوں نے یوں کہا کہ ”ہمارا رب صرف اللہ
ہے۔“)

اس آیت کے مفہوم سے اور اس کے انداز سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مخالفین کی طرف سے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کی ظلم و زیادتی، جبرا اور سفا کی کا سلسلہ پہلے سے بلکہ دین اسلام کے ظہور کے بعد روز اول سے ہی چلا آ رہا تھا..... اور اسی کیفیت میں طویل عرصہ گذر گیا..... بلکہ پورا کمی دور گذر گیا..... اور اب بھرت کے بعد مسلمانوں کی مدینہ منتقلی کے باوجود یہ مخالفین اپنی حرکتوں سے اور ظلم و زیادتی کے اس سلسلے سے بازنہ آئے..... تب

جا کر اس آیت میں مخالفین اور دشمنوں کے خلاف مظلوم مسلمانوں کو اپنی حفاظت اور اپنے دفاع کی خاطر مسلح جدوجہد کی اجازت دی گئی۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مشرکین مکہ کے خلاف جن غزوتوں کی نوبت آئی ان میں سے مشہور و معروف اور اہم ترین غزوتوں ”بدر“، ”احد“ اور ”خندق“، (جسے احباب بھی کہا جاتا ہے) ہیں۔ ان جنگوں کے ناموں سے ہی یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ مشرکین مکہ اپنی پرانی فطرت اور اسلام دشمنی کے ہاتھوں مجبور ہو کر مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے اور انہیں صفحہ رہستی سے ہمیشہ کیلئے مٹا دینے کے جنون میں خود مکہ سے سفر کر کے مدینہ پہنچ..... کیونکہ یہ تمام مقامات مکہ میں نہیں ہیں، بلکہ مدینہ میں یا اُس کے مضافات میں واقع ہیں..... ”بدر“ مدینہ شہر سے کچھ فاصلے پر ہے، ”احد“ نامی پہاڑ تو مدینہ شہر سے بالکل متصل ہی ہے، جبکہ ”خندق“ کے آثار تو آج تک عین مدینہ شہر کے اندر ہی موجود ہیں۔

لہذا ان تمام غزوتوں کے نام ہی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ مشرکین مکہ اپنے شہر سے سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچتے تھے، اور یوں یہ جنگیں مسلمانوں پر مسلط کی گئی تھیں..... نہ یہ کہ مسلمان خود لڑنے کیلئے مدینہ سے مکہ جا پہنچ..... اور وہاں جا کر مشرکین مکہ کو لولا کارا..... اور ان بے چاروں کوٹل نے پر مجبور کر ڈالا.....!

کچھ جنگیں مشرکین مکہ کے سواد گیر مشرکین عرب کے خلاف لڑی گئیں، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ مشرک قبائل کسی نہ کسی شکل میں مسلمانوں کے خلاف جاریت، اشتعال اور فتنہ و فساد پھیلانے میں مشغول تھے، لہذا ان کی اس شرارت کے جواب میں ان کی سرکوبی ضروری تھی گئی۔

☆ مشرکین مکہ کے سوادگر مشرکین کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں میں ”خروہ حنین“ سب سے اہم اور مشہور جنگ تھی، اس کا پس منظر بھی یہی تھا کہ فتح مکہ کے فوری بعد طائف اور اس کے مضادات میں آباد بہت ہی مشہور اور طاقتور قسم کے قبائل ”ہوازن“ اور ”شیف“ وغیرہ..... مسلمانوں کو جڑ سے اکھڑ پھینکنے کی حسرت دل میں لئے ہوئے بہت بڑے لشکر جرار کے ساتھ طائف سے مکہ کی طرف پیش قدی کر رہے تھے۔ رسول ﷺ کو مکہ میں جب یہ خبر ملی تو آپؐ نے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھ رہنے کی بجائے اپنا دفاع ضروری سمجھا، اور اس مقصد کیلئے مکہ سے ان کی جانب روانگی کا فیصلہ فرمایا..... اور تب مکہ اور طائف کے درمیان ”حنین“ نامی مقام پر یہ بہت ہی خطرناک اور تاریخی جنگ لڑی گئی، لہذا اس موقع پر بھی جارحیت کی ابتداء مشرکین کی طرف سے ہوئی تھی، نہ کہ مسلمانوں کی طرف سے۔

☆ چند غزوات مدینہ شہر میں، نیز خیبر نامی شہر میں آباد یہودیوں کے خلاف لڑے گئے، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ بظاہر صلح اور عدم جارحیت کے معاهدات کر رکھے تھے، مگر درپرداہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف ورغلاتے پھیلانے میں ہی مصروف رہے، بار بار مکہ جا کر مشرکین مکہ کو مسلمانوں کے خلاف ورغلاتے اور اس کساتھ رہے..... انہیں مسلمانوں پر لشکر کشی کی ترغیب دیتے رہے اور اس مقصد کیلئے انہیں اپنی مکمل حمایت اور ہر قسم کے خفیہ تعاون کا یقین دلاتے رہے۔

لیکن ان کی ان شر انگیزیوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی طرف سے کبھی باقاعدہ ان کے خلاف کوئی لشکر کشی نہیں کی گئی..... البتہ انہیں بار بار تنبیہ کی گئی..... لیکن جب سب کچھ لاحصل رہا تو آخر ان سے شہر مدینہ سے کوچ کر جانے کا مطالبہ کیا گیا، اور اس موقع پر بھی کسی اکادمکا معمولی جھڑپ کے سواباقا عده کسی جنگ یا عام یلغار کی نوبت نہیں آئی، اور

پھر مزید یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے مدینہ سے اخلاع کے اس مطالبے پر یہ تمام یہودی نہایت آرام واطمینان کے ساتھ وہاں سے خبر کی جانب روانہ ہوئے، اپنا تاما متر ساز وسماں حتیٰ کہ اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں تک اکھاڑ کر اونٹوں پر لاد کر اپنے ہمراہ لے گئے کسی نے انہیں روکا نہیں کسی نے انہیں ٹوکا نہیں (۱)

☆ غزوہ تبوک، نیز غزوہ موتہ سلطنتِ روم کے خلاف اڑے گئے، جسے اُس دور میں تمام روئے زمین کی عظیم ترین قوت تصور کیا جاتا تھا، اور ان غزوتوں کی وجہ بھی یہی تھی کہ سرحدی علاقوں پر رومی افواج کا بکثرت اجتماع، نیز مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیزیوں کے سلسلے، اور بالخصوص رسول ﷺ کے قاصد حارث بن عمیر الأزدي رضی اللہ عنہ کو بغیر کسی صور کے حاکمِ موتہ کے حکم پر رسیوں سے جکڑ کر انہتائی بیدردی کے ساتھ قتل کر دینا جو کہ سفارتی آداب کی کھلی خلاف ورزی، نیز اخلاقی اقدار کی بہت بڑی پامالی تھی اور جو کہ یقیناً انہتائی سگین جرم تھا یہ وہ تمام اسباب تھے جن کی وجہ سے رومیوں کے خلاف ان غزوتوں کی نوبت آئی۔

☆ غرضیکہ یہ تمام غزوتوں خواہ مشرکین مکہ کے خلاف ہوں، یا دیگر مشرک قبائل کے خلاف، یا یہود مدینہ اور پھر یہود خبر کے خلاف، یا سلطنتِ روم کے خلاف ان میں سے ہر غزوہ خود دشمنوں کی طرف سے شر انگیزی و زیادتی کے نتیجے میں پیش آیا، جس کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنی حفاظت کی خاطر مناسب جوابی کارروائیاں کیں۔

اور پھر ایسی صورت حال میں بھی مسلمانوں کے ہر شکر کی روانگی کے موقع پر ”رحمۃ للعالمین“، رسول اکرم ﷺ نے ہمیشہ مسلمانوں کو تلقین فرمائی کہ: ”اللہ سے ڈرتے رہنا، کسی بے گناہ

(۱) مدینہ سے یہود کے اخلاع کے بارے میں مزید تفصیل کیلئے سورہ الحشر کی تفسیر کا مطالعہ کیا جائے۔

کاخون نہ بہانا، کمزوروں، عورتوں، اور بچوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا، کوئی لوٹ مارنے مچانا، سایہ دار درخت نہ کاٹنا، کسی عبادت گاہ کو نقصان نہ پہنچانا۔“

اسی بارے میں قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے شدید الفاظ میں تاکید کی گئی:

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِلِينَ﴾ (۱) یعنی: ”تم اڑواللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، بیشکل اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔“

غرضیکہ کوئی بھی انصاف پسند انسان اس ناقابل انکار حقيقةت کو قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ رسول ﷺ نے دین اسلام توارکے زور سے نہیں پھیلایا..... بلکہ کچی بات یہ ہے کہ دشمنوں نے ہمیشہ ہر دور میں توارکے زور سے دین اسلام کا راستہ روکنے کی سر توڑ کوشش کی۔ مگر..... دین اسلام توارکے مقابلے میں ہمیشہ پھلتا پھولتا ہی رہا.....!!

(۱) البقرة [۱۹۰]

الحمد لله آج بتاریخ ۸ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ، مطابق ۱۸ مئی ۲۰۱۳ء بروز ہفتہ

یہ باب کمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ

صلح حدیثیہ:

مدنی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز:

نبوت کے تیر ہویں سال جب بھرت کا حکم نازل ہوا تھا، تو اس حکم کی تغییل میں رسول اللہ ﷺ نے زید میگر تمام مسلمان اپنے آبائی شہر مکہ کو چھوڑ کر ایک نئی منزل یعنی مدینہ کی جانب بھرت کر گئے تھے، مدنی زندگی کی زندگی سے بہت مختلف اور بہت بہتر تھی، کیونکہ یہاں مدینہ میں مشرکین کم نہیں تھے، نہ ہی ان کی طرف سے وہ تنخیوں اور ایذا اور سانیوں کے سلسلے تھے..... نہ ہی وہ خوف اور دہشت کی فضاء تھی..... بلکہ یہاں تو انصار مدینہ کی طرف سے ملنے والی محبتیں اور عنایتیں تھیں، جنہوں نے مکہ سے آئے ہوئے اپنے ان بے سر و سامان بھائیوں پر اپنا سمجھی کچھ چھاؤ کر دیا تھا..... انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا تھا..... ان کیلئے اپنے گھروں کے بھی اور اپنے دلوں کے بھی دروازے کھول دیئے تھے.....!

لیکن اس سب کچھ کے باوجود اپنے آبائی وطن کی محبت اور اس کیلئے دل میں کشش اور رڑپ انسان کی فطرت کا حصہ ہے..... جس گھر میں انسان نے آنکھ کھولی ہو..... ہوش سنپھالا ہو..... جس گھر کے آنکھن میں ”ماں کے آنچل کی خوبیوں“ رپی بی ہو..... اس گھر کو انسان مرتے دم تک کبھی فراموش نہیں کر سکتا..... لہذا مدینہ میں ہر طرح کے آرام واطمینان کے باوجود مکہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کو اپنے آبائی شہر کی یادستانی تھی۔

اور پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہاں مکہ میں ”بیت اللہ“ تھا، جس کی زیارت اور دیدار کیلئے

رسول ﷺ و دیگر اہل ایمان بیتاب و میقرار ہتے تھے۔

مسلمانوں کے دلوں میں بیت اللہ کیلئے اور اپنے آبائی شہر مکہ کیلئے یہ فطری ترپ تو یقیناً موجود تھی، البتہ مجموعی طور پر وہ اب یہاں مدینہ میں پر سکون اور خوشنگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔

لیکن ان کی یہی خوشنگوار زندگی مشرکین مکہ سے برداشت نہیں ہوئی اور وہ مسلمانوں کو نہیں تھا
ونابود کر دینے کی غرض سے وقتاً فوتاً لشکر کشی کرتے رہے..... جس کے نتیجے میں غزوہ
بدرا اور پھر غزوہ احمد کی نوبت آئی..... اور یوں مسلح جدوجہد کا ایک سلسلہ چل نکلا تھا۔

البتہ اب غزوہ خدق کے موقع پر مشرکین مکہ کی اتنے بڑے پیانے پر پسپائی کے نتیجے میں
جب رسول ﷺ کو ان کی طرف سے ایک حد تک بے فکری نصیب ہوئی تو آپؐ کے
قلب مبارک میں عمرہ کی ادائیگی اور بیت اللہ کی زیارت کی خواہش پیدا ہوئی، انہی دنوں
آپؐ نے ایک خواب بھی دیکھا، جس میں کچھ ایسا منظر تھا کہ آپؐ اپنے صحابہؓ کرام کے ہمراہ
بیت اللہ کے طواف میں مشغول ہیں، ظاہر ہے کہ یہ خواب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے
اپنے حبیب ﷺ و دیگر اہلی ایمان کیلئے بہت بڑی بشارت تھی اور غیری اشارہ تھا۔ (۱)

چنانچہ ۶ بھری میں رسول ﷺ اپنے چودہ سو جال شاروں کے ہمراہ عمرے کی ادائیگی
کی غرض سے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہوئے، اس موقع پر ان سبھی حضرات

(۱) قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ أَمْنِينَ.....﴾ یعنی ”یقیناً اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا کہ ان شاء اللہ تم یقیناً پورے امن
وامان کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہو گے..... (سورہ لفظ / ۲۷)

رسول ﷺ نے مسلمانوں نے اس خواب کو بشارت عظیمہ سمجھا، کیونکہ نبی کا خواب بمنزلہ وہی ہوتا ہے،
اگرچہ اس خواب میں یقین نہیں کی گئی تھی کہ امن و امان کے ساتھ یہ عمرہ اسی سال ہو گیا آئندہ سال..... لیکن
مسلمانوں نے اس خوبخبری کو سننے کے بعد فوری تیاری شروع کر دی اور پھر روانہ بھی ہو گئے۔

نے احرام باندھ رکھتے تھے، کیونکہ عمرے کی ادا یا مقصود تھی، مزید یہ کہ مشرکین مکہ پر بھی یہ بات تاکہ خوب واضح ہو جائے کہ مسلمان م Hispanus عمرے کی نیت سے مکہ آ رہے ہیں..... اور یہ کہ جنگ لڑنے کا ان کا قطعاً کوئی ارادا نہیں ہے۔

لیکن طویل سفر کے بعد جب یہ حضرات مکہ کے قریب "حدیبیہ" نامی مقام پر پہنچ گئے تو انہیں یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ مشرکین مکہ جنگ لڑنے بغیر کسی صورت مکہ میں داخلے کی اجازت نہیں دیں گے۔ (۱)

یہ خبر رسول ﷺ دیگر مسلمانوں کیلئے بڑی تشویش اور پریشانی کا باعث بنی، کیونکہ یہ حضرات تو محض بیت اللہ کی زیارت اور عمرے کی نیت سے آئے تھے، جنگ وجدال ان کا مقصود نہیں تھا، اور یہی وجہ تھی کہ وہ سب اس موقع پر غیر مسلح تھے اور حالتِ احرام میں تھے، اس موقع پر رسول ﷺ اور مشرکین مکہ کے ما بین اس سلسلے میں پیغامات کا تبادلہ بھی ہوتا رہا، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، تب مشرکین مکہ نے گفت وشنید کی غرض سے اپنا ایک باقاعدہ وفد مسلمانوں کے پاس بھیجا، لیکن گفت وشنید کے محض آغاز پر ہی یہ صورتِ حال پیش آئی کہ اس وفد کے سربراہ کے بارے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ رسول ﷺ کے ساتھ اس کا انداز تناطہ مناسب نہیں ہے، اس پر انہوں نے اسے ٹوکا اور تنبیہ کرتے کہا کہ رسول ﷺ کے ساتھ ادب اور تمیز سے گفتگو کرو، اس تنبیہ پر وہ سردار بگڑ گیا..... اور دونوں میں جھٹپٹ پ ہو گئی..... اور یوں یہ مذاکرات بھی ناکام ہو گئے اور وہ وفد واپس مکہ لوٹ گیا (۲)

(۱) "حدیبیہ" نامی یہ مشہور و معروف تاریخی مقام مکہ کرمہ سے نکلنے کے بعد جدہ کے راستے میں واقع ہے، آجکل یہ جگہ "شمیں" کے نام سے معروف ہے۔

(۲) قریش مکہ نے اس موقع پر اپنے سرداروں میں سے کسی کو رسول ﷺ کی طرف بھیجنے کی بجائے طائف

اس کے بعد رسول ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ مشرکین مکہ کے ساتھ مزید گفت و شنید کی غرض سے اپنے صحابہ میں سے کسی کو مکہ روانہ کیا جائے، اور غور و فکر کے بعد اس مقصد کیلئے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا گیا، چنانچہ رسول ﷺ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مکہ پہنچے، لیکن مشرکین مکہ نے ان کی کوئی بات سننے کی بجائے انہیں نظر بند کر دیا، مزید یہ کہ مسلمانوں کو نفیتی صدمہ پہنچانے کی غرض سے یہ افواہ پھیلا دی کہ ہم نے عثمان کو قتل کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ خبر رسول ﷺ کیلئے نیزاً آپؐ کے تمام جاں شارستھیوں کیلئے انتہائی تشویش ناک اور بڑے صد میں کا باعث تھی، لہذا آپؐ نے یہ افسوسناک خبر سننے کے بعد اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ”عثمان کے خون کا بدلہ لینا فرض ہے“ یہ ارشاد فرمانے کے بعد آپؐ وہاں ایک بول کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور وہاں موجود

(باتی از حاشیہ صحیہ گذشتہ)

سے آئے ہوئے اس سردار کو بیجا جس کا نام عروہ بن مسعود اتفاقی تھا، واضح ہو کہ اگرچہ اس موقع پر اس جھڑپ کی وجہ سے عروہ وابیس پل گئے تھے، لیکن رسول ﷺ کے ساتھ مختصی ملاقات ان کے دل میں بھیش کیلئے نقش ہو کر رہ گئی تھی اور وہ بہت زیادہ منتاثر ہوئے تھے، آخر دو سال بعد (من آٹھ بھری میں) غزوہ طائف کے موقع پر یہ مسلمان ہو گئے تھے اور جب قبول اسلام کے بعد انہوں نے اپنی قوم کو دین اسلام کی طرف دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تو ان کی قوم کو یہ بات پسند نہ آئی، اور ایک روز جب یہ کسی میلے پر چڑھے ہوئے نماز کیلئے اذان دے رہے تھے تو ان کی قوم سے رہانگی اور انہوں نے چاروں طرف سے ان پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی (حالانکہ یہ ان کے سردار تھے) جس کے نتیجے میں یہ شہید ہو گئے..... یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعد میں ان کی ایک صاحزادی ”ام سعید“ کا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکاح ہوا تھا، جن سے ان کی دو بیٹیاں تھیں ”ام حسن“ اور ”رملہ“۔

(ملاحظہ ہو: البدایہ والنهایہ۔ فصل فی ذکر زوجات و بنیہ و بنات۔۔۔۔۔ / ج: ۱۱۔ ص: ۲۲۔ طبعہ: دار مجرم)

اپنے تمام حجاجہ کرام سے ”جال ثاری“ کی بیعت لی۔ (۱)

اب مسلمان ڈھنی طور پر ”جگ“ کیلئے مکمل آمادہ ہو چکے تھے، اور ”جال ثاری“ کی بیعت بھی کر چکے تھے، اور اب ان کے جذبات عروج پر تھے۔

مشرکین مکنے اب مسلمانوں کے یہ بدے ہوئے تیور دیکھیے اور یہ ناقابل تنسیخ جذبہ اور زبردست قسم کا جوش و خروش دیکھا..... تو وہ مرعوب اور خوفزدہ ہو گئے، اور نہ صرف یہ کہ اب انہوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو رہا کر دیا بلکہ مزید یہ کہ اب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ”صلح“ کا پیغام بھی بھجوایا..... آپ نے ہمیشہ کی طرح اب بھی ”صلح پسندی“ کا شہوت دیتے ہوئے اس پیغام کو قبول فرمایا۔

گفت وشنید کا آغاز ہوا، مشرکین مکنے اس موقع پر تمام شرائط اپنی پسند کی پیش کیں، جن میں ان کا خالص مفاد تھا..... جبکہ مسلمانوں کیلئے انہیں قبول کرنے میں سراسر نقصان تھا..... لہذا یہ شرائط تمام مسلمانوں کیلئے ناقابل قبول تھیں۔

خصوصاً یہ کہ سب سے پہلی شرط انہوں نے پیش کی کہ اس سال مسلمان عمرہ کئے بغیر واپس چلے جائیں اور آئندہ سال آکر عمرہ کریں، نیز یہ کہ بالکل خالی ہاتھ اور غیر مسلح ہو کر آئیں۔

(۱) اس بیعت کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ یعنی ”یقیناً اللہ راضی ہو گیا مؤمنوں سے جبلکہ وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے.....“ (سورۃ الفتح ۱۸)

یعنی اس آیت، نیزاں کے بعد چند آیات میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ان خوش نصیب افراد کیلئے پکے اوسے مؤمن ہونے کی گواتی دی گئی ہے جو اس بیعت میں شریک ہوئے، نیز انہیں اللہ کی طرف سے متعدد خوبیوں سے فواز اگیا، جن میں اہم ترین خوشخبری یہ تھی کہ انہیں ہمیشہ کیلئے اللہ کی طرف سے ”رضامندی و خوشندی“ سے شادکام کیا گیا..... بھی وجہ ہے کہ اس یادگار اور مبارک ترین بیعت کو ”بیعتِ رضوان“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور اس موقع پر جتنے مسلمان موجود تھا ان کی بڑی فضیلت و نسبت ہے۔

مسلمان گذشتہ چھ سال سے بیت اللہ کی زیارت کیلئے بے چین تھے، اور اب اس قدر طویل سفر کی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کرنے کے بعد یہاں پہنچ تھے، مزید یہ کہ حالتِ احرام میں بھی تھے..... ایسے میں مکہ کی حدود میں پہنچ کر اب یہاں سے عمرہ کئے بغیر واپس لوٹ جانا کس قدر تکلیف دہ تھا۔

لیکن اس کے باوجود رسول ﷺ نے ان تمام شرائط کو منظور فرمایا اور اس معاهدہ صلح کو قبول فرمایا، اس سے یقیناً آپ ﷺ کی صلح پسندی ظاہر ہوتی ہے، نیز یہ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے خوزیری، جنگ و جدال اور فتنہ و فساد سے اجتناب کا جذبہ نہ مایا ہوتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس صلح میں اللہ کی طرف سے مسلمانوں کیلئے بڑی مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔



الحمد لله آج بتاریخ ۸ / رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ، مطابق ۱۶ جولائی ۲۰۱۳ء بروز منگل

یہ بابِ کامل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبَّ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ

فرمان رواوں کو دعوتِ اسلام:

۶۰ھجری میں مشرکین مکہ کے ساتھ کئے گئے معاملہ صلح یعنی "صلح حدیبیہ" کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کو جب مشرکین مکہ کی طرف سے قدرے بے فکری نصیب ہوئی تو آپ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دینِ اسلام کی نشوواشاعت کے کام کو مزید وسعت دینے کی غرض سے ہجرت کے ساتوں سال مختلف فرمان رواوں اور حکمرانوں کو خطوط ارسال فرمائے جن میں انہیں دین برحق قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی، کیونکہ دینِ اسلام کسی خاص قوم کیلئے نہیں ہے، بلکہ یہ تو عالمگیر دین ہے، آخری اور مکمل دین ہے، تمام بني انسان کی صلاح و فلاح اور نجات اسی دین سے وابستہ ہے، اللہ نے اپنے بنی اسرائیل کو "تمام دنیاۓ انسانیت" کیلئے "رحمت" بنا کر بھیجا تھا، نہ کسی مخصوص قوم کیلئے، لہذا آپ کی نبوت و بعثت زمان و مکان کی حدود و قیود سے بالاتر تھی۔

جبیسا کہ ارشادِ بنی ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (۱)

ترجمہ: (اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کیلئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ (۲) ترجمہ: (آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے

اور وہی موت دیتا ہے)

(۱) الانبیاء [۷] [۱۵۸] (۲) الاعراف [۱۰۷]

نیز ارشاد ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَةً لِلنَّاسِ بَشِيرًاً وَنَذِيرًاً﴾ (۱) ترجمہ: (ہم نے آپ کو تمام لوگوں کیلئے خوشخبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے) نیز ارشاد ہے: ﴿وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ﴾ (۲) ترجمہ: (اور میرے پاس یہ قرآن بطور حجی کے بھیجا گیا ہے تاکہ میں اس قرآن کے ذریعہ سے تم کو اور جس کو یہ قرآن پہنچان سب کو ڈراوں)

نیز ارشاد ہے: ﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾ (۳) ترجمہ: (بہت بابرکت ہے وہ اللہ تعالیٰ جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارتا کہ وہ تمام لوگوں کیلئے آگاہ کرنے والا بن جائے)

رسول ﷺ کا ارشاد ہے: (كَانَ النَّبِيُّ يُبَعِّثُ إِلَىٰ قَوْمِهِ خَاصَّةً، وَبُعْثَتُ إِلَىٰ النَّاسِ عَامَّةً) (۲) ترجمہ: (مجھ سے پہلے ہر بھی کو صرف اپنی ہی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا، جبکہ مجھے تمام بھی نوع انسان کی طرف مبعوث کیا گیا ہے) چنانچہ حدیبیہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رسول ﷺ نے ”تبليغِ دین“ کے اس فریضے کی انجام دہی کے طور پر متعدد دعویٰ خطا طخیر فرمائے۔

☆.....”اصلاح“ کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے خودا پنی اصلاح کرے، اس کے بعد اپنے اہل و عیال اور افرادِ خانہ کی، پھر اپنے اعزہ واقارب اور اپنے احباب کی، اس کے بعد علاقائی سطح پر یہ کام ہو، پھر ملکی سطح پر..... اور اگر حالات اجازت دیں تو مناسب طریقے سے اور حکمت کے ساتھ عالمی سطح پر یہ فریضہ انجام دیا جائے۔

(۱) سب [۲۸] (۲) الأنعام [۱۹] (۳) الأعراف [۱]

(۴) بخاری [۳۲۸] کتاب التہم و قول اللہ تعالیٰ: فان لم تجد وامااء..... مسلم [۵۲۱] کتاب المساجد و مواضع الصلاة۔

رسول ﷺ نے اللہ کے دین کی طرف دعوت کا جو فریضہ انجام دیا، اس میں بھی ”اصلاح“ کا بھی بنیادی اصول کا فرمان نظر آتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ کے اعلیٰ اخلاق، بے داغ کردار اور پاکیزہ سیرت کے اپنے اور پرائے سبھی معرفت تھے۔

اس کے بعد جب آپؐ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا اور اللہ کا پیغام پہنچانے کا فریضہ سونپا گیا، تب آپؐ نے سب سے پہلے اپنے اہل خانہ کو دین حق قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد جب اللہ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے یہ حکم نازل ہوا: ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (۱) یعنی: ”آپؐ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے“ تب آپؐ نے بنو هاشم اور بنو عبدالمطلب کو اللہ کا پیغام پہنچاتے ہوئے دین برحق کی طرف بلایا، اور اسی سلسلے میں ”کوہ صفا“ پر اجتماع کا مشہور واقعہ پیش آیا تھا۔

اور پھر جب آیت: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمِنُ وَأَعِرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾ (۲) یعنی: ”آپؐ کو جس چیز کا حکم دیا جا رہا ہے اسے آپؐ کھوں کر سنادیجئے اور مشرکین سے منه پھیر لیجئے“ (۳) نازل ہوئی تو اس ارشادِ بانی کی تقلیل کے طور پر آپؐ نے دعوتِ دین کے اس سلسلے کو وسعت دیتے ہوئے تمام مکہ والوں کو اللہ کا پیغام پہنچایا، جس کے نتیجے میں مشرکین مکہ کی جانب سے ایذا اور سانیوں کا آغاز ہوا۔

اس کے بعد آپؐ نے کل شہر سے باہر قرب و جوار کے علاقوں میں دعوت کا فریضہ سر انجام

(۱) انمل [۲۱۲] (۲) الحجر [۹۳] (۳) یعنی اب رسول ﷺ کو یہ حکم دیا گیا کہ چھپ کر تبلیغ کرنے کی بجائے حکلم کھلا اور علی الاعلان اللہ کے دین کی تبلیغ کریں، اور اس سلسلے میں مشرکین مکہ کی طرف سے مخالفت و عداوت کا جب سامنا کرنا پڑے تو ان سے الجھنے کی بجائے، یا اس بات پر افرادہ ہونے کی بجائے ان سے منہ موڑ لیں (یعنی اس اللہ پر بھروسہ رکھیں اور افسر دہ و رنجیدہ نہوں.....)

دیا، اسی سلسلے میں ”سفر طائف“ کا تاریخی واقعہ پیش آیا، نیز انہی دنوں آپؐ نے مشرکین مکہ کی بجائے بیرون مکہ سے آنے والے ان افراد و قبائل پر اپنی توجہ زیادہ مرکوز کی جن کی حج و عمرہ کی ادائیگی کی غرض سے یا تجارت کے سلسلے میں مکہ شہر میں آمد و رفت رہتی تھی، اسی سلسلے میں حج کے موقع پرمدینہ سے آئے ہوئے چند افراد کے قبولِ اسلام کا واقعہ اور پھر ”بیعت عقبہ“ کا مشہور واقعہ پیش آیا تھا۔

اور پھر بالآخر ۲۷ ہجری میں ”صلحِ حدیبیہ“ کے نتیجے میں جب مشرکین مکہ کی جانب سے قدرے بے فکری نصیب ہوئی اور حالات سازگار محسوس ہوئے تو بھرت کے ساتویں سال آپؐ نے ارشادِ بانی ﷺ (وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا) (۱) یعنی ”ہم نے آپؐ کو تمام لوگوں کیلئے خوشخبری ایام سنانے والا اور درانے والا بنا کر بھیجا ہے“ کے مصدقہ کے طور پر دعوت و تبلیغ کے اس سلسلے کو جزیرہ العرب سے باہر کی دنیا تک وسعت دیتے کا آغاز فرمایا، اور اسی سلسلے میں مختلف فرماں رواوں، حکمرانوں، امراء و مسلمین، والیاں ریاست، اور سرداران قبائل کو دعوتی خطوط ارسال کئے گئے۔

اس سلسلے میں درج ذیل امور قابل ذکر ہیں:

☆..... اُس دور میں چونکہ یہ رواج تھا کہ کسی بھی قسم کی سرکاری خط و کتابت کیلئے مہر کو ضروری تصور کیا جاتا تھا، ان فرماں رواوں کے شاہی درباروں میں پہنچنے والا کوئی ایسا خط قبول نہیں کیا جاتا تھا کہ جس پر لکھنے والے کی مہربنت نہ ہو، بغیر مہر کے خط کو جعلی اور نقی تصور کیا جاتا تھا۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان فرماں رواوں کے ساتھ دعوتِ اسلام کے سلسلے میں خط و کتابت

کے موقع پر ایک مہر تیار کروائی، اور پھر مزید یہ کہ اس مہر میں کوئی عبارت بھی درج ہوا کرتی تھی، جسے خط تحریر کرنے والے کی طرف سے دستخط یا شناخت کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔

رسول ﷺ نے جو مہر تیار کروائی اس میں بطور شناخت یہ عبارت تحریر کی گئی: ”محمد رسول اللہ“، اور اس عبارت کی تحریر کیلئے انداز یہ اختیار کیا گیا کہ اسے دائیں سے باکیں جانب لکھنے کی بجائے اوپر سے نیچے کی جانب لکھا گیا، سب سے اوپر ”اللہ“ اس کے نیچے ”رسول“ اور پھر سب سے نیچے ”محمد“ لکھا گیا، تاکہ جس کسی کو یہ خط تحریر کیا جا رہا ہے وہ خط پر نظر پڑتے ہی..... مضمون تک پہنچنے سے پہلے ہی..... اس خط کے تحریر کنندہ کی سوچ اور اس کے عقیدہ وايمان سے نیز اس کی حیثیت اور مقام و مرتبے سے آگاہ ہو جائے اسے اس حقیقت کا ادراک ہو جائے کہ اس خط کے تحریر کنندہ کا نام ”محمد“ ہے اور یہ کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، نیز یہ کہ ان کا عقیدہ وايمان یہ ہے کہ اس تمام کائنات میں ”اللہ عزوجل“ کا مقام و مرتبہ سب سے بلند ہے تمام زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے اس کا مقام و مرتبہ اللہ سے کم ہے۔

☆..... ان تمام خطوط کا بنیادی مضمون اگرچہ مشترک تھا کہ ان سب میں اُن فرمائز و رواوں کو دین برحق قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی، البتہ عام مضمون ہر خط میں قدرے مختلف تھا، کیونکہ جن فرمائز و رواوں کے نام یہ خطوط تحریر کئے گئے تھے ان سب کا پس منظر مختلف تھا، ان میں سے کوئی نصرانی تھا، کوئی مجوہی، کوئی مشرک، کوئی اللہ پر اور نبوت و رسالت پر یقین وايمان رکھتا تھا، کوئی اس چیز کا منکر تھا، جبکہ ان میں سے کسی کو اس بارے میں سرے سے کوئی علم ہی نہیں تھا..... لہذا..... جیسا کہ مقولہ مشہور ہے کہ ”لکل مقام مقال“، یعنی ہر موقع کیلئے گفتگو جدا ہوا کرتی ہے، ایک ہی بات ہر موقع پر اور ہر مقام پر نہیں کی جاسکتی، موقع محل کی

مناسبت سے ہی گفتگو کی جاتی ہے۔

اور پھر یہ کہ رسول ﷺ کے مقاصدِ بعثت میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آپؐ دنیا کو ”حکمت و دانش“ کی تعلیم دیں (۱) لہذا خود آپؐ کا اپنا ہر اقدام اور ہر قول عمل کس قدر حکمت و دانائی سے بھر پور ہوگا..... چنانچہ اسی حکمت اور فہم و فراست کا مظاہرہ ہمیں آپؐ کی طرف سے مختلف فرمائز و اول کے نام تحریر فرمودہ ان خطوط میں بھی نظر آتا ہے، کہ ان سب کا بنیادی مضمون اگرچہ ایک ہی تھا، تاہم خط کا عام مضمون ہر مکتب الیہ کی مذہبی، فلکری و سماجی کیفیت کے مطابق جدا جاتا ہے۔

☆..... ان خطوط میں ہر فرمائز و اول پر یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ اس کے قبول اسلام کی صورت میں بھی اس کی یہ بادشاہت، نیز اس کے ملک میں اور اس کی رعیت میں اس کی یہ حیثیت اور یہ رتبہ بدستور اسی طرح برقرار رہے گا، کیونکہ رسول ﷺ کو، یا آپؐ کے جاں ثار ساتھیوں کو اس مکتب الیہ کے ملک اور اس کی دولت اور مال و متعاع سے کوئی غرض نہیں تھی، دنیا کی ہوں یا لاچ کا وہاں کوئی تصویر نہیں تھا..... وہاں مال غنیمت یا کشور کشائی کا کوئی جذبہ نہیں تھا..... بلکہ اصل مقصود تو ان فرمائز و اول کو دعوتِ حق پہنچانا..... اور خود انہی کو راہ نجات پر لانا تھا..... خود انہی کی بھلائی اور دنیا و آخرت میں ان کی صلاح و فلاح مقصود تھی، نہ کہ ان کے ملک اور مال و متعاع پر قبضہ جمانا۔

یقیناً یہ بھی رسول ﷺ کی طرف سے ”استغنا عن الدنیا“، کی اعلیٰ مثال، نیز حکمت و دانائی اور سیاسی بصیرت کا بہت بڑا مظاہرہ تھا۔

(۱) جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ...﴾ (معنی: تاکہ وہ (یعنی بنی اسرائیل) انہیں سکھادیں کتاب اور حکمت.....) (ابقرہ: ۱۲۹)

دعوتِ اسلام کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے متعدد حکمرانوں اور فرمانرواؤں کے نام خطوط ارسال فرمائے، البتہ ان میں سے سلطنتِ روم اور سلطنتِ فارس خاص طور پر قابل ذکر ہیں، کیونکہ اُس زمانے میں روئے زمین پر یہی دو بہت عظیم قوتیں تھیں، ان کی بڑی شان و شوکت تھی، بڑا رعب اور بد بہ تھا، دنیا کے باقی ممالک کی دینی، سیاسی، تمدنی، معاشرتی، و معاشی صورتِ حال پر ان دونوں سلطنتوں کی بہت مضبوط گرفت تھی، علاقے کی باقی تمام قوتیں ہر لحاظ سے ان کے زیرِ اثر تھیں، چنانچہ ان عظیم سلطنتوں کے فرمانرواؤں کے ساتھ خط و کتابت کا حال درج ذیل ہے:

☆..... قیصرِ روم:

دعوتِ اسلام کے سلسلے میں پہلا خط قیصرِ روم کے نام لکھا گیا، اُس زمانے میں سلطنتِ روم کا جو کوئی بھی بادشاہ ہوتا اسے ”قیصر“ کے لقب سے یاد کیا جاتا، اُس دور میں ”ہرقل“ نامی شخص قیصرِ روم تھا، یعنی روئے زمین کی عظیم ترین قوت ”سلطنتِ روم“ کا بادشاہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے صحابی حضرت دیحیہ بن خلیفہ الکعوی رضی اللہ عنہ قیصرِ روم کے نام آپ کا تحریر فرمودہ نامہ مبارک لے کر مدینہ منورہ سے سفر کرتے ہوئے سلطنتِ روم کے دارالحکومت ”قسطنطینیہ“ کی جانب عازم سفر ہوئے (۱) (۲) دوران سفر انہیں یہ اطلاع ملی کہ قیصر آجکل ”ایلیاء“ (یعنی بیت المقدس) آیا ہوا ہے، جس پرانہوں نے قسطنطینیہ کی بجائے اپنے سفر کا رُخ ایلیاء کی جانب موڑ دیا۔

(۱) حضرت دیحیہ بن خلیفہ الکعوی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات قبل ذکر ہے کہ جب میں علیہ السلام جب بھی انسانی شکل میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لاتے تو ہمیشہ انہی کی شکل میں آیا کرتے تھے۔

(۲) اُس زمانے میں سلطنتِ روم کا دارالحکومت ”قسطنطینیہ“ تھا، یعنی موجودہ ”انتیبول“ جو کہ اب ترکی کا مشہور و معروف شہر ہے۔

درالصل سلطنتِ روم اور سلطنتِ فارس میں باہم سالہا سال سے مختلف محاذوں پر خوزیر قسم کی جنگوں کا سلسلہ چلا آ رہا تھا، کبھی ایک فریق کو غلبہ نصیب ہوتا، اور کبھی دوسرے فریق کو..... یوں سالہا سال سے یہ سلسلہ جاری تھا..... اور چونکہ خطے کے دیگر تمام ممالک اور ان میں بستے والے عوام ان دونوں میں سے کسی ایک کے تابع فرمان اور زیر اثر نہیں، لہذا فریقین میں سے کسی ایک کی فتح اور دوسرے کی شکست کے دینی، سیاسی، سماجی و اقتصادی اثرات صرف انہی دونوں تک محدود نہیں رہتے تھے، بلکہ اس چیز کا اثر دور دراز کے علاقوں تک پہنچتا تھا، حتیٰ کہ اس چیز کا اثر تک بھی پہنچتا تھا..... فارسی چونکہ مشرک (۲۶ش پرست) تھے، لہذا جب کسی محاذ پر انہیں غلبہ نصیب ہوتا تو مشرکین مکہ خوشیاں مناتے اور مسلمان غمگین ہو جاتے..... جبکہ رومی چونکہ اہل کتاب تھے، لہذا ان کی کامیابی پر مسلمان خوش ہوتے، جبکہ مشرکین غمزدہ ہو جاتے..... اس چیز کا تذکرہ قرآن کریم میں بھی ”سورۃ الروم“ کی بالکل ابتدائی آیات میں موجود ہے۔

جن دونوں حضرت ڈیحیہ بن خلیفہ لکھی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا نامہ مبارک قیصر روم تک پہنچانے کی غرض سے محسوس فتح تھے، دراصل انہی دونوں کسی اہم محاذ پر رومیوں کو فارسیوں کے مقابلے میں کوئی بڑی فتح نصیب ہوئی تھی، اور اہل کتاب کے نزد یہک ”ایلیاء“، یعنی بیت المقدس کا بڑا تقدس تھا اور اسے خاص مذہبی حیثیت حاصل تھی، لہذا اس عظیم فتح کے موقع پر بطور شکر عبادت کی غرض سے قیصر ان دونوں اپنے دارالحکومت ”قسطنطینیہ“ سے ”ایلیاء“، یعنی بیت المقدس آیا ہوا تھا، چنانچہ رسول ﷺ کے قاصد کو جب یہ خبر ملی تو وہ بھی قسطنطینیہ کی بجائے ایلیاء پہنچ گئے اور نامہ مبارک قیصر کے قصیر کے حوالے کیا۔

قیصر نے رسول ﷺ کا نامہ مبارک پڑھا، اور پھر غور و فکر کے بعد اس نے اس بارے

میں کسی بھی طرح مزید معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اُس زمانے میں مشرکین مکہ کے تجارتی قافلوں کی بکثرت ملک شام آمد و رفت رہا کرتی تھی چنانچہ رسول ﷺ کا نامہ مبارک موصول ہونے پر قیصر روم نے حکم دیا کہ مکہ کا کوئی باشندہ اگر نظر آئے تو اسے فوراً اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں تلاش کا سلسلہ شروع کیا گیا تو جلد ہی مشرکین مکہ کا ایک قافلہ وہاں مل گیا، جسے بغیر کسی تاخیر کے قیصر کے رو برو پیش کیا گیا۔ قیصر نے اس وفد میں موجود افراد سے دریافت کیا کہ تمہارے شہر مکہ میں نبوت کا دعویٰ کرنے والے اس شخص کا تم میں سے قربی رشتہ دار کوں ہے؟ اس پر ابوسفیان (جو کہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) نے جواب دیا کہ ”میں ہوں“۔ اس کے بعد قیصر اور ابوسفیان کے درمیان کچھ اس طرح سوال و جواب کا سلسلہ ہوا:

☆.....قیصر: محمد کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان: شریف ہے

☆.....قیصر: کیا اس خاندان میں کسی اور نے بھی کبھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟

ابوسفیان: نہیں

☆.....قیصر: اس خاندان میں کبھی کوئی بادشاہ گزر ہے؟

ابوسفیان: کبھی نہیں

☆.....قیصر: جن لوگوں نے ان کا دین قبول کیا وہ امیر ہیں یا غریب؟

ابوسفیان: غریب لوگ ہیں

☆.....قیصر: ان کے ماننے والے لھٹ رہے ہیں یا بڑھ رہے ہیں؟

ابوسفیان: بڑھ رہے ہیں

☆..... قیصر: کیا اس کے ماننے والوں میں سے کبھی کوئی اس سے محرف بھی ہوا ہے؟

ابوسفیان: کبھی نہیں

☆..... قیصر: کبھی تم لوگوں سے اس نے جھوٹ بھی بولا ہے؟

ابوسفیان: نہیں، بلکہ ہمارے علاقے میں وہ "صادق" اور "امین" کے لقب سے مشہور ہے

☆..... قیصر: وہ کبھی اپنے وعدے یا اقرار سے پھرا ہے؟

ابوسفیان: نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا، حال ہی میں اس سے ہمارا معاهدة صلح (۱) ہوا ہے،

دیکھیں، اس پر وہ قائم رہتا ہے یا نہیں

☆..... قیصر: تم لوگوں نے کبھی اس سے جنگ بھی کی ہے؟

ابوسفیان: ہاں

☆..... قیصر: متوجه کیا رہا؟

ابوسفیان: کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ (۲)

☆..... قیصر: اس کی تعلیمات کیا ہیں؟

ابوسفیان: کہتا ہے کہ "ایک اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراو، نماز پڑھو، حج

بولو، پاکیزہ اور باریاء زندگی اختیار کرو، رشتے داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اور نیکی کے

(۱) یعنی صلح حدیثیہ (۲) یعنی اُس وقت تک مسلمانوں اور مشرکین کم کے مابین تین بڑی جنگوں کی نوبت

آئی تھی، بدر، احمد، اور خندق (جسے احزاب کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) بدر کے موقع پر مسلمانوں کو غلبہ نصیب

ہوا، احمد کے موقع پر ابتداء میں مسلمان غالب رہے، لیکن بعد میں اپنی ہی ایک غلطی کی وجہ سے جنتی ہوئی جنگ

ہار گئے، جبکہ خندق کے موقع پر قoba قاعدہ جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی..... ابوسفیان کے اس جواب سے اسی بات کی

طرف اشارہ مقصود تھا کہ "کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔"

راستے پر چڑو۔

رسول ﷺ کے بارے میں ابوسفیان کی زبانی یہ گفتگوں کر قیصر بولا:

☆.....”تم کہتے ہو کہ وہ شریف خاندان میں سے ہیں.....نبی ہمیشہ شریف خاندان میں ہی پیدا ہوتے ہیں۔

☆.....تم کہتے ہو کہ ان کے خاندان میں پہلے کبھی کسی نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی ان میں کوئی بادشاہ گزرائے.....اگر ایسا ہوتا تو ہم سمجھتے کہ یہ خاندانی وقار کا اثر ہے (۱)

☆.....تم نے کہا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے.....جو شخص انسانوں کے سامنے جھوٹ نہیں بولتا وہ اللہ کے بارے میں کس طرح جھوٹ بول سکتا ہے؟ (۲)

☆.....تم نے بتایا کہ ان کے ماننے والوں میں غریب زیادہ ہیں.....پیغمبروں پر سب سے پہلے غریب ہی ایمان لایا کرتے ہیں۔

☆.....تم مانتے ہو کہ ان کے پیروکار بڑھتے جا رہے ہیں.....چے دین کا یہی حال ہوتا ہے۔

☆.....تم نے بتایا کہ ان کے پیروکاروں میں سے کبھی کوئی ان سے منحر ف نہیں ہوا.....چے دین کی یہی شان ہوتی ہے کہ ایک بار جب دل کی گھرائیوں میں پیوست ہو جاتا ہے تو پھر اس سے اخراج ممکن نہیں ہوتا۔

☆.....تم قبول کرتے ہو کہ وہ کبھی اپنے وعدے یا اقرار سے نہیں پھر تے.....سچانی ایسا ہی

(۱) یعنی ہم یہ سمجھتے کہ اس شخص نے اس لائق کی وجہ سے نبوت کا یہ جھوٹ دعویٰ کیا ہے کہ اس طرح شاید اسے بھی وہی عزت و عظمت اور مقام و مرتبہ نصیب ہو جائے.....

(۲) یعنی جب وہ انسانوں کے بارے میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا وہ اللہ کے بارے میں وہ کس طرح یہ جھوٹ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے.....؟

ہوتا ہے۔

☆..... تم نے اقرار کیا کہ وہ نماز اور نیکی کی تاکید و تلقین کرتے ہیں..... سچے نبیوں کی تعلیمات ایسی ہی پاکیزہ ہوا کرتی ہیں۔

اور پھر قصہ پکجھ دیر کسی سوچ میں میں گم رہا۔۔۔ پھر۔۔۔ قدرے تو قف کے بعد یوں کہنے لگا۔۔۔ فَإِنْ كَانَ مَا تَقُولُ حَقًا فَسَيِّمُ الْكُمْ مَوْضِعَ قَدَمَيِ هَاتَيْنِ یعنی بُوت کا دعویٰ کرنے والے اس شخص کے بارے میں جو کچھ تم بتا رہے ہو۔۔۔ اگر یہ سب درست ہے۔۔۔ تو بہت جلد میرے پایہ تخت تک ان کا قبضہ ہو جائے گا۔(۱)

اور پھر مزید کہنے لگا ”وَقَدْ كُنْتُ أَعْلَمَ أَنَّهُ خَارِجٌ، وَلَمْ أَكُنْ أَظْنَنَّ مِنْكُمْ“، یعنی مجھے اس بات کا علم تھا کہ وہ عنقریب ظاہر ہونے والے ہیں، لیکن مجھے یہ موقع نہیں تھی کہ وہ تم میں ظاہر ہو جائیں گے۔(۲)

اور پھر مزید کہنے لگا ”فَلَوْ أَنِي أَعْلَمُ أَنِي أَخْلُصُ إِلَيْهِ لَتَجَشَّمْتُ لِقاءً، وَلَوْ كُنْتُ عِنْدَهُ لَغَسْلَتُ عَنْ قَدَمَيْهِ“ (۳) یعنی ”اگر میں یہ جان سکوں کہ میرے لئے کسی طرح ان تک رسائی ممکن ہے تو میں ضرور بڑی بیتابی کے ساتھ ان کی خدمت میں

(۱) یعنی جب وہ سچے نبی ہیں تو پھر یقیناً ان کے ساتھ اللہ کی طرف سے تائید و نصرت بھی ہوگی، لہذا ان کے دین کو پچھلے پھولنے سے کوئی نہیں روک سکتا، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ عنقریب بہت جلد یہاں ہمارے ملک اور پایہ تخت تک ان کا قبضہ ہو جائے گا۔

(۲) یعنی چونکہ گذشتہ آسمانی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تذکرہ اور بشارتیں موجود تھیں، نیز آپؐ کے ظہور کی علامات بھی بیان کی گئی تھیں، اہل کتاب یہ سب کچھ اپنی کتابوں میں پڑھا کرتے تھے، لہذا انہیں اس بارے میں خوب علم تھا، البتہ انہیں یہ امید نہیں تھی کہ وہ آخری نبی ان اہل کتاب کی بجائے ملک میں عربوں میں ظاہر ہو جائیں گے۔

(۳) صحیح بخاری [۷] باب بدء الوجی۔

حاضر ہوتا..... اور اگر میں ان تک پہنچ سکتا تو ضرور میں خود ان کے پاؤں دھوتا۔“

یعنی اتنی بڑی سلطنت کا اس قدر عظیم بادشاہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ الفاظ کہنے لگا..... کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں بڑی بیتابی اور شوق کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضری دیتا..... اور میں خود ان کے پاؤں دھوتا۔

شاہی دربار میں موجود تمام بڑی بڑی شخصیات مشیروں، وزیروں، ودیگر درباریوں نے جب اپنے بادشاہ کی زبانی یہ باتیں سنیں تو وہ حیران و پریشان اور انگشت پندتا رہ گئے اور اس سوچ میں پڑ گئے کہ ہمارے بادشاہ کو کیا ہو گیا؟ اور تب وہاں آوازیں بلند ہونے لگیں، ایک شورو غل پر پا ہو گیا، افراتغری کا ماحول پیدا ہو گیا، اتنے بڑے بادشاہ کا وہ دربار کہ جہاں شاہی جاہ و جلال اور رعب و بد بے کی وجہ سے ہمہ وقت بڑی ہیئت طاری رہتی تھی، اور پُر وقار فضاء بنی رہتی تھی اب وہاں یہ شورو غل یہ بذریعی اور یہ افراتغری یہ منظر دیکھ کر قصر پریشان ہو گیا، اور معاملے کی نزاکت کو محسوں کرتے ہوئے اس نے کسی بھی طرح اس معاملے کوٹانے کی کوشش کی، اور دینِ اسلام نیز پیغمبرِ اسلام کی صداقت و تھانیت کو خوب جان لینے اور سمجھ لینے کے باوجود محض اپنی حکومت اور تاج و تخت بچانے کی خاطر اس نے دینِ اسلام قبول نہیں کیا اور یوں اس نے آخرت کی ابدی و دامگی سعادتمندی و کامیابی کے مقابلے میں دینا کی عارضی و فانی شان و شوکت کو ترجیح دی اور دینِ برحق قبول کرنے کی ابدی سعادت سے محروم رہ گیا۔

☆..... کسری:

دعوتِ اسلام کے سلسلے میں دوسرا خط روئے زمین کی دوسری بڑی سلطنت اور عظیم قوت ”فارس“ کے بادشاہ کے نام لکھا گیا، اُس دور میں سلطنتِ فارس کا جو بھی بادشاہ ہوتا اسے

”کسریٰ“ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، اُس زمانے میں ”خسرو پروریز“ نامی شخص کسریٰ تھا، یعنی فارس کا بادشاہ تھا۔

سلطنتِ فارس کا اگرچہ بڑا جاہ و جلال تھا، نیز یہ کہ خسرو پروریز ہی کا (ساسانی) خاندان ایک ہزار سال سے مسلسل نسل درسل وہاں حکمرانی کر رہا تھا، لیکن بالخصوص خسرو پروریز کے دور حکومت میں سلطنتِ فارس کو جواہ و جلال اور عروج حاصل ہوا، نیز وہاں کے شاہی دربار کو جوشان و شوکت اور رعب و بد بے نصیب ہوا..... یہ چیز اس سے قبل کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی غرضیکہ خسرو پروریز انتہائی شان و شوکت اور جاہ و جلال والا بادشاہ تھا۔

رسول ﷺ کے قاصد کی حیثیت سے مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن حذاقہؓ ہمی رضی اللہ عنہ (۱) نے ایک روز اپنے اہل و عیال کو الوداع کہا..... اور آپؐ کا نامہ مبارک کسریٰ تک

(۱) عبداللہ بن حذاقہؓ ہمی رضی اللہ عنہ کسی بھی عام انسان کی طرح مکہ کے گلی کو چوں میں کھیلتے کو دتے ہوئے جوان ہوئے تھے..... لیکن دین اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے ساتھ ”قیصر و کسریٰ“ کے حوالے سے ایسے حالات و واقعات پیش آئے کہ جن کی وجہ سے ان کا تذکرہ ہمیشہ کیلئے تاریخ کے صفات میں بلکہ کتب حدیث میں محفوظ ہو گیا، اُس وقت روئے زمین کی دونوں عظیم ترین قوتوں کے بادشاہوں کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی، اور عجیب و غریب حالات و واقعات پیش آئے، کسریٰ خسرو پروریز کے ساتھ تو ان کی ملاقات اسی موقع پر یعنی سنہ سات ہجری میں رسول ﷺ کی طرف سے مختلف فرمائزہ اُوں کے نام و عنقی خطوط ارسال کئے جانے کے موقع پر ہوئی، جبکہ سنہ ۱۹ ہجری میں خلیفہ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دریافت میں جب مشرق و مغرب میں ہر طرف اسلامی فتوحات کا ایک سیلاں جاری تھا..... تب یہ ملک شام میں سلطنتِ روم کے خلاف برسر پیکار اسلامی لشکر میں شامل تھے، وہاں ایک بار عجیب و غریب قسم کے حالات میں ایک ”قیدی“ کی حیثیت سے انہیں قیصر روم کے سامنے پیش کیا گیا..... اور تب کس کس طرح اس نے ان کی دینی استقامت کا امتحان لیا..... اور کیا کیا واقعات پیش آئے..... اور کس طرح یہ سرخ رو ہو کر وہاں سے واپس مدینہ پہنچ..... ان واقعات کی وجہ سے تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا..... اگر اللہ کی طرف سے توفیق شامل حال رہی..... اور زندگی نے دفاع کی..... تو ان شاء اللہؐ کی ان کے حالات مفصل تحریر کروں گا، و ما توفیق الا بالله، علیہ توکلت والیہ اُنیب۔

پہنچانے کی غرض سے کیہا تھا..... اپنے اللہ پر بھروسہ کئے ہوئے، مدینہ سے ہزاروں میل کی مسافت پر واقع سلطنتِ فارس کے دارالحکومت ”مدائَن“ کی جانب محسوس ہو گئے اور ہاں پہنچنے کے بعد شاہی دربار میں جا کر نامہ مبارک خسرو پرویز کے حوالے کیا، جسے پڑھنے کیلئے خسرو نے اپنے مترجم کو طلب کیا۔

اُس دور میں فارس کے شاہی دربار میں یہ دستور تھا کہ خسرو پرویز کے نام جو بھی خط تحریر کیا جاتا اُس میں سب سے اوپر خسرو کا نام لکھا جاتا، جبکہ رسول اللہ ﷺ کے نامہ مبارک میں جب خسرو کو سب سے اوپر اللہ عزوجل کا نام نظر آیا..... تو وہ انتہائی غصباں ک اور آگ بگولہ ہو گیا..... اور خط پڑھنے لگی ہی اسے چاک کر ڈالا..... اور پھر رسول اللہ ﷺ کے قاصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنے دربار یوں کو حکم دیا کہ اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا جائے..... نیز اس بدجنت نے اپنے کچھ کارندوں کو مدینہ بھی بھیجا تاکہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیا جائے (۱)

رسول اللہ ﷺ کے قاصد عبد اللہ بن حذافہؓ ہمی رضی اللہ عنہ سلطنتِ فارس سے واپس سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچ، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام صورتِ حال بیان کی، نیز یہ بھی بتایا کہ بدجنت خسرو پرویز نے آپؐ کا نامہ مبارک پر زے پر زے کر ڈالا..... محض اس لئے کہ اُس میں سب سے اوپر اللہ عزوجل کا نام لکھا ہوا تھا..... یہ سن کر آپؐ ﷺ نے فقط اتفاقِ مایا ”مرِّق اللَّهُ مُلْكٌ“، یعنی ”اللہ کرے اس کا ملک بھی ملکڑے ملکڑے ہو جائے“، یعنی جس طرح اس نے اس خط کو چاڑ کر ملکڑے ملکڑے کر دیا.....

(۱) ان کارندوں کی مددیناً آمد اور پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گفتگو..... اور پھر اس کا متبیج..... یہ الگ موضوع ہے، جو کہ تفصیل طلب ہے۔

اللہ کرے اسی طرح اس کی بادشاہت اور اس کے ملک کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں.....
اللہ کی قدرت ملاحظہ ہو کہ اس واقعے کے بعد ابھی چند روز ہی گذرے تھے کہ اس قدر رجاه
وجلال اور رعب و دبدبے والا بادشاہ جو کہ خود کو ”شہنشاہ“ یعنی بادشاہوں کا بادشاہ کہلاتا تھا،
مارا گیا..... اور اس سے بھی بڑی بد نجاتی یہ ہو گئی کہ خود اپنے ہی میٹے ”شیر و یہ“ کے ہاتھوں
مارا گیا، اس کا اپنا ہی بیٹا اسے قتل کر کے اس کے ملک اور تخت و تاج کا مالک بن بیٹھا۔

☆.....نجاشی شاہِ جبشہ :

دعوتِ اسلام کے سلسلے میں ایک خط ملکِ جبشہ کے بادشاہ کے نام تحریر کیا گیا، اُس زمانے
میں جبشہ کے بادشاہ کو ”نجاشی“ کے لقب سے پکارا جاتا تھا، اور جس دور میں یہ خط ارسال
کیا گیا ان دونوں ”اصحہ“، ”نامی شخص نجاشی تھا، یعنی ملکِ جبشہ کا بادشاہ تھا، رسول اللہ ﷺ
کے قاصد کی حیثیت سے یہ نامہ مبارک حضرت عمر بن امیہ الضرمی رضی اللہ عنہ لے
کر گئے۔

نجاشی تو دراصل بہت پہلے سے ہی دینِ اسلام اور پیغمبر اسلام کی حقانیت و صداقت
کا معرفت تھا، دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں جب نبوت کا پانچواں سال چل
رہا تھا، مشرکین مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ایذاء رسانیوں کا سلسلہ
اپنے عروج پر تھا.....تب رسول اللہ ﷺ کے مشورے پر بہت سے مسلمان مکہ سے ملکِ
جبشہ کی جانب تحریک کرنے تھے، اور تب مشرکین مکہ کا ایک وفد بھی ان کے تعاقب میں
جبشہ پہنچا تھا، اور نجاشی کے سامنے ان مسلمانوں پر اپنے آبا و اجداد کے دین سے غداری
اور فتنہ و فساد پھیلانے کا الزام عائد کرتے ہوئے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا، نجاشی نے
اس موقع پر ان مسلمانوں کا موقف بھی سناتا اور دینِ اسلام کے بارے میں ان سے بہت

کچھ معلومات حاصل کی تھیں اور بہت متاثر ہوا تھا، اور پھر اس نے مشرکین مکہ کے وفد کو وہاں سے واپس لوٹ جانے کا حکم دیا تھا، جبکہ مسلمانوں کیلئے یہ فیصلہ سنایا تھا کہ یہ جب تک چاہیں یہاں ہمارے ملک میں راحت و سکون اور امن و امان کے ساتھ بے خوف و خطر زندگی پر کر سکتے ہیں (۱)

لہذا نجاشی تو تبھی سے رسول ﷺ نیز دینِ اسلام کی حقانیت سے واقف تھا اور اس چیز کا معرف بھی تھا، البتہ اب رسول ﷺ کی طرف سے اسے باقاعدہ دعوتِ اسلام کے سلسلے میں نامہ مبارک موصول ہوا تو اب اس نے باقاعدہ اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا، اور رسول ﷺ کی خدمت میں جوابی خط تحریر کر کے اس چیز کی باقاعدہ اطلاع بھی دی، جس پر آپؐ نے نہایت مسرت کا اظہار فرمایا اور اس کیلئے دعاۓ خیر بھی فرمائی۔

☆.....مقوس شاہ مصر:

ایک خط مقتوس شاہ مصر کو لکھا گیا، رسول ﷺ کے قاصد کی حیثیت سے مقتوس کو یہ خط حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے پہنچایا، مقتوس نے رسول ﷺ کے قاصد کا بہت زیادہ احترام کیا اور خوب مہمان نوازی کی، نیز دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں بہت سے سوالات کئے اور بہت سی معلومات حاصل کیں، جس پر وہ انتہائی متاثر ہوا، رسول ﷺ کی اور دینِ اسلام کی بہت زیادہ تعریفیں کرتا رہا اور اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتا رہا.....البتہ اصل مقصد جس کی خاطر یہ نامہ مبارک تحریر کیا گیا تھا.....یعنی اسے قبولِ اسلام کی دعوت دی گئی تھی، اس بارے میں وہ کچھ نہیں بولا.....مکمل خاموشی اختیار کئے رکھی..... اور آخر چند روز بعد رسول ﷺ کیلئے بہت سے قیمتی ہدایات تھائے اور یہکہ تمناؤں کے

(۱) اس بارے میں تفصیل ”بھرت جبش“ کے بیان میں لگز رچکی ہے، صفحہ: ۱۷۔

اظہار کے ساتھ اس نے آپؐ کے قاصد کو واپس روانہ کر دیا۔

☆..... ان بڑی بڑی سلطنتوں کے علاوہ متعدد چھوٹی بڑی ریاستوں کے حکمرانوں اور فرماں رواوں کو بھی دعویٰ خطوط تحریر کئے گئے، مثلاً بھرین اور عمان وغیرہ..... جس کے نتیجے میں ان میں سے کسی نے دینِ اسلام قبول کیا، کسی نے انکار کیا، اور کسی نے محض نیک تمناؤں کے اظہار پر اکتفاء کیا۔

غرضیکہ ان مختلف فرماں رواوں کے نام ان دعویٰ خطوط کے ذریعے ارشادِ ربانی: ﴿ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَ يُمِيتُ ﴾ (۱) یعنی ”آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے“ کی تعمیل بھی ہو گئی۔

نیز یہ کہ اس طرح دینِ اسلام کی نشر و اشاعت کا سلسلہ اب جزیرہ العرب کی حدود سے نکل کر بیرونی دنیا تک وسعت اختیار کر گیا، اور اب وہاں بھی دینِ اسلام کے بارے میں چچے ہونے لگے..... یوں مجموعی طور پر مسلمانوں کے حق میں یہ چیز بہت ہی مفید ثابت ہوئی اور اس کے خوشنگوار نتائج برآمد ہوئے۔

(۱) الاعراف [۱۵۸]

الحمد لله آن ج بتاریخ ۲ ذوالحجہ ۱۳۳۲ھ، مطابق ۲۰۱۳ء بروز پیر یہ بابِ مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبْ شَعَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

غزوہ خیبر:

ہجرت کے پھٹے سال جب صلیح حدیبیہ کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ اپنے جاں ثار ساتھیوں کے ہمراہ عمرہ کئے بغیر مکہ سے واپس مدینہ پہنچے، تو وہاں کچھ اس قسم کی خبریں موصول ہوئیں کہ خیبر کے یہودی بڑے لشکر کے ساتھ اور پوری تیاری کے ساتھ مدینہ پر حملہ کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔

اس سے قبل آپؐ یہودیوں کو ان کی مسلسل ریشہ دو انبیوں اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل سازشوں کی وجہ سے مدینہ سے نکال چکے تھے (۱) خیبر میں ان کی بڑی تعداد آباد تھی اور وہ ان کی قوت کا مرکز تھا، مزید یہ کہ مدینہ سے نکالے گئے ان کے بعض مشہور اور طاقتور قبیلے خصوصاً ”بنو نصریٰ“ اور ”بنو قریظہ“ بھی اب خیبر میں ان سے آملا تھے۔

صلیح حدیبیہ کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے جاں ثار ساتھیوں کو مشرکین مکہ کی طرف سے جب قدرے بے فکری نصیب ہوئی تو اب اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپؐ نے یہود کی سرکوبی کی غرض سے مناسب کارروائی کا فیصلہ فرمایا، چنانچہ اسی سلسلے میں طے یہ پایا کہ بجائے اس کے کہ بہیں مدینہ میں بیٹھ کر یہودی فوج کی یہاں آمد کا انتظار کیا جائے..... بہتر یہ ہے کہ خود ان کی طرف کوچ کیا جائے اور انہیں مزید مہلت نہ دی جائے۔

(۱) مدینہ سے یہود کے اخراج یا جلاوطنی کیلئے قرآن کریم میں ”حرث“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ان کے اس حرث کا مفصل تذکرہ ”سورۃ الحشر“ میں موجود ہے۔

چنانچہ سن سات بھری میں رسول ﷺ اپنے چودہ سو جان شاروں کے ہمراہ مدینہ سے سفر کرتے ہوئے تقریباً ایک سو پچاسی کلومیٹر کی مسافت پر واقع شہر "خیبر" پہنچ، مسلمانوں کی وہاں آمد پر وہ لوگ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے، جس پر مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا، مرد وقت کے ساتھ متعدد چھوٹے بڑے قلعے فتح ہوتے چلے گئے، کہیں معمولی مزاحمت ہوئی، کہیں بڑی جنگ کی نوبت بھی آئی، البتہ ایک بہت بڑا قلعہ تھا جہاں کارروائی آگئی نہیں کا بڑھ رہی تھی، محاصرہ کافی طول کپڑچکا تھا اور یہ چیز خود مسلمانوں کیلئے بھی کافی تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی..... آخر ایک روز رسول ﷺ نے فرمایا "لَا عَطِيَّنَ الرَّاِيَةَ غَدَأَ رَجُلًا يُحِبُّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيُحْبَهُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ" یعنی "کل میں جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے، اور اللہ اور رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں"۔

ظاہر ہے کہ رسول ﷺ کی طرف سے یہ بہت بڑی خوشخبری تھی..... اور بہت بڑی گواہی تھی..... اس شخص کے بارے میں کہ جسے کل علم سونپا جانا تھا اور سپہ سالاری و قیادت کی ذمہ داری جس کے حوالے کی جانی تھی..... اس کے حق میں یہ بہت بڑی گواہی تھی کہ وہ اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے، نیز اللہ اور رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔

چنانچہ لشکر میں موجود بڑے بڑے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے وہ رات اسی آرزو میں گذاری کر کاش کل صبح رسول ﷺ میر انام پکاریں..... اور جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو رسول ﷺ کی آواز گوئی "أَيْنَ عَلَى" یعنی "علی کہاں ہیں؟" تب حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضرِ خدمت ہوئے، رسول ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے انہیں علم عطا فرمایا، نیز فتح اور خیر و برکت کی دعائیں دیتے ہوئے انہیں رخصت فرمایا۔

رسول ﷺ کے حکم کی تعمیل میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اسلامی شکر کی قیادت کرتے ہوئے دشمن کی جانب پیش قدی کرنے لگے، آمنا سامنا ہوا، کافی سنسنی خیز اور اعصاب شکن قسم کی جنگ لڑی کی۔

اس موقع پر یہودی فوج کی قیادت ”مرحبا“ نامی شخص کر رہا تھا، جس کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا..... جس کی بہادری کے بڑے چرچے تھے..... مزید یہ کہ وہ اُس دور کا بڑا نامی گرامی پہلوان بھی تھا..... چنانچہ اس نے انتہائی غرور و تکبر کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لاکارا، جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر ایسا بھرپور وار کیا کہ غرور و تکبر کا وہ پتلا..... پلک جھکتے میں ہی زمیں بوس ہو گیا..... اور پھر آخر تمام شہر ”خیبر“ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گیا، اور رسول ﷺ اپنے شکر سمیت کامیاب و کامران واپس مدینہ تشریف لے

آئے۔



الحمد لله آج بتاریخ ۳ / ذوالحجہ ۱۴۳۷ھ، مطابق ۸ / اکتوبر ۲۰۱۳ء بروز منگل یہ باب مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبَّ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ

فتح مکہ:

مدنی زندگی کے تیسرا دور کا آغاز:

”صلح حدیبیہ“ کے بعد تقریباً دو سال امن سے گزرے، لیکن قریش مکہ کو یہ امن پسند نہ آیا..... اور انہوں نے عہد شکنی کی، ان کے ایک حلیف قبیلے ”بنو بکر“ نے مسلمانوں کے حلیف قبیلے ”بنو خزانہ“ پر ایک رات اچاک محملہ کر دیا، بہت سے لوگوں کو قتل کر دالا، بے حد نقصان پہنچایا، اور بڑی تعداد میں مویشی (۱) بھی ہنگامے لے گئے..... صلح حدیبیہ کی رو سے قریش کو چاہئے تھا کہ وہ اپنے حلیف قبیلے کو اس خوزریزی اور شر انگیزی سے روکتے، لیکن ایسا کرنے کی بجائے خود انہوں نے بھی اپنی فطری شر پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے جان و مال سے انہیں پوری طرح مدد فراہم کی، جو کہ اس معاهدہ صلح کی صریح خلاف ورزی تھی اور بہت بڑی عہد شکنی تھی۔

مسلمانوں کے حلیف قبیلے کا ایک وفد مکہ سے سفر کرتا ہوا مدینہ پہنچا، رسول ﷺ کے سامنے اس بارے میں فریاد کی، اور مدد کا طلبگار ہوا۔

اس پر رسول ﷺ نے فوری اقدام کے طور پر اپنا ایک قاصد قریش مکہ کی جانب روانہ فرمایا، تاکہ وہ انہیں یاد ہانی کرائے کہ ان کی یہ حرکت معاهدہ صلح کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

نیز اس موقع پر اس قاصد نے ان کے سامنہ وہ تین تجویز پیش کیں جو کہ رسول ﷺ

(۱) یہاں یہ وضاحت ہو جائے کہ اصل میں یہ لفظ ”مواثی“ ہے، لیکن چونکہ اردو میں یہ ٹے بیانے پر ”مویشی“ مشہور چکا ہے..... لہذا میں نے بھی مویشی ہی لکھنا مناسب سمجھا۔

نے اس قاصد کے ذریعے ان کیلئے بھجوائی تھیں:

☆ پہلی تجویز یہ کہ قریش مکہ اپنے حلیف قبیلے کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ مسلمانوں کے حلیف قبیلے کو پہنچنے والے نقصان کی مکمل تلافی کرے اور ”خون بہا“، غیرہ ادا کرے۔

☆ دوسری تجویز یہ کہ اگر وہ اپنے اس حلیف قبیلے کو نقصان کی تلافی پر مجبور نہیں کر سکتے تو پھر ان سے لائقی اور مکمل براءت و بیزاری کا اعلان و اظہار کریں۔

☆ اگر وہ ان مذکورہ دونوں تجویزوں میں سے کسی پر بھی عمل نہیں کرتے تو پھر تیسری اور آخری تجویز یہ کہ اس معاهدہ صلح کو ختم کر دیا جائے..... کیونکہ جس صلح کی نہ تو کوئی پابندی ہو، اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہو..... تو پھر ایسی صلح کا کیا فائدہ.....؟ کہ جس کی پابندی ہی نہیں کرنی۔

قریش مکہ نے اس قاصد کی زبانی رسول ﷺ کی طرف سے پیش فرمودہ یہ تینوں تجویزیں، اورتب انہوں نے گھمنڈ میں آ کر تیسری تجویز قبول کی، یعنی معاهدہ صلح کے خاتمے کا اعلان کر دیا، اور قاصد کو یہ کہتے ہوئے واپس چلے جانے کو کہا کہ ”آج کے بعد ہماری تمہاری صلح ختم.....“ اس کا صرتع مطلب یہ تھا کہ اب مشرکین مکہ کی طرف سے مسلمانوں کیلئے دوبارہ یہ ”اعلانِ جنگ“ تھا۔ (۱)

رسول ﷺ کا قاصد واپس مدینہ پہنچا، اور رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام صورت حال سے مطلع کیا..... اس پر آپ نے بھی اپنے جان ثار صحابہ کرام کو جنگ کیلئے تیاری کا حکم دیا، اور پھر سن آٹھ بھری میں جب رمضان کا مبارک مہینہ چل رہا تھا..... تب

(۱) اور یوں مدنی زندگی کا دوسرا دور حس کی ابتداء ”صلحِ حدیبیہ“ سے ہوئی تھی، دو سال جاری رہنے کے بعد اپنے اختتام کو پہنچا، اور اب تیسرے اور آخری دور کا آغاز ہوا۔

رسول ﷺ وس ہزار جاں شاروں پر مشتمل لشکر کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے مکہ کی جانب موسفر ہو گئے۔

اور جب یہ لشکر سیکڑوں میلیوں کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد مکہ کے مضامات میں پہنچا، تب مشرکین مکہ نے اس خدائی فوج کا جوش و جذبہ اور جاہ و جلال دیکھا..... تو وہ حیران و پریشان اور دم بخود رہ گئے، انہیں اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا..... اور تب انہیں اس لشکر کا مقابلہ کرنے کی یا آگے بڑھ کر کسی قسم کی مزاحمت یا مقابلہ کرنے کی جرأت ہی نہ ہو سکی..... اور یہ خدائی فوج اندر ون مکہ کی جانب مسلسل پیش قدمی کرتی چلی گئی۔

رسول ﷺ آج مکہ میں فتح کی حیثیت سے داخل ہو رہے تھے، آٹھ سال قبل آپؐ جہاں سے خفیہ طور پر انتہائی کسپری و بے بسی کے عالم میں نکلے تھے..... آج وہاں عظیم فتح و غالب کی حیثیت سے داخل ہوتے وقت کوئی جشن فتح نہیں تھا..... کوئی جوشِ انتقام نہیں تھا..... کوئی دھوم دھر کا نہیں تھا..... کوئی شادیا نے نہیں نجح رہے تھے..... کوئی فخر نہیں تھا..... کوئی غرور نہیں تھا..... اور کوئی لوٹ مار نہیں تھی..... وہاں تو بس یہ کیفیت تھی کہ..... آپؐ اپنے رب کے سامنے انتہائی خنثوں و خضوع کا مظاہرہ کرتے ہوئے..... اور اپنے رب کی تسبیح اور حمد و ثناء بیان کرتے ہوئے..... آگے بڑھ رہے تھے، اور اس قدر عجز و انکسار تھا کہ بار بار آپؐ کی پیشانی مبارک آپؐ کی اونٹنی کی گردان سے ٹکرائے گئی تھی..... (۱)

(۱) اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اس عظیم نعمت اور اتنی بڑی فتح کے موقع پر کہ جسے قرآن کریم میں ”فتح میمن“ کے نام سے یاد کیا گیا..... اس موقع پر آپؐ کا اپنے رب کے سامنے اس قدر عجز و انکسار اور خنثوں و خضوع..... یقیناً اس میں امت کیلئے بھی یہ اہم ترین سبق ہے کہ جس قدر اللہ کی طرف سے نعمتوں کا سلسلہ بڑھتا جائے اسی قدر بندہ مومین کی گردان بھی اپنے خالق و مالک کے سامنے جھکتی چلی جائے..... اور اسی قدر اس منعم و محنت کی عبادت اور اطاعت و فرمابنداری کا جذبہ بڑھتا چلا جائے.....

اس کیفیت میں آپؐ اپنے جاں شار ساتھیوں کی معیت میں مکہ شہر میں داخل ہوئے..... اور اس موقع پر مکہ شہر کے گلی کو چوں سے گذرتے وقت آپؐ نے اعلان فرمایا ”جو کوئی اپنے گھر کا دروازہ بندر کھے گا، اُس کیلئے امان ہے، جو کوئی بغیر ہتھیار کے خالی ہاتھ نظر آئے گا اس کیلئے بھی امان ہے، جو کوئی کعبۃ اللہ میں داخل ہو جائے، اس کیلئے بھی امان ہے۔“

اس موقع پر سردار ان قریش میں سے مشہور شخصیت ابوسفیان نے دین اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا، تب رسول اللہ ﷺ نے شہر مکہ میں ان کے مقام و مرتبے کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی دلجوئی کی خاطر یہ اعلان بھی فرمایا کہ ”جو کوئی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے، اس کیلئے بھی امان ہے۔“

قابل غور ہے یہ بات کہ فتح مکہ کے اس تاریخی موقع پر کہ جب رسول اللہ ﷺ کامل با اختیار اور غالب وفات تھے..... جبکہ قریش مکہ مغلوب ولا چارتھے..... لیکن اس کے باوجود آپؐ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی ایسا اعلان نہیں کیا کہ ”آج جو کوئی مسلمان ہو جائے، فقط اسی کیلئے امان ہے.....“ ایسی کوئی دھمکی نہیں دی کہ ”آج جان بچانے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ سب مسلمان ہو جاؤ.....“ بلکہ بس یہ فرمایا کہ جو کوئی اپنے گھر کا دروازہ بندر کھے..... یا بغیر ہتھیار کے نظر آئے..... اس کیلئے امان ہے..... یعنی جو تمیں تنگ نہیں کرے گا..... ہم بھی اسے تنگ نہیں کریں گے..... !!

☆..... اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے جاں شار ساتھیوں میں سے جو مہاجرین تھے کہ جن کا اصل وطن یہی شہر مکہ ہی تھا، آج وہ آٹھ سال بعد اپنے وطن، اپنے شہر، اور اپنے آباء اجداد کے گھروں کو دیکھ رہے تھے..... جہاں وہ پیدا ہوئے..... جہاں کھلے کو دے..... جہاں بچپن گذرا..... اور پھر آج سے آٹھ سال قبل انتہائی بے سر و سامانی اور کسی پرسی کی کیفیت میں

محجور ولاچار.....سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر.....بس خالی ہاتھ.....چل دیئے تھے.....یوں پرانی یادیں تازہ ہو گئیں.....اور ان کے دل بھرائے.....مگر اس موقع پر ان سب نے مکمل نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا.....جدبات کی شدت کے باوجود ان میں سے کسی نے آگے بڑھ کر یہ تقاضا نہیں کیا کہ یہ میراپنا گھر.....اب میرے حوالے کر دیا جائے.....کسی نے اپنے آبائی گھر.....زین جائیداد.....یامال و اسباب کی واپسی کا کوئی مطالبہ نہیں کیا.....اب ان کیلئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اور اطاعت و فرمانبرداری ہی سب سے بڑی دولت تھی !

☆.....اسی طرح شہر مکہ کے ان گلی کوچوں سے گذرتے ہوئے انہیں ہجرت سے پہلے کا وہ دور بھی یاد آیا.....مشرکین مکہ کی طرف سے وہ بدسلوکیاں.....وہ اذیت رسانیاں.....کس طرح ان ظالموں اور وحشیوں نے انہیں تیرہ سال مسلسل اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے رکھا.....ان کے ظلم و ستم کی ایک ایک داستان.....اور ایک ایک نقش ابھر کر.....آج ان کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا.....مگر اس کے باوجود.....آج تمام تقدیرت کے باوجود.....انہوں نے کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا.....کوئی قتل و غارتگری نہیں چاہی.....کوئی لوث کھسوٹ کا بازار گرم نہیں کیا.....

☆.....رسول ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ اسی طرح مسلسل پیش قدمی کرتے رہے.....حتیٰ کہ آخری منزل یعنی ”بیت اللہ“ تک جا پہنچے.....وہاں پہنچنے کے بعد آپ نے رُک کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی.....تب کیا منظر نظر آیا.....؟ ہر طرف وہی پرانے چہرےبڑے بڑے مجرم.....خونی اور قاتل.....وہی پرانے دشمن.....آج بے بس.....شرمندہ سر جھکائے ہوئے اور زگاہیں نیچی کے ہوئے نظر آئے.....یہ وہی لوگ جو آپ ﷺ

کے خون کے پیاس سے تھے..... جانی دشمن تھے..... جنہوں نے مکہ میں آپؐ کے قتل کی سازش کی..... آپؐ کے ساتھیوں کے ساتھ ہر قسم کا ظلم روا رکھا..... ہر قسم کی بدسلوکی کیلئے انہیں تنخیہ مشق بنائے رکھا..... اور پھر جب آپؐ نیز آپؐ کے ساتھی اپنے آبائی شہر مکہ کو..... نیزا پنے آبائی گھروں کو چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں ان مشرکین مکہ سے بہت دور چلے گئے..... ایک نئی جگہ..... جنبی اور نامانوس جگہ..... تب وہاں سینکڑوں میل دور مدینہ میں بھی ان مشرکین مکہ نے ان مسلمانوں کے خلاف اپنی شرارتوں اپنی سمازوں اور ایذا رسانیوں کا سلسلہ جاری رکھا..... وہاں مدینہ جا کر ان پر چنگیں مسلط کرتے رہے، انہیں نیست ونا بود کرڈالنے کے منصوبے بناتے رہے، وہاں اندر وہی چھپے ہوئے دشمنوں اور منافقوں کے ساتھ مل کر یہ وہی دشمن ہمیشہ ریشہ دوانیوں میں مشغول و منہمک رہے.....

اور اس سے بھی قبل جب نبوت کے پانچویں سال ان کے ظلم و ستم سے تگ آ کر پناہ کی تلاش میں بہت سے مسلمان مکہ سے بہت دور ملک جہشہ میں جا بسے تھے..... تب بھی یہ مشرکین مکہ وہاں اپنے فود بھیجتے رہے..... وہاں کے بادشاہ کو مسلمانوں کے خلاف مسلسل بھڑکاتے اور وغلاتے رہے..... تاکہ وہ دوبارہ ان مسلمانوں کو ان ظالموں کے حوالے کر دے.....

☆..... رسول ﷺ سے قبل مکہ میں قیام کے دوران کس قدر محبت، زمی، اور پیار کے ساتھ تیرہ سال مسلسل انہیں اللہ کے دین کی طرف بلا تے رہے..... تیرہ سال مسلسل ان پر ”اخلاق کے پھول“ بر ساتے رہے..... جبکہ جواب میں یہ مشرکین مکہ تو بس ہمیشہ پھر ہی بر ساتے رہے تھے.....

لیکن اس کے باوجود ادب فتح مکہ کے اس یادگار اور تاریخی موقع پر رسول ﷺ نے تما متر قدرت اور اختیار کے باوجود..... ان بدترین دشمنوں اور مجرموں سے کوئی انتقام یا کوئی سزا

تو در کنار..... انہیں کوئی ملامت تک نہیں کی
 ”عفو و درگذر“ کی تعلیم دینا بہت آسان ہے، لیکن عملی زندگی میں ان تعلیمات کو اپنانا
 اپنے قاتلوں، بدخواہوں، اور ستانے والوں کو مکمل قدرت واستطاعت کے باوجود یوں کسی
 ملامت کے بغیر معاف کر دینا..... یقیناً یہ توبس ”عنی رحمت“ ہی کی شان تھی
 ”عفو و درگذر“ کے باب میں ایسی روشن مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں اور نہیں مل سکے
 گی!.....

فتح مکہ کے اس تاریخی موقع پر رسول ﷺ کی طرف سے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ
 اس ”حسن سلوک“ سے یہ حقیقت بھی واضح و ثابت ہوتی ہے کہ دینِ اسلام توارکے زور
 سے نہیں پھیلا..... رسول ﷺ نے توارچلا چلا کر..... اور توارکی نوک سے ڈراڑا کر کسی
 کو مسلمان نہیں بنایا..... یہ دین تو آپؐ کی شب و روز اور صبح و شام دعوتی و اصلاحی کوششوں
 سے..... نیز آپؐ کے ”حسن اخلاق“ سے..... مشرق و مغرب میں اور دنیا کے کونے کونے
 میں پھیلا ہے.....

ہاں البتہ دشمنوں نے ہمیشہ توارکے ذریعے دینِ اسلام کا راستہ روکنے کی مذموم کوششیں
 کیں..... مگر..... دینِ اسلام توارکے مقابلے میں ہمیشہ پھلتا پھولتا ہی رہا..... اگر دینِ
 اسلام توارکے زور سے پھیلا ہوتا..... تو فتح مکہ کے موقع پر ان تمام بدترین دشمنوں کو تھے
 کرنے کیلئے..... اور..... ان کے سرلم کرنے کیلئے..... رسول ﷺ کی طرف سے فقط
 ایک اشارہ ہی بہت کافی تھا..... لیکن ایسا نہیں ہوا..... اس کے برعکس آپؐ نے اس موقع
 پر اپنے عمل سے ہمیشہ کیلئے دنیا کو بتا دیا کہ دینِ اسلام ”دینِ رحمت“ ہے۔

☆.....انصارِ مدینہ کی تشویش.....اور پھر مسرت.....:

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ متعدد نوں تک مکہ میں ہی مقیم رہے، ایک روز آپ ﷺ بیت اللہ کے قریب اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے ہوئے.....انہائی خشوع و خضوع اور انہاک کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ دعاء و مناجات میں مشغول تھے، اس موقع پر وہاں موجود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کچھ انصارِ مدینہ بھی تھے، جو بڑی ہی عقیدت و محبت کے ساتھ انہائی والہانہ انداز میں آپؐ کی جانب دیکھ رہے تھے.....دنیا و مافیہا سے بے خبر.....بس اسی نظارے میں محو تھے.....انہیں یہ منظر بہت ہی اچھا لگ رہا تھا.....اور وہ دل ہی دل میں رسول اللہ ﷺ کی اس کیفیت پر.....اور اس ادا پر.....فدا ہوئے جا رہے تھے.....کہ اچاک اسی لمحے ان میں سے کسی کے دل میں یہ خیال آیا کہ مکہ تو رسول اللہ ﷺ کا آبائی شہر ہے، جو کہ اب فتح ہو چکا ہے، اپنے آبائی شہر اور آبائی وطن سے محبت اور اس کے ساتھ جذباتی تعلق توہرانسان کیلئے فطری چیز ہے.....کہیں اب ایسا نہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ سوچیں کہ ”میرا اپنا شہر تو اب فتح ہو چکا، لہذا اب واپس مدینہ جانے کی بجائے یہیں مستقل قیام کر لیا جائے.....“ اور تب ہمارا کیا بنے گا.....؟ ہمارا کیا حال ہو گا.....؟ رسول اللہ ﷺ کی جدائی کا دکھ ہم کس طرح سہہ سکیں گے.....؟

دل میں یہ خیال آتے ہی وہ شخص پریشان ہو گیا.....کچھ تردود کے بعد اس نے اپنے برابر والے کے ساتھ سرگوشی کے انداز میں اپنی اس پریشانی کا اظہار کیا.....تب وہ بھی پریشان اور اداس ہو گیا.....اس نے کسی اور کے ساتھ سرگوشی کی.....اور یوں حضرات انصار جو تھوڑی در قبل تک رسول اللہ ﷺ کی اس ادا پر فریفہت ہوئے جا رہے تھے.....اور بہت زیادہ مسروں نظر آ رہے تھے.....اب یہک وہ سب اداس ہو گئے.....اور یہی بات سوچ کر

اب ان کی آنکھیں ڈبڈبائے لگیں.....

رسول ﷺ جواہتک اپنی اسی کیفیت کے ساتھ دعاء و مناجات میں مشغول تھے، جب حضرات انصار کی سرگوشیاں کچھ بڑھ گئیں..... تو آپ نے مردکر پیچھے کی جانب دیکھا، اور ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے.....؟ اس پر وہ سب گھبرا گئے اور یوں کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! کوئی بات نہیں ہے..... ہم تو بس یوں ہی آپس میں کچھ بات چیت کر رہے تھے..... لیکن رسول ﷺ ان کے چہروں پر پھیلی ہوئی اداسی..... اور ان کی آنکھوں سے چھکلتے ہوئے آنسو..... دیکھ پکڑتے تھے..... لہذا آپ نے بار بار اصرار فرمایا کہ مجھے بتاؤ..... کیا معاملہ ہے.....؟ آخر ڈرستے ڈرتے ان انصارِ مدینہ نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا..... تب رسول ﷺ نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے تبسم فرمایا..... اور پھر انہیں مخاطب کرتے ہوئے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: ”اے جماعتِ انصار! میرا جینا مرتنا..... تمہارے ہی ساتھ ہے.....“ رسول ﷺ کی زبان مبارک سے یہ جملہ سننے کے بعد وہ انصاری حضرات خوشی سے سرشار ہو گئے..... گویا ان کے دل جھوم جھوم اٹھے ہوں..... اور تھوڑی ہی دیر قل تک غم اور پریشانی کی وجہ سے ان کی جو آنکھیں ڈبڈبائی تھیں..... اب انہی آنکھوں میں ”خوشی کے آنسو“ چھلنے لگے..... !!

الحمد لله آن ج بتاریخ / ذوالحجہ ۱۴۳۲ھ، مطابق ۱۲/ اکتوبر ۲۰۱۳ء بروز ہفتہ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقْبَلِ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبَّ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

غزوہ حنین:

ماہ رمضان المبارک سن آٹھ بھری میں ”فتحِ کہ“ کا اہم ترین تاریخی واقعہ پیش آیا، اس کے فوری بعد جب رسول اللہ ﷺ اپنے جاں ثار ساتھیوں سمیت ابھی کہ میں ہی مقیم تھے کہ ماہ شوال میں ”غزوہ حنین“ کی نوبت آئی۔

اس غزوے کے موقع پر چونکہ بہت سے عجیب و غریب اور بالکل غیر متوقع قسم کے حالات و واقعات پیش آئے، اس لئے مفسرین و محدثین، نیز مورخین نے اس واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اس تما مرتفصیل کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

☆.....مکہ سے تقریباً ساٹھ میل (سو کلومیٹر) کے فاصلے پر مشہور تاریخی شہر ”طاائف“ آباد ہے، اُس دور میں طائف نیز اس کے مضافات میں چھوٹے بڑے بہت سے مشرق قبائل آباد تھے، جن میں سے بالخصوص ”ہوازن“ اور ”ثقیف“ نامی دو قبیلے بہت معروف تھے اور انتہائی طاقتور بھی تھے، فتحِ کہ کے فوری بعد ان قبائل کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ ایسا نہ کو کہ فتحِ کہ کے بعد اب مسلمان ان کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ان پر حملہ آور ہو جائیں.....

لہذا اس اندیشے کی وجہ سے ان کے ذمے دار اور با اثر قسم کے لوگ باہم مشاورت میں مشغول ہو گئے، اور اس بارے میں خوب غور فکر کے بعد آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بجائے اس کے کہ مسلمان خوب بے فکر اور بے غم ہو کر ہم پر حملے کے منصوبے بناتے رہیں اور پھر اپنی پسند اور مرضی کے مطابق جب مناسب سمجھیں ہمارے سروں پر آ ڈھکیں..... قبل اس کے کہ ایسی نوبت آئے، ہمیں چاہئے کہ ہم خود آگے بڑھ کر مسلمانوں پر بھر پور طریقے

سے حملہ آور ہو جائیں..... اور پھر بڑے زورو شور کے ساتھ ہنگامی طور پر انہوں نے اس حملہ کی تیاری شروع کر دی۔

☆..... ان دونوں ”مالک بن عوف“ نامی ایک شخص ان کا سپہ سالار تھا، جو کہ بہت جوشیلا اور طاقتور قسم کا انسان تھا، اُس وقت وہ جوان تھا، تیس سال عمر تھی، الہذا ”ہوازن“ و ”شفیف“ و دیگر متعدد جھوٹے بڑے قبائل کی طرف سے مشترک طور پر مسلمانوں کے خلاف اس حملے کے سلسلے میں وہی سب سے زیادہ بڑھ کر گرجو شی اور بیتابی کا مظاہرہ کر رہا تھا، البتہ یہ کہ اس میں جوش تو بہت زیادہ تھا، لیکن ہوش اور تجربے کی کمی تھی..... بہت سے تجربہ کار افراد نے اسے اس بارے میں سمجھا نے کی بہت کوشش کی، لیکن اس جوشیلے انسان نے کسی کی ایک نہ سنی، ان میں ڈرید بن الصمہ نامی ایک شخص جو کہ کافی عمر رسیدہ تھا اور بہت زیادہ تجربہ کا رجھی تھا اور اس سے قبل مختلف جنگوں کے موقع پر وہ ان قبائل کے سپہ سالار کی تجربت سے بھی فرائض انجام دے چکا تھا..... آخر اس نے مالک بن عوف سے ملاقات کی، اور اسے مسلمانوں کے خلاف جنگ چھیڑنے سے باز رہنے کی تلقین کی، کیونکہ بقول اس کے مسلمان اب بہت زیادہ طاقتور ہو چکے تھے، الہذا اب ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور دشمنی مول لینا کسی صورت مناسب نہیں تھا، مزید اس نے یہ اصرار کہی کیا کہ جب تک ہمیں مسلمانوں کی طرف سے جارحیت کے ٹھوس قرائن و شواہد نظر نہ آئیں اُس وقت تک یہ بات ہرگز ہمارے حق میں نہیں ہے کہ ہم خود ان پر حملہ آور ہو کر اپنے لئے بہت بڑا خطرہ مول لیں.....

لیکن مالک نے نہ تو اس کی بزرگی اور تجربہ کاری کا کوئی لحاظ کیا..... اور نہ ہی اس کی نصیحت کو قابل توجہ سمجھا..... آخر اس شخص نے مالک کی اس بے اعتنائی پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے

کہا کہ ”مالک! امیری یہ بات یاد رکھنا..... کہ مسلمانوں کے خلاف تم یہ جنگ کبھی نہیں جیت سکتے.....“، اس پر مالک اور زیادہ بگڑ گیا، اس نے اس عمر رسیدہ شخص کا..... اور اس کے ہمتوں اُس کا مذاق اڑایا اور انہیں بزدلی کا طعنہ بھی دیا..... اور اپنے جنگ کے اس فیصلے پر قائم رہا۔

نیز اس موقع پر مالک نے یہ بھی کہا کہ ”ان مسلمانوں کو کیا خبر کہ جنگ کس طرح لڑی جاتی ہے.....؟ انہوں نے تو اب تک کوئی جنگ لڑی ہی نہیں ہے..... کیونکہ اب تک جو ہوا وہ محض دکھاوا اور کھیل تماشا تھا..... یہ مسلمان دراصل مکہ ہی کے باشندے تھے..... اور ان کے مقابلے میں مشرکین بھی مکہ ہی کے باشندے تھے..... دونوں کا تعلق قبیلہ ”قریش“ سے تھا، آپس میں رشتے دار یاں تھیں اور ہمدرد یاں تھیں..... اس لئے بس دکھاوا کیلئے یہ آپس میں جھوٹ موت کی جنگیں لڑتے رہے..... اب ہم سے جب ٹکر ہوگی..... تب انہیں پتہ چل گا کہ جنگ کیا چیز ہوتی ہے.....؟“

اور پھر مزید یوں بھی کہنے لگا کہ ”یہ مسلمان تو مکہ سے ہی گئے تھے..... اور اب اپنے ہی شہر کہ واپس آگئے ہیں..... بھلاکی بھی کوئی جنگ ہوتی ہے.....؟ اپنے ہی شہر سے گئے تھے..... اور اپنے ہی شہر واپس آگئے ہے.....؟“

اور پھر شبِ وروز کی تیاری کے بعد چوبیس ہزار جنگجوں پر مشتمل لشکر جرأتیار کیا گیا، اس موقع پر ان کے سپہ سالار مالک بن عوف نے یہ حکم جاری کیا کہ مجاہِ جنگ پر روانگی کے وقت ہر شخص اپنے اہل و عیال، سونے چاندی کے زیورات، اموال و اسباب، نیز اپنے تمام مویشیوں سمیت جنگ کیلئے روانہ ہوگا، تاکہ دورانِ جنگ ہر کوئی مکمل استقامت و بہادری کے ساتھ اور خوب ڈٹ کر..... جان توڑ طریقے سے لڑے..... صورتِ حال کتنی ہی نازک

کیوں نہوجائے..... مگر یہ سوچ کر کسی کو میدانِ جنگ سے بھاگنے کی جرأت نہو کہ ”آج اگر میں بھاگ کھڑا ہو تو میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا.....؟ یہ تو دشمن کے ہاتھ لگ جائیں گے..... پھر نہ جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہو گا.....؟“ اور یوں اس کے اپنے ہی بیوی بچے اور اموال و اسباب اس کیلئے قدموں کی زنجیر بُن جائیں۔

اس موقع پر رُدیْد بن الصُّمَه نامی اُس تجربہ کا راوی عمر رسیدہ جنگجو نے دوبارہ اپنے جوان اور جو شیلے سپہ سالار مالک بن عوف سے ملاقات کر کے اسے یہ سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ میدانِ جنگ میں اگر صورتِ حال نازک شکل اختیار کر گئی تو ایسے میں بھاگتے ہوئے اور شکست خورده سپاہی کو شاید توار اور نیزے سے تو کچھ فائدہ پہنچ سکے..... لیکن بیوی بچوں سے اسے کیا فائدہ پہنچ سکے گا.....؟ بلکہ ایسے نازک موقع پر تو وہ مزید در دسر بن جائیں گے..... ایسے میں بے چارہ سپاہی اپنی فُکر کرے گا..... یا بیوی بچوں کی.....؟

لیکن جوان اور جو شیلے سپہ سالار حسپ معمول اس بار بھی اس تجربہ کا راوی سعیدہ بُوڑھ جنگجو کی بات کو لمحہ بھر کیلئے بھی خاطر میں نہ لایا..... اور یوں مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کر دلانے کا عزم لئے ہوئے اپنے لشکرِ جرار کی قیادت کرتا ہوا طائف سے کمکی جانب روایہ دوال ہو گیا۔

اُدھر مکہ میں جب رسول اللہ ﷺ کو ہوا وزن اور ثقیف کے ان خطرناک عزم کے بارے میں علم ہوا تو آپؐ نے بھی یہ فیصلہ فرمایا کہ یہاں مکہ میں بیٹھ کر دشمن کا انتظار کرنے کی بجائے ہمیں بھی دشمن کی جانب کوچ کرنا چاہئے تاکہ یہاں تک پہنچنے سے قبل ہی اس کا راستہ روکا جاسکے۔

چنانچہ سن آٹھ بھری میں بتارخ ۲۰ / شوال رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے

مکے سے طائف کی جانب روایہ دواں ہو گئے، یہ لشکر آپ ﷺ کے اُن دس ہزار جال شار ساتھیوں پر مشتمل تھا جو مدینہ سے ہی فتح مکہ کے موقع پر آپؐ کے ہمراہ آئے تھے، جن میں مہاجرین و انصار دونوں شامل تھے، مزید یہ کہ فتح مکہ کے موقع پر بڑی تعداد میں مکہ کے باشندوں نے دینِ اسلام قبول کیا تھا، اب ان میں سے بھی دو ہزار افراد اس لشکر میں شامل ہو گئے تھے، یوں اب یہ اسلامی لشکر کل بارہ ہزار افراد پر مشتمل تھا۔

مکہ سے روانگی کے بعد ”حنین“ نامی مقام پر دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہو گیا، اس موقع پر باقاعدہ اور بھرپور جنگ کے آغاز سے قبل یہ صورتِ حال پیش آئی کہ یہاں پہاڑی دڑوں اور تنگ و تاریک پہاڑی راستوں میں بہت بڑی تعداد میں دشمن کے تیرانداز چھپے بیٹھے تھے، وہ اسی موقع کے انتظار میں یہاں چھپے بیٹھے تھے کہ مسلمانوں کا لشکر جب یہاں پہنچے گا تو اس پر ان تنگ و تاریک راستوں میں اچانک تیروں کی برسات کردی جائے گی.....
 چنانچہ مسلمان جب ان تنگ و تاریک اور انتہائی دشوار گذار اور خطرناک قسم کے پہاڑی راستوں سے گذر رہے تھے.....تب وہاں چھپے ہوئے دشمنوں نے منصوبے کے عین مطابق اچانک ان پر بہت بڑے پیکانے پر تیراندازی شروع کر دی.....جس کی وجہ سے مسلمان فوری طور پر سنبھل نہ سکے، پریشان اور منتشر ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے.....انتابہ لشکر.....
 بارہ ہزار اس طرف.....چو میں ہزار اس طرف.....اور پھر لاتعداد اور بے شمار اونٹ گھوڑے اور دیگر مویشی جو کہ وہ طائف والے اپنے سپہ سالار کے حکم پر اپنے ہمراہ لائے تھے.....اب یہ سب سر پٹ ادھر ادھر دوڑتے ہوئے تباہی پھیلانے لگے.....اس تمامتر بنظmi، افراتفری، انتشار اور بھاگ دوڑ کے نتیجے میں اس قدر گرد و غبار اڑا.....کہ دن کے وقت رات کا گمان ہونے لگا.....اور ہر طرف اندر ہیراچھا گیا.....جو کہ مسلمانوں کیلئے مزید

پریشانی و سراسمگی کا سبب بنا..... آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ بھی برقرار نہ رہ سکا..... اور یوں وہ سب ایک دوسرے سے بے خبر..... ان انجان اور گمنام راستوں میں ادھر ادھر بکھر گئے.....

اس موقع پر رسول ﷺ نے بار بار باؤ اوز بلند اپنے پرانے ساتھیوں کو پکارا کہ ”یہاں چلے آؤ..... میں یہاں ہوں“

مزید یہ کہ اس نازک ترین صورتِ حال میں کہ جب رسول ﷺ کے ساتھیوں میں سے محض اکاد کا چند افراد آپؐ کے ہمراہ تھے..... اور اس نادر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپؐ تک رسائی دشمن کیلئے بہت آسان تھی..... ایسے میں آپؐ دشمن سے خوفزدہ ہونے اور چھپنے کی بجائے..... بار بار باؤ اوز بلندیہ اعلان فرماتے رہے ”آنَا النَّبِيُّ لَا كَذْبٌ“، یعنی ”میں سچانی ہوں..... اور اس بات میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔“

اس پُرسا را اور وحشتاک ماحول میں رسول ﷺ کی یہ صداجب بار بار فضا میں بلند ہوئی اور آپؐ کی مبارک آواز جب آپؐ کے جان ثار ساتھیوں کی سماut سے ٹکرائی تو ان کے شعور و وجہ ان پر عجب کیفیت طاری ہو گئی، ان کے دلوں میں ایک نیا ولہ اور نیا جذبہ پیدا ہوا، جو لوگ سر اسی بہ، بد حواس، اور منتشر ہو چکے تھے اب وہ ”لبیک..... لبیک“ کی صدائیں بلند کرتے ہوئے دیوانہ وار اس جانب بڑھنے لگے کہ جہاں سے یہ آواز آ رہی تھی.....

نیز اس موقع پر آپؐ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی آپؐ کے ہمراہ تھے، جن کی آواز قدرتی طور پر کافی بلند تھی، آپؐ کے ساتھ اب وہ بھی بار بار مسلمانوں کو باؤ اوز بلند پکار کر آگاہ کرنے لگے کہ ”ادھر آؤ..... رسول ﷺ یہاں ہیں“۔

آخر ان حضرات نے رسول ﷺ کے ارد گرد جمع ہو کر اپنی صفوں کو دوبارہ منظم کیا، اور پھر

ایسا زور دار حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے، اور وہ اپنی تمام ترقوت اور عددی برتری کے باوجود ہزیریت کے داغ دل پر لئے ہوئے..... میدان چھوڑ کر یوں بھاگا..... کہ پھر پلٹ کر پچھے نہیں دیکھا.....!

☆..... اس جنگ کے موقع پر دشمن فوج کا وہ انہائی جوشیلا اور جذباتی قسم کا سپہ سالار ”مالک بن عوف“ جو کہ دراصل اس جنگ کا سر غنہ تھا، اور اس تمام تر مصیبت اور لشکر کشی کا اصل سبب اور اصل محرک تھا..... اب جنگ کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں دریافت فرمایا کہ اُس کا کیا بنا؟ کیا وہ مارا گیا؟ یا کہیں زندہ سلامت موجود ہے.....؟ چنانچہ اس کے انجام کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں، اور تحقیق و تجویز کے بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ جب اسے اپنی شکست یقینی نظر آنے لگی تھی تب وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا، اور یہ کہ اب وہ طائف میں کسی جگہ روپوش ہے۔

یہ اطلاع ملنے پر رسول اللہ ﷺ نے اس کی تلاش کا اور اس تک یہ پیغام پہنچانے کا حکم دیا کہ ”اگر وہ مسلمان ہو جائے تو اسے معاف بھی کر دیا جائے گا، نیز یہ کہ بڑی مقدار میں اس کا جو مال و اسباب مسلمانوں کے ہاتھ لگا ہے، وہ بھی اسے لوٹا دیا جائے گا“۔ چنانچہ اسے تلاش کیا گیا، اور پھر آپؐ کی طرف سے یہ پیغام بھی اس کے گوش گزار کر دیا گیا، جس پر وہ مکہ کے قریب ”جرانہ“ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور قبولِ اسلام کا اعلان کیا، تب آپؐ نے صرف یہ کہ حسب وعدہ اسے معاف فرمایا..... اس کا تمام مال و اسباب اسے لوٹا یا..... بلکہ اس کے علاوہ یہ کہ اسے مزید سوانح بھی عطا فرمائے..... آپؐ کی اس خوش اخلاقی و فیاضی سے مالک بن عوف انہائی متاثر ہوا اور وقتاً فوقتاً آپؐ کی مدح میں قصیدے کہتا رہا..... اس سلسلے میں اس کے متعدد تصاویر مشہور نیز

کتب تاریخ میں مذکور ہیں (مثلاً: اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابة، حرف الکم - ۳۶۲۶) اور یوں وہ جو شیلا سپہ سالار جو کہ اب تک محض مالک بن عوف تھا..... اب وہ رسول اللہ ﷺ کے جاں ثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں شامل ہو گیا اور محض "مالک بن عوف" کی بجائے اب وہ حضرت مالک بن عوف رضی اللہ عنہ بن گئے۔ (۲)

☆..... قرآن کریم میں غزوہ حنین کے موقع پر پیش آنے والی صورتِ حال کا یوں تذکرہ کیا گیا ہے: ﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَ يَوْمَ حُنَيْنٍ إِذَا عَجَبْتُمْ كُثُرَتُكُمْ فَلَمْ تُفْنِ عَنْكُمْ شَيْئاً وَ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحِبَتْ ثُمَّ وَلَيْتَمْ مُدَبِّرِينَ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَ أَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَ عَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ ذَلِكَ جَرَأْوَ الْكَافِرِينَ ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَلَى مَنِ يَشَاءُ وَ اللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (۳)

ترجمہ: (یقیناً اللہ نے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی کہ جب تمہیں اپنی کثرتِ تعداد پر ناز ہونے لگتا تھا، لیکن یہ چیز تمہارے کسی کام نہ آئی، اور زمین اپنی کشادگی کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر مر گئے، پھر اللہ نے اپنی طرف سے تسلیم نازل کی اپنے رسول پر اور مؤمنین پر، اور ایسے لشکر بھیجے جنہیں تم دیکھنے ہیں رہے تھے اور کافروں کو پوری سزا دی، ان کافروں کا یہی بدلتا تھا، پھر اس کے بعد بھی اللہ جس پر

(۱) خلیفہ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں رو میوں اور فارسیوں کے خلاف لڑی جانے والی بڑی جنگوں کے موقع پر یہی حضرت مالک بن عوف رضی اللہ عنہ ہمیشہ پیش پیش رہے، خصوصاً "جنگ قادریہ" کے یادگار موقع پر انہوں نے بڑی خدمات انجام دیں اور اسلامی لشکر کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقار رضی اللہ عنہ کی مشاورت و معاونت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے (اسد الغاب [۳۶۲۶] وغیرہ)۔

(۲) التوبہ [۲۵-۲۷] (۳) یعنی فرشتوں کا لشکر۔

چا ہے اپنی رحمت کی توجہ فرمائے گا، اور اللہ تو بخشنے والا ہم بران ہے) دراصل اس جنگ کے موقع پر ایک قبل ذکر صورت حال یہ پیش آئی کہ اس روز مسلمان اپنی کثرتِ تعداد کی وجہ سے بہت خوش تھے، اور بلی خوشی نہایت بے فکری کے ساتھ مکہ سے میدانِ جنگ کی طرف رواں دواں تھے، اگرچہ انہیں اس بات کا خوب علم تھا کہ دشمن کی تعداد چوپیں ہزار ہے..... جبکہ یہ خود بارہ ہزار تھے..... لیکن اس کے باوجود بہت ہی مسرورو مطمئن تھے، کیونکہ اتنی بڑی تعداد پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی، پہلے تو ہمیشہ مسلمانوں کی تعداد اس سے بھی کم ہی رہی تھی، مثلاً غزوہ بدرا کے موقع پر مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے اور مشرکین ایک ہزار تھے..... یعنی دشمن کے مقابلے میں مسلمان آدھے سے بھی کم تھے..... لیکن اس کے باوجود ہمیشہ مسلمانوں کو ہی غلبہ نصیب ہوا تھا..... جبکہ آج تو مسلمان پہلی بار دشمن کے مقابلے میں آدھے تو تھے..... دشمن کی تعداد ہے چوپیں ہزار..... اور مسلمان ہیں بارہ ہزار..... اللہ اپنی اس کثرتِ تعداد کی وجہ سے اس روز مسلمان بہت خوش اور بے فکر تھے، اور یوں ہنسی خوشی میدانِ جنگ کی طرف رواں دواں تھے..... حالانکہ مومن کی شان یہ ہوئی چاہئے کہ ظاہری اسباب کی بجائے اس کی نظر ہمیشہ صرف اللہ پر ہو، تمام اعتماد صرف اللہ کی طرف سے مدد و نصرت پر ہو، اسی کے ساتھ ہمیشہ لوگائی جائے، اور اسی سے فریاد کی جائے، اسباب کو اختیار تو ضرور کیا جائے، لیکن نظر مسبب الاسباب پر ہو.....

اللہ عزوجل کی طرف سے مسلمانوں کیلئے فوری تنقیبہ کا اور ہمیشہ کیلئے ایمانی تربیت کا یوں انتظام کیا گیا کہ اس روزان کی یہ کثرتِ تعداد ان کے کسی کام نہ آئی..... کثرتِ تعداد کے باوجود وہ دشمن کی طرف سے تیروں کی اس اچانک بوچھاڑ کے موقع پر ثابت قدم نہیں رہ

سکے..... اور بھاگ کھڑے ہوئے.....

اور پھر اس فوری سبق اور عملی و واقعاتی تنبیہ اور تربیت کے بعد اللہ کی طرف سے رحمت اور مدد و نصرت کا انتظام بھی فرمادیا گیا کہ مسلمانوں کے دلوں میں ”سکون و اطمینان“ کی نعمت ڈال دی گئی، ان کے دلوں سے دشمن کا خوف جاتا رہا، اور وہ دوبارہ منظم ہوئے اور خوب شجاعت و ثابت قدمی کے ساتھ لڑے، اور پھر اللہ کی طرف سے ان کیلئے مزید مدد کے طور پر فرشتوں کا لشکر بھی بھیجا گیا..... تاکہ کافروں کو خوب اچھی طرح سزا دی جاسکے.....

☆ گذشتہ سطور میں بیان کردہ اس تفصیل سے اس غزوے کی ایک خاص بات تو یہ واضح ہو گئی کہ اس موقع پر مسلمانوں کی طرف سے اپنی کثرت تعداد پر نظر کی وجہ سے جو بے فکری کا اظہار تھا..... یہ بات اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو پسند نہیں آئی، جس کی وجہ سے فوری اور نقد سبق سکھا دیا گیا کہ ظاہری اسباب کو اختیار تو ضرور کیا جائے، لیکن بھروسہ صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر ہی کیا جائے جو کہ مسبب الاسباب ہے، اور اسی سے مدد و نصرت طلب کی جائے۔

اس کے علاوہ مزید یہ کہ اس غزوے کے موقع پر کچھ اور ایسے مخصوص حالات و واقعات پیش آئے کہ جن کی وجہ سے حضرات مفسرین و محدثین، نیز مومنین نے بڑی اہمیت کے ساتھ اس غزوے کا تذکرہ کیا ہے، اس بارے میں خلاصہ درج ذیل ہے:

☆ یہ غزوہ فتح مکہ کے بعد بالکل ہی اچانک اور غیر متوقع پیش آگیا..... کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس غزوے کی نوبت آئے گی۔

☆ اسلامی لشکر اصل میں تو ان دس ہزار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر مشتمل تھا جو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ فتح مکہ کے موقع پر مدینہ سے آئے تھے، لیکن چونکہ فتح مکہ کے

موقع پر بہت بڑی تعداد میں مکہ کے باشندے مسلمان ہو گئے تھے (حالانکہ رسول ﷺ نے کسی کو قبولِ اسلام پر مجبور نہیں کیا تھا) اب یہ لشکر جب غزوہ حنین کیلئے مکہ سے روانہ ہوا تو اس میں ان نو مسلموں میں سے بھی دو ہزار افراد شامل ہو گئے، یوں کل تعداد بارہ ہزار ہو گئی۔

☆..... یہ نو مسلم اگرچہ جسمانی طور پر تو یقیناً صحمند، بہترین جنگجو، اور فنوں سپہ گری سے بخوبی واقف اور آزمودہ کا رسپا ہی ہوں گے..... لیکن ان کی ایمانی و اخلاقی تربیت ابھی نہیں ہوئی تھی، کیونکہ یہ بالکل نو مسلم تھے، ان میں سے کوئی اسی دن مسلمان ہوا تھا..... کوئی ایک دور و زقبل..... کوئی ہفتہ یاد روز قبل..... لہذا ذہنی و فکری تربیت اور ایمانی و اخلاقی کیفیت کے لحاظ سے ان میں اور اصل لشکروں والوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا..... کہاں یہ لوگ جو محض ایک دور و زقبل ہی مسلمان ہوئے..... اور کہاں وہ ”السابقین الاولین“..... وہ ابتدائی دور کے مسلمان..... وہ مہاجرین و انصار..... وہ ”بدری“، ”حضرات“..... وہ ”بیعت رضوان“، ”والے“..... اور ”بیعت عقبہ“، ”والے“.....

جبکہ کسی بھی لشکر کی کامیابی اور عمدہ کارکردگی کیلئے یہ بات انتہائی ضروری ہوا کرتی ہے اس لشکر میں شامل تمام افراد کی جسمانی صلاحیت اور تربیت کے ساتھ ساتھ..... ان کی اخلاقی، فکری اور ذہنی تربیت اور کیفیت بھی ایک ہی جیسی ہو..... ان کے ذہنی و فکری معیار میں یکسا نیت و مثالثت ہو..... جبکہ فتح مکہ کے بعد یہ لشکر جب حنین کی جانب روانہ ہوا..... تب یہ یگانگت اور مثالثت کافی حد تک مفقود و محروم ہو چکی تھی..... ذہنی و فکری توازن بگڑ پکا تھا.....

☆..... اس کے علاوہ مکہ کے باشندوں میں سے بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ بھی لشکر

کے ہمراہ ہوئے تھے جو محض ”تماشائی“ بنے ہوئے تھے، جن کی دینی کیفیت کے بارے میں کسی کو کچھ اندازہ ہی نہیں تھا کہ ان میں سے کون دینِ اسلام قبول کر چکا ہے.....؟ اور کون ابھی تک کفر و شرک پر ہی قائم ہے.....؟ متعدد مفسرین و محدثین، اور اسی طرح موئین نے ان تماش بینوں کیلئے ”طلقاء“ کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے لفظی معنی ہیں ”آزاد.....بے لگام.....جو خود کو کسی ضابطے یا کسی قaudہ و قانون کے پابند نہ سمجھتے ہوں“۔ (۱)

چنانچہ ان ”طلقاء“ کی ڈینی کیفیت اور سوچ یہی تھی کہ انہیں حق و باطل کے مابین معرکے سے کوئی غرض نہیں تھی، بلکہ ان کا اصل مقصد یہی تھا کہ دونوں فریقوں میں سے جس کسی کی بھی جیت ہو جائے گی بس اسی کے ساتھ مل جائیں گے..... جہاں فائدہ نظر آئے گا اسی طرف لڑھک جائیں گے..... اور جہاں کوئی خطرہ نظر آئے گا تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہوں گے.....

بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان ”طلقاء“ میں بہت سے ایسے افراد بھی شامل تھے کہ جن کے متعدد رشته دار گذشتہ بیگلوں کے موقع پر مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے، اور انہیں یہ علم بھی تھا کہ ہمارے ”فلان“، رشته دار کو ”فلان“، جنگ کے موقع پر ”فلان“، مسلمان نے قتل کیا تھا، اور یہ کہ وہ ”فلان“، مسلمان اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اسلامی لشکر میں موجود ہے..... الہذا ان کے دلوں میں ”انتقام“ کی آگ بھڑک رہی تھی، فتح مکہ سے قبل کوئی

(۱) بہت سے موئین کے بقول یہ لفظ ”طلقاء“، دراصل رسول اللہ ﷺ کے اُس جملے سے مآخذ ہے جو آپؐ نے فتح مکہ کے موقع پر مکہ والوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: ”اذهبو أنتم الطلقاء“، یعنی ”جاؤ، آج تم سب آزاد ہو، الہذا“ غزوہ حنین“ کے موقع پر یہ تماثر نامناسب رو یہ و سلوک دکھانے والے یا لوگ دراصل وہی تھے..... واللہ أعلم -

ایسی صورت ممکن نہیں تھی کہ مسلمانوں اور شرکیں مکہ کے مابین یوں آزادانہ میل جوں ہو سکے..... لیکن اب فتح مکہ کے فوری بعد صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ حالات نے اب ان سب کو بچا کر دیا تھا، لہذا ان کیسے پور مشرکین کیلئے انتقام کی آگ بجھانے کا یہ نادر موقع تھا..... اور اپنے اسی ناپاک مقصد کی تکمیل کے ارادے سے یہ لوگ ہمراہ ہولئے تھے کہ جب جنگ عروج پر ہوگی..... ہر طرف افراتفری ہوگی..... کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہوگا..... ایسے میں موقع پا کر ہم اس ”فلان“ کو ٹھکانے لگا دیں گے.....!

☆..... اور پھر جب تنگ و تاریک پہاڑی راستوں میں چھپے ہوئے ان انتہائی ماہراور نشانے باز تیر اندازوں کی طرف سے تیروں کی زبردست بوچھاڑ کا سلسہ شروع ہوا..... تو ایسے میں سب سے پہلے یہی ”طلقاء“ پیٹھ پھیر کر بھاگے..... اور اس طرح غیر منظم طریقے سے بھاگے کہ باقی صفوں کو بھی خراب کیا..... جو راستے میں آیا اُسے روندوالا..... یوں یہ لوگ انتہائی بدھی اور افراتفری کا سبب بنے، تمام لشکر میں گڑ بڑا نہیں کی وجہ سے پھیلی اور بھگڑا نہیوں نے ہی مچائی.....

اور پھر جب رسول اللہ ﷺ نے، باؤا ز بلند بار بار پکارا..... نیز حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی بار بار پکارتے رہے..... تب مخلص لوگ تو اس پکار پر ”لبیک..... لبیک“ کی صدائیں بلند کرتے ہوئے دیوانہ وار وہاں حاضر ہو گئے..... جبکہ یہ ”طلقاء“ یہ پکار سن کر بھی نہیں پڑے..... اور مستقل میدان چھوڑ کر ہی بھاگ گئے..... حتیٰ کہ رُ کے بغیر سیدھے واپس مکہ جا پہنچے اور اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھ گئے.....

☆..... چنانچہ ان ”طلقاء“ کے بغیر ہی جنگ کے باقی تمام مرحل طے ہوئے ہتھی کہ یہ ”غزوہ حنین“ اپنے اختتام کو پہنچا، اور اس اختتام کے موقع پر کیفیت یہ تھی کہ مسلمانوں کے

ہاتھوں ان طائف والوں کو انتہائی بدترین اور سوا کن شکست و ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا، ان کے بڑے بڑے اور ناموقوم کے سرداروں میں سے ستر مارے گئے، بہت سے قیدی بنائے گئے، جبکہ عام سپاہیوں میں سے چھ ہزار کو قیدی بنایا گیا، نیز چونکہ اس جنگ کے موقع پر اپنے جوشی سے سالار کے حکم کی تعمیل میں یہ لوگ اپنے بیوی بچے اور مویشی وغیرہ سبھی کچھ بہت بڑی مقدار میں ہمراہ لائے تھے، اس لئے بڑی مقدار میں مختلف قسم کا مال و متاع، سونا چاندی، نیز چوبیں ہزار بکریاں بطور "مال غنیمت" مسلمانوں کے ہاتھ لگیں۔

☆..... جنگ ختم ہونے کے بعد رسول ﷺ نے مال غنیمت کی تقسیم فوری شروع نہیں کی، بلکہ چند دن انتظار فرمایا کہ شاید یہ "طلاقاء" واپس آجائیں اور اپنے بھاگ کھڑے ہونے پر معذرت کریں..... لیکن وہ نہ آئے..... اور پھر جب آپؐ نے تقسیم کا کام شروع فرمایا..... تب یہ لوگ فوراً ہی موقع پر پہنچ گئے اور خوب زورو شور کے ساتھ مانگنے لگے..... اور ان کے اس نامناسب رویے کے باوجود آپؐ ان کے مطالبات کے جواب میں انہیں بہت کچھ عطا فرماتے رہے.....

دراصل آپؐ کی مثال کسی ماہر ترین معانج اور بیض شناس کی مانند تھی کہ جو پہلے خوب مہارت کے ساتھ مرض کی تشخیص کرتا ہے، اور پھر خوب کارگر اور موثر قسم کا اعلان تجویز کرتا ہے..... آپؐ کو ان کے مرض کے بارے میں خوب علم تھا..... آپؐ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ انہوں نے اب تک اپنی تمام عمر دنیا کے خیریں مال و دولت پر لپکنے اور جھپٹنے میں گذاری ہے..... بس یہی ان کا سب سے بڑا روگ ہے..... لہذا آپؐ ان کیلئے کارگر اور موثر ترین علاج سے بھی بخوبی واقف تھے..... اور وہ علاج یتھا کہ فی الحال ان کی تأکیف قلب کیلئے

جو کچھ مال و دولت یہ مانگتے ہیں، انہیں دے دیا جائے ہے تاکہ اس ”دجوئی“ کے ذریعے ابتدائی طور پر ان کے دلوں میں کسی نہ کسی درجے میں دینِ اسلام کے ساتھ تعلق اور ”وابستگی“ پیدا کی جاسکے.....!

چنانچہ وقت نے ثابت کیا کہ آپ ﷺ کی طرف سے تجویز فرمودہ یہ علاج انتہائی کارگر ثابت ہوا، یہ لوگ آپ ﷺ کے اس حسن سلوک اور فیاضی سے انتہائی متاثر ہوئے جس کے نتیجے میں باہمی میل جوں کے سلسلے بڑھے تو رفتہ رفتہ ان کے دلوں میں ایمان بھی راست ہونے لگا..... اور آخر آئندہ چل کر یہ لوگ اچھے اور سچے مسلمان ثابت ہوئے۔

☆..... ”طلقاء“ میں مال غنیمت کی بڑے پیمانے پر تقسیم کے علاوہ اُسی موقع پر ایک اور بڑی عجیب و غریب اور غیر متوقع قسم کی صورتِ حال یہ پیش آگئی کہ یہ ہوازن اور ثقیف والے جنگجو جن کے چھوٹے بڑے قبائل بڑی تعداد میں طائف اور مکہ کے مابین پھیلے ہوئے تھے..... اور جو کہ اس جنگ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تما متر مشکلات و مصائب کے اصل ذمہ دار تھے..... مال غنیمت کی تقسیم کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے مخصوص مصلحت کی بناء پر ”طلقاء“ کو بہت کچھ عطا فرمایا..... تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب انہی قبائل ”ہوازن“ اور ”ثقیف“ کے (یعنی طائف والوں کے) بڑے بڑے سردار بھی بڑی تعداد میں آپنے، انہی سرداروں میں رسول اللہ ﷺ کا رضاعی چچا ”ابو بر قان“ بھی موجود تھا (۱) ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے بڑے زورو شور کے ساتھ اور انتہائی در دانگیز

(۱) رسول اللہ ﷺ کی رضاعی والدہ حلیمه سعدیہ کا تعلق قبیلہ ”بنو سعد“ سے تھا اور اسی نسبت کی وجہ سے انہیں ”سعدیہ“ کہا جاتا تھا اور یہ قبیلہ بنو سعد دراصل اسی بڑے قبیلے ”ہوازن“ ہی کا ذیلی قبیلہ تھا، لہذا ”بنو سعد“ والے بھی ”ہوازن“ ہی کے ایک جزء کے طور پر مسلمانوں کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ میں شامل تھے۔

طریقے سے فریاد کا سلسلہ شروع کیا، اور یوں کہنے لگے کہ ہمارے گھر بارہ ہمارے جانو اور مویشی ہمارے اموال و اسباب سمجھی کچھ لٹ گیا اب ہمارا کیا بنے گا؟ ہم پر حرم کیا جائے اگر قیصر یا کسری کے سامنے ہم اس طرح گڑ گڑاتے اور وہ لوگ ہماری یہ حالت زار دیکھتے تو وہ بھی ہمیں ہرگز خالی ہاتھ نہ لوٹاتے تو پھر آپ کو تو اللہ نے اخلاقِ فاضلہ میں سب سے ممتاز فرمایا ہے لہذا ہمیں خالی ہاتھ نہ لوٹائیے گا“ ان کی یہ فریاد اور یہ گریہ وزاری دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کیلئے انہیں خالی ہاتھ لوٹانا بہت مشکل ہو گیا چنانچہ آپ نے انہیں بھی بہت کچھ عطا فرمادیا!

اور پھر وقت نے یہ ثابت کیا کہ آپ نے اس بصیرت اور فراست کی بناء پر انہیں خالی ہاتھ نہ لوٹانے کا جو مدد برانہ فیصلہ فرمایا تھا، وہ بہت ہی مفید ثابت ہوا اور اس کے ثبت نتائج فوری طور پر ہی ظاہر ہونے لگے چنانچہ آپ کی اس سخاوت و فیاضی اور خوش اخلاقی سے متاثر ہو کر یہ بڑے بڑے سردار اور روساء قوم کے لوگ بڑی تعداد میں مسلمان ہو گئے، اور پونکہ اپنی اپنی قوم میں اور اپنے علاقے میں ان کا بہت زیادہ اثر و رسوخ تھا لہذا ان کے قبول اسلام کے بعد اب ان کی قوم کے افراد بھی فوج درفونج مسلمان ہونے لگے اور یوں بڑی سرعت کے ساتھ وہاں دینِ برحق کی نشوواشاعت ہونے لگی۔

اور یہ بھی اس بات کا واضح اور قطعی ثبوت تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ان لوگوں کے اصل مرض کی تشخیص بالکل درست تھی اور پھر آپ کی طرف سے ان کیلئے جو ”علانج“ تجویز کیا گیا وہ بھی انتہائی مفید و موثر تیرتیب بہدف ثابت ہوا!

☆ لیکن اس بہت بڑی کامیابی کے ساتھ ساتھ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کیلئے ایک بہت بڑی آزمائش بھی پیش آئی جو کہ بڑی نفیاتی کشمکش کا سبب بھی بنی، شاید اس انتہائی

مہلک اور خوزیرِ فتح کی جنگ کے موقع پر عین میدانِ جنگ میں بھی صورتِ حال اس قدر نازک اور مشکل نہیں ہوئی ہو گئی کہ جس قدر معاملہ اب جنگ کے خاتمے کے بعد اس مالی غنیمت کی تقسیم کے موقع پر نازک ہو گیا.....!

ہوا یہ کہ ”مالِ غنیمت“ کی تقسیم کے موقع پر جب ”طلقاء“، ”خوب بڑھ چڑھ کر مانگ رہے تھے..... تو آپؐ نے اپنی بصیرت کی بناء پر انہیں بہت کچھ عطا فرمادیا تھا، یہ چیز دیکھ کر ہوازن وثقیف کے سردار بھی آپنے تھے..... تب آپ ﷺ نے ان کی ”تائین“ قلب، کیلئے انہیں بھی بہت کچھ عطا فرمادیا تھا..... جو کہ دینِ اسلام کی نشر و اشاعت کی راہ ہموار کرنے کیلئے یقیناً بالکل درست اور بجا اقدام تھا.....!

لیکن اس موقع پر ایک بہت بڑا شکال یہ پیدا ہو گیا کہ یہ تمام تر مالِ غنیمت تو در اصل خالصۃ رسول اللہ ﷺ کے اپنے ساتھیوں کا جائز اور شرعی حق تھا..... جنہوں نے اس سے قبل بھی ہمیشہ، نیز اس جنگ کے موقع پر بھی بڑی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کی تھیں..... بڑی قربانیاں دی تھیں..... لیکن ”طلقاء“، ”کوار پھر“، ”ہوازن اور وثقیف“، والوں کو جب بہت کچھ دے دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ پرانے ساتھی جو کہ اصل حقدار تھے، محروم رہ گئے..... اب سوال یہ تھا کہ انہیں کس طرح راضی اور مطمئن کیا جائے.....؟

رسول ﷺ کے ان اصلی ساتھیوں میں حضرات مہاجرین بھی شامل تھے اور حضرات انصار بھی، حضرات مہاجرین کا تعلق تو چونکہ مکہ شہر سے اور قبیلہ قریش سے تھا، جبکہ خود رسول ﷺ کا تعلق بھی مکہ شہر سے اور قبیلہ قریش سے ہی تھا، ہذا ان میں سے ہر ایک کے ساتھ آپؐ کی کسی شکل میں ”قرابت داری“، ”تھی، اور جہاں“ ”قرابت داری“، ”ہوا کرتی ہے..... وہاں بہت کچھ کہنے سننے کی نوبت نہیں آتی..... بلکہ بہت سے نازک اور حساس

موقع پر ”خاموشی“ اور ”بے زبانی“ ہی بہترین زبان ہوا کرتی ہے.....لہذا رسول ﷺ نے ان مہاجرین حضرات کے ساتھ اس بارے میں کسی بات چیت کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔

جبکہ حضرات انصار کا تعلق مدینہ سے تھا، یقیناً ان کے ساتھ بھی رسول ﷺ کی بہت زیادہ ”قربتیں“ تھیں، لیکن ان تمام ”قربتوں“ کے باوجود باقاعدہ ”قربابت داری“ نہیں تھی، اگرچہ آپؐ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ پرانے مہاجرین کی طرح ان انصار کا مقام و مرتبہ بھی یقیناً بہت بلند ہے.....انصار کا مقام و مرتبہ بھی دنیا کے اس حقیر مال و متاع سے بہت بڑھ کر ہے.....ان کے نزدیک دنیاوی مال و اسباب کی کوئی حیثیت نہیں، ان کی اصل پونچی توبہ اللہ اور رسول ﷺ کی محبت ہے.....مزید یہ کہ یہ انصارِ مدینہ اس سے قبل متعدد مواقع پر اپنی اسی ایمانی و اخلاقی کیفیت، اپنے اسی جذبے، اور اپنے اسی بے مثال ”ایشار“ کا عملی طور پر انہمار بھی کر چکتے.....لیکن اس تمام مقام و مرتبے کے باوجود.....اور ان تمام تھانوں کے باوجود.....آخر وہ بھی گوشت پوست کے انسان ہی تھے.....کوئی فرشتہ نہیں تھے.....کوئی آسمانی مخلوق نہیں تھے.....ان کے دلوں میں بھی انسانی جذبات تھے.....ان کی بھی ”مای ضروریات“ تھیں.....لہذا عین ممکن تھا کہ شاید ان میں سے کسی کے دل میں اس ” تقسیم“ کے بارے میں کوئی ”وسوہ“ پیدا ہونے لگے.....!

لہذا آپؐ نے مناسب سمجھا کہ اس بارے میں ان کے ساتھ مناسب ”فَهَلُو“ کر لی جائے.....چنانچہ آپؐ کی فرماش پر تمام انصارِ مدینہ ”بَحْرَانَة“ (۱) نامی بستی میں ایک جگہ (۱) اسی ”بَحْرَانَة“ میں ہی تمام مال نیمت کی تقسیم کا کام انجام دیا گیا تھا، یہ بستی مکہ شہر سے کچھ فاصلے پر (طاائف کے راستے میں) واقع ہے۔

جمع ہوئے، اور تب رسول اللہ ﷺ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے اپنی گفتگو کا آغاز فرمایا: ”اے جماعتِ انصار! یہ نو مسلم لوگ ہیں، ان کے دل ابھی تک دنیاوی مال و دولت کے ساتھ ہی لٹک ہوئے ہیں، جبکہ تمہارے دل اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کی دولت سے منور ہیں“

اور پھر آپؐ نے مزید فرمایا: ”اللہ کی قسم! تمہارے دلوں میں جو ایمان کی دولت ہے، وہ بہت بہتر ہے دنیا کی اس حقیر دولت سے کہ جو وہ اپنے ہمراہ لے گئے ہیں.....“

رسول ﷺ کی یہ گفتگوں کر انصارِ مدینہ خاموش رہے، تب آپؐ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”اے جماعتِ انصار! کیا تم میری بات کا کوئی جواب نہیں دو گے؟“ تب انصار نے عرض کیا: ”بِمَا ذَا نُحِبُّكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ الْمَنْ وَ الْفَضْلُ“، یعنی ”اے اللہ کے رسول! ہم کیا جواب دیں.....؟ ہم پر اللہ اور اس کے رسولؐ کے جو احسانات ہیں.....، ہم تو ان کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں“

اور تب قدرے توقف کے بعد رسول ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: ”اے جماعتِ انصار! کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر اپنے گھروں کو جائیں، اور تم ”محمد“ کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤ.....؟“

کس قدر سادگی تھی رسول ﷺ کی اس بات میں..... کتنی معصومیت تھی..... اور کتنا اثر تھا..... یہ بات انصار کے دل میں پیوست ہو گئی..... اور تب وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے..... ضبط کے سمجھی بندھن ٹوٹ گئے..... اور بے اختیار وہ سب رو نے لگے..... یہاں تک کہ رو تے رو تے ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے بھیگ گئیں (۱)

(۱) جیسا کہ مسندا مام احمد (۲۰۲) وغیرہ میں تذکرہ ہے ”حتیٰ أَخْضُلُوا الْحَاهِم“ راوی: ابوسعید خدری۔

اور وہ سب بیک زبان بولے ”رَضِينَا بِاللَّهِ رَبِّاً، وَبِرَسُولِهِ قِسْمًا وَ حَظًا“، یعنی ”ہم نے اللہ کو اپنارب پسند کر لیا، اور اس کے رسول کی طرف سے ہمیں جو کچھ بھی ملا، اس پر ہم راضی ہو گئے۔“

یہ تھا انصارِ مدینہ کا ”ایثار“ اور یہ تھا ان کا مقام و مرتبہ..... جیسا کہ خود قرآن کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان کے ”ایثار“ کی تعریف بیان فرمائی ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْكَانَ بِهِمْ خَصَاصَةُ﴾ (۱) یعنی ”وہ خود اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو، خواہ وہ خود کتنے ہی محتاج ہوں.....“

نیز حضرات انصار کی منقبت و فضیلت اور مقام و مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے بھی خوب واضح ہوتا ہے کہ ”لَوْأَنَ النَّاسَ سَلَكُوا شِعْبًا وَ سَلَكَتِ الْأَنْصَارُ شِعْبًا لَسَلَكُتْ شِعْبَ الْأَنْصَارِ“، یعنی ”اگر تمام لوگ کسی راستے پر چل رہے ہوں، اور انصار کسی دوسرے راستے پر چل رہے ہوں..... تو میں ضرور اسی راستے پر ہی چلوں گا جس پر انصار چل رہے ہوں گے۔“

نیز آپؐ نے حضرات انصارِ مدینہ کیلئے ان الفاظ میں دعا فرمائی ”اللَّهُمَّ ارْحِمْ الْأَنْصَارَ، وَأَبْنَاءَ الْأَنْصَارَ، وَأَبْنَاءَ أَبْنَاءَ الْأَنْصَارَ“، یعنی ”اے اللہ! تو انصار پر رحم فرماء، اور انصار کے بچوں پر بھی رحم فرماء، اور انصار کے بچوں کے بچوں پر بھی رحم فرماء“ (۲) انصارِ مدینہ کیلئے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس والہانہ انداز کا اظہار..... اور اس قدر جذباتی انداز میں ان کیلئے نیزان کی نسلوں کیلئے یہ دعا..... یقیناً اس سے حضرات انصار کی شان اور منقبت و فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔

(۱) سورۃ الحشر [۹]

(۲) السیرۃ النبویہ یہا بن ہشام / ج ۲ / ص ۱۶۱ - وغیرہ۔

☆.....شیماء بنت حارث السعدیہ:

رسول ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے ابتدائی پانچ سال مکہ شہر سے باہر بادیہ بنی سعد میں گزارے تھے، اُس دور میں یہ روانج تھا کہ ”شرفاء“ اور صاحبِ حیثیت قسم کے لوگ اپنے شیر خوار بچوں کو تربیت کیلئے بادیہ بھجوایا کرتے تھے، تاکہ شہر کے مصنوعی ماحول سے دور بادیہ میں قدرتی آب و ہوا میں، نیز فطری ماحول میں بچے کی بہتر نشوونما ہو سکے۔

اسی دستور کے مطابق رسول ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ بنت وہب نے بھی اپنے اس نومولود نورِ نظر کو ”حیمہ“ نامی بادیہ نیشن خاتون کے حوالے کر دیا تھا جس کا تعلق ”بنو سعد“ سے تھا، اور اسی نسبت کی وجہ سے وہ ”حیمہ سعدیہ“ کہلاتی تھیں۔

چنانچہ رسول ﷺ پانچ سال تک وہیں بادیہ بنی سعد میں مقیم رہے، اس دوران وقاً فوتیٰ حیمہ سعدیہ اس نونہال کو اس کی ماں سے ملانے کی خاطر مکہ لاٹی رہتی تھیں۔

اُس زمانے میں ہر بڑے قبیلے میں بہت سے ذیلی قسم کے چھوٹے چھوٹے قبائل اور خاندان ہوا کرتے تھے، مثلاً شہر مکہ میں ”قریش“، بڑا مشہور اور طاقتور قبیلہ ہوازن، جس کے بہت سے ذیلی قبائل تھے، مثلاً بنو هاشم، بنو زہرا، بنو عدی.....وغیرہ.....اسی طرح طائف اور اس کے مضادات میں آباد بڑے مشہور اور طاقتور قبیلے ”ہوازن“ کے بھی متعدد ذیلی قبائل تھے، جو کہ طائف اور مکہ کے درمیان پھیلے ہوئے تھے، انہی میں ایک ذیلی قبیلہ ”بنو سعد“ بھی تھا، ”ہوازن“ نے مسلمانوں کے خلاف جس جارحیت کا آغاز کیا تھا، جس کے نتیجے میں ”غزوہ حنین“ کا تاریخی واقعہ پیش آیا تھا، اس جارحیت میں ”ہوازن“ کے دیگر ذیلی قبائل کی طرح ”قبیلہ بنو سعد“ بھی شامل تھا۔

غزوہ حنین سے فراغت کے بعد اسی غزوے سے متعلق چھوٹے بڑے بہت سے انتظامی قسم

کے معاملات نمٹانے کی غرض سے رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر سمیت چند دن اسی جگہ مقام رہے۔

اس موقع پر یہ بات آپؐ کے ذہن میں تھی کہ آپؐ نے اپنے بچپن میں جو پانچ سال کا عرصہ اپنی رضائی والدہ ”ح萊ہ سعدیہ“ کے گھر میں گذرا تھا..... وہ یہی علاقہ تھا..... ح萊ہ سعدیہ کا گھر یہیں کہیں آس پاس ہی تھا..... نیز آپؐ کو یہ بات بھی یاد تھی کہ ح萊ہ سعدیہ کی ایک بیٹی ہوا کرتی تھی جس کا نام تھا ”شیماء“ اور جو کہ عمر میں آپؐ سے کچھ بڑی تھی..... اور دون بھرا پنے اس چھوٹے بھائی اس معصوم نونہال لیعنی ”محمد“ کو گود میں لئے ہوئے اپنے محلے کے دیگر بچوں کے ہمراہ گلی کو چوں میں کھلیق رہتی تھی.....

اس غزوہ حنین کے موقع پر چونکہ ”ہوازن“ والوں کی کیفیت یہ تھی کہ ہر کوئی اپنے اس جوشیلے سپہ سالار مالک بن عوف کے حکم پر اپنے بیوی بچوں کو بھی ”میدانِ جنگ“ میں ہمراہ لایا تھا..... لہذا ”ہوازن“ کی شکست و پسپائی کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ جو چھ ہزار قیدی لگے تھے، ان میں بڑی تعداد میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔

ایک روز رسول اللہ ﷺ جب اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ وہیں کسی جگہ تشریف فرماتھے، کہ اس دوران ”بنو سعد“ سے تعلق رکھنے والی چند عورتوں کا اس جگہ سے گزر رہا..... اس موقع پر ان میں سے ایک عورت کی جب رسول اللہ ﷺ پر زگاہ پڑی تو وہ ٹھنک کر رہ گئی، اس کے بڑھتے ہوئے قدم وہیں رک گئے..... اور تب وہ آپؐ سے مخاطب ہو کر بیوی کہنے لگی: ”میں شیماء ہوں مجھے دیکھئے میں آپؐ کی بہن شیماء ح萊ہ سعدیہ کی بیٹی“

یہ آوازن کر..... اور اس عورت کی زبانی یہ بات سن کر..... رسول اللہ ﷺ چونکہ اٹھے..... آپؐ کے رُخ انور پر خوشی کے آثار نمایاں ہونے لگے..... لیکن فوراً ہی آپؐ نے اس عورت

کو مناطب کرتے ہوئے فرمایا ”اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ تم واقعی شیماء، ہی ہو؟“
 تب اس عورت نے بہت سی باتیں یاد دلائیں، بہت سی نشانیاں تائیں جن کے نتیجے
 میں رسول اللہ ﷺ نے اسے پچان لیا کہ واقعی یہ میری رضاعی بہن ”شیماء“ ہی ہے
 اورتب آپؐ نے نہایت گر مجوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا، خوب عزت افزائی فرمائی
 اور، بہت زیادہ احترام کیا حتیٰ کہ آپؐ نے اپنے کندھے پر رکھی ہوئی اپنی چادر اتار کر
 زمین پر بچھائی اور شیماء کو اس پر بٹھایا (۱) نیز عرصہ دراز کے بعد ہونے والی اس اچانک
 ملاقات پر آپؐ نے انہتائی مسرت کا اظہار فرمایا۔ (۲)

جس طرح رسول اللہ ﷺ اپنی رضاعی بہن کے ساتھ اس ملاقات پر بہت زیادہ مسرور تھے،
 اسی طرح ”شیماء“ بھی بہت خوش تھی خصوصاً اس نے جب اپنے بھائی کی یہ اتنی بڑی
 قدر و منزلت اور اتنا عظیم مقام و مرتبہ دیکھا تو وہ بے حد خوش ہوئی اور انہتائی مسرت
 کا اظہار کیا اپنے بھائی کو اس قدر باعزت دیکھ کر وہ مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی قوم کی
 اس بدترین شکست اور اتنے بڑے نقصان کا غم بھی بھول گئی نیز یہ کہ اس موقع پر وہ
 مسلمان بھی ہو گئی اور پھر جب وہاں سے رخصت ہونے لگی تو رسول اللہ ﷺ نے

(۱) اُس دور میں معزز اور شرفاء قسم کے لوگ اپنے کندھے پر کوئی چادر یا رومال رکھا کرتے تھے، جس کی کا بہت زیادہ احترام مقصود ہوتا اسے اپنی اس چادر پر بٹھایا کرتے تھے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ کے ابتدائی پانچ سال حلیمه سعدیہ کے یہاں گزارے تھے، جبکہ غزوہ حنین سنہ آٹھ بھری میں پیش آیا تھا، جبکہ اس کے تقریباً دو سال بعد سنہ گیارہ بھری کے آغاز (ماہ ربیع الاول) میں آپؐ کا تریسیٹھ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ غزوہ حنین کے موقع پر آپؐ کی عمر مبارک تقریباً سانچھیا کسیٹھ برس ہو گئی جبکہ پانچ سال کی عمر میں آپؐ بادیہ بنی سعد سے واپس مکہ چلے آئے تھے اور اب اس قدر طویل کے عرصے کے بعد ”شیماء“ سے یہ ملاقات ہوئی تھی۔

اسے یہ پیشکش فرمائی کہ اگر وہ چاہے تو عزت و احترام کے ساتھ اب مسلمانوں میں ہی رہے..... اور اگر واپس اپنے علاقے کی طرف جانا چاہے تب بھی اسے روکا نہیں جائے گا، اس پر اس نے اپنے علاقے کی طرف واپس جانے کی خواہش ظاہر کی..... جب رسول اللہ ﷺ نے اسے انہائی عزت و احترام کے ساتھ نیز بہت سے ہدایا و تھالف کے ساتھ وہاں سے رخصت فرمایا۔

☆..... طائف کی جانب پیش قدمی:

غزوہ حنین کے موقع پر مسلمانوں کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونے کے بعد مشرکین بڑی تعداد میں طائف کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے، جس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے تعاقب کی غرض سے طائف کی جانب پیش قدمی فرمائی، لیکن اس موقع پر وہ طائف والے بڑے مضبوط قلعوں کے اندر قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے لشکر کے ہمراہ ان کا محاصرہ کیا، پندرہ روز اسی کیفیت میں گذر گئے..... آخر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ”ان طائف والوں کے ساتھ اب تھجی برتنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی..... الہذا اب ہمیں یہ محاصرہ ختم کر کے واپس لوٹنا چاہئے۔“

چنانچہ یہ محاصرہ ختم کر دیا گیا، رسول اللہ ﷺ کا یہ فیصلہ نیز طائف والوں کے بارے میں آپؐ کا یہ اندازہ بالکل درست تھا، کیونکہ غزوہ حنین کے بعد اب ان میں کوئی دم خم باقی نہیں رہا تھا..... اور پھر آپؐ کے اس فیصلے کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ رفتہ رفتہ وہ سمجھی خود ہی دینِ اسلام قبول کرتے چلے گئے..... اور آئندہ چل کر دین کے علمبردار ثابت ہوئے۔

☆..... واپسی کا سفر :

طاائف کا محاصرہ ختم کرنے کے بعد رسول ﷺ نے اب واپسی کا فیصلہ فرمایا، واپسی کے اس سفر کے دوران جب آپؐ اپنے لشکر سمیت مکہ کے قریب ”ہجران“ نامی مقام پر پہنچ تو عمرؐ کی نیت سے وہاں احرام باندھا، اور مکہ کو مردم پہنچ کر آپؐ نے اپنے جاں ثنا راستھیوں کے ہمراہ ” عمرہ“ ادا کیا، اور پھر وہاں سے مدینہ کی جانب واپسی کے سفر کا آغاز فرمایا، اس موقع پر آپؐ نے ”عتاب بن اُسید“، نامی ایک نوجوان کو ”امیر مکہ“ مقرر فرمایا، نیز اس موقع پر آپؐ نے سرکاری بیت المال سے ان کیلئے یومیہ ایک درہم و نظیفہ بھی مقرر فرمایا، تاکہ وہ کسی کے دستِ نگر اور حتاج نہ رہیں..... اور یوں ذہنی سکون اور خوب لمحجی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کر سکیں۔ (۱)

جبکہ اسی موقع پر آپؐ نے فتح مکہ کے نتیجے میں اب وہاں نو مسلموں کی بڑی تعداد کے پیش نظر ان کی دینی تعلیم و تربیت کی غرض سے اپنے جلیل القدر انصاری صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو وہاں بطور ”معلم“ مقرر فرمایا۔

☆ اور پھر رسول ﷺ اپنے جاں ثنا راستھیوں کے ہمراہ مکہ سے واپس مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے، آپؐ کا یہ سفر کافی طویل ثابت ہوا تھا، فتح مکہ کے موقع پر آپؐ مہ رمضان میں مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ ہوئے تھے، اس کے بعد شوال کا پورا مہینہ گذر گیا تھا، اور اب ماہ ذوالقعدہ کے بالکل آخری دن چل رہے تھے، جب آپؐ مدینہ کیلئے واپس روانہ ہوئے۔

(۱) عتاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت محسن بیس سال تھی، یہ مکہ کے ہی باشندے تھے اور قبیلہ قریش کے مشہور خاندان ”بیوامیہ“ سے ان کا تعلق تھا، بالکل نو مسلم تھے، فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ کی شرافت و نجابت سے متاثر ہوئے تھے اور انہیں ”امیر مکہ“ یعنی مکہ کا گورنر مقرر فرمایا تھا، البتہ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد انہیوں نے خود ہی اس منصب سے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔

☆ اس موقع پر یقیناً رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک میں کتنی ہی یادیں گردش کر رہی ہوں گی..... تقریباً ڈھائی ماہ قبل جب مکہ آمد ہوئی تھی..... اُس وقت کے مناظر..... فتح مکہ کے یادگار اور تاریخی موقع پر پیش آنے والے حالات و واقعات کے مناظر..... اور پھر ”حنین“ میں کیا ہوا.....؟ ”جزرِ اندھہ“ کے مقام پر قسمی غنائم کے وقت خلافِ توقع کیسے کیسے معاملات پیش آئے..... ”ہوازن“ اور ”ثقیف“ کے ساتھ معاملات اور تعلقات میں کیسے کیسے موڑ آئے..... شہماء سے کس طرح عجیب و غریب قسم کے حالات میں اچانک ملاقات ہوئی..... اور پھر طائف کا محاصرہ کس طرح طول پکڑتا چلا گیا..... وغیرہ وغیرہ..... اسی کیفیت میں آپ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ اب مکہ سے مدینہ کی جانب روان دوال تھے.....

☆ آج سے تقریباً آٹھ سال قبل بھی آپ ﷺ اسی طرح مکہ سے مدینہ کی جانب موسفر تھے..... اور آج بھی..... لیکن آٹھ سال قبل آپ مکہ سے خفیہ طور پر روانہ ہوئے تھے..... دشمنوں اور تعاقب کرنے والوں کی عقابی نگاہوں سے بچتے پھاتے اور چھپتے چھپاتے..... اُس وقت آپ مدینہ کی جانب روان دوال تھے پناہ کی تلاش میں..... لیکن اب آٹھ سال بعد صورتِ حال یکسر مختلف تھی..... اب آپ ﷺ کا یہ سفر خفیہ نہیں تھا..... اب آپ مگر کسی پناہ کی تلاش میں نہیں جا رہے تھے..... بلکہ آج تو آپ اپنے ہزاروں جاں نثاروں کی معیت میں..... بلکہ ان کی قیادت کرتے ہوئے ان راستوں پر گامزن تھے..... اور پھر یہ طویل سفر طے کرنے کے بعد آپ جب مدینہ پہنچتے تو آج آپ وہاں جبکی نہیں تھے..... مکہ سے خفیہ طور پر نہیں آئے تھے..... بلکہ آج تو آپ ”فتح مکہ“ کی حیثیت سے وہاں تشریف لائے تھے..... اپنے شہر مدینہ میں..... کہ جو اولین اسلامی ریاست کا دار الحکومت تھا، اور آپ خود

ہی اس شہر مدینہ کے اور اس وسیع و عریض اسلامی ریاست کے فرمائز واقع تھے۔
 مزید یہ کہ ”فتح کہ“ کے بعد اب اگر آپ ﷺ چاہتے تو وہیں مکہ میں ہی مستقل طور پر مقیم ہو جاتے..... لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا تھا..... بلکہ آپ تو مدینہ کی محبت میں نیز اہل مدینہ کی محبت میں واپس چلے آئے تھے..... یقیناً یہ بھی آپ کی ”وفاء“ کی ایک اعلیٰ مثال تھی !!.....



الحمد لله آن بتأريخ ۲۷ / ذوالحجہ ۱۴۳۲ھ، مطابق کیم نومبر ۲۰۱۳ء بروز جمعہ

یہ باب کمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبَّ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ

جزیرہ العرب میں مختلف شورشیں..... اور ان کی سرکوبی:

فتح مکہ اور پھر غزوہ حنین و طائف کے بعد جب رسول ﷺ اپنے جاں ثار ساتھیوں کے ہمراہ واپس مدینہ منورہ تشریف لائے تو اب بظاہر اگرچہ جزیرہ العرب میں عمومی کیفیت یہ تھی کہ مشرکین کی قوت ٹوٹ چکی تھی، اور ان میں اب کوئی دمخم باقی نہیں رہا تھا..... لیکن اس کے باوجود بعض اوقات دور زدراز کے علاقوں میں شرپسنداب بھی وقار و قوت کوئی نہ کوئی شورش اور فتنہ برپا کئے رکھتے تھے..... کوئی نہ کوئی قبیلہ سرکشی دکھاتا رہتا تھا..... اور پھر خصوصاً یہ کہ اسلامی ریاست اب بہت زیادہ وسعت بھی اختیار کر چکی تھی..... لہذا اس قدر وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی اس ریاست کے اطراف و اکناف میں نظم و ضبط اور امن و امان قائم رکھنا بہت ضروری تھا، اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا..... لہذا فتح مکہ کے بعد سراٹھانے والی ایسی مختلف شورشوں کی بیخ کنی اور سرکوبی کی غرض سے رسول ﷺ جزیرہ العرب کے طول و عرض میں مختلف مقامات پر اور مختلف قبائل کی جانب فوجی مہماں (۱) ارسال فرماتے رہے..... فتح مکہ کا تاریخی واقعہ ہجرت کے آٹھویں سال پیش آیا تھا، اس کے اگلے ہی سال یعنی ہجرت کے نویں سال رسول ﷺ نے مدینہ منورہ سے ایسی جوفوجی مہماں ارسال فرمائیں ان کی تعداد سولہ تھی۔

ایسی ہی ایک فوجی مہماں ان دونوں رسول ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت قبیلہ ”طی“ کی جانب روانہ فرمائی تاکہ اس قبیلے کی طرف سے برپا کردہ شورش کا خاتمہ کیا جاسکے، یہ وہی قبیلہ تھا کہ جس کا سردار کسی زمانے میں ”حاتم طائی“ نامی شخص ہوا یعنی مسلم فوجی دستے۔

کرتا تھا (۱) جس کی سخاوت و فیاضی، انسان دوستی، ہمدردی، مہماں نوازی اور غریب پروری کی داستانیں ملک عرب کے طول و عرض میں ضرب المثل بنی ہوئی تھیں (۲) حاتم طائی خود تو رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور دینِ اسلام کا سورج طلوع ہونے سے قبل ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کر چکا تھا..... البتہ اب اُس کا لائق و فالق بیٹا ”عدی بن حاتم“ اپنے اس قبیلے ”طی“ کا سردار تھا۔

ظہورِ اسلام سے قبل جب حاتم طائی اس قبیلے کا سردار تھا اس نے شرک اور بُرت پرستی سے تائب ہو کر دینِ نصرانیت اختیار کر لیا تھا (۳) اور یہی وجہ تھی کہ اس کا بیٹا ”عدی“ بھی نصرانی مذہب ہی کا پیروکار تھا۔

اس قبیلے ”طی“ کی جانب سے جب ”شورش“ کا آغاز ہوا تو اس کی سرکوبی کی غرض سے رسول اللہ ﷺ کے حکم پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اسلامی دستے کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے اس علاقے کی جانب رواں دواں ہو گئے کہ جو اس قبیلے کا مسکن تھا (۴) وہاں پہنچنے کے بعد اسلامی لشکر اور قبیلہ ”طی“ والوں میں جنگ کی نوبت آئی، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہوا، جبکہ قبیلہ ”طی“ والے لشکرست کھا گئے، بڑی تعداد میں وہ ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے، نیزان کی بہت بڑی تعداد مسلمانوں کے ہاتھوں قیدی بی،

(۱) قبیلہ ”طی“ کی طرف نسبت کی وجہ سے ”طائی“ کہلاتا تھا۔

(۲) بلکہ آج بھی مہماں نوازی اور سخاوت و فیاضی میں ”حاتم طائی“ کی مثالیں دی جاتی ہیں..... اور یہ کیفیت صرف ملک عرب تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ عرب و عجم میں ہر جگہ یہی صورت حال موجود ہے۔

(۳) ظہورِ اسلام سے قبل دینِ نصرانیت ہی آسمانی اور الہامی دین تھا۔

(۴) یہ علاقہ آج کل سعودی عرب میں ”حائل“ کے نام سے مشہور ہے جو کہ مدینہ منورہ سے تقریباً چار سو کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے۔

جبکہ ان کا سردار ”عُدیٰ بن حاتم الطائی“ اپنے علاقت سے پنج نکلنے میں کامیاب رہا، اور وہاں سے فرار ہونے کے بعد وہ مسلسل سفر کرتا ہوا ملکِ شام جا پہنچا، جہاں اس نے اپنے ہم ندھب لوگوں یعنی ”رومیوں“ کی پناہ حاصل کر لی (۱)

دوسری جانب مسلمان جب کامیاب و کامران وہاں سے واپس مدینہ کی جانب عازم سفر ہوئے تو اب ان کے ہمراہ اس شکست خورde قبیلہ ”طی“ سے تعلق رکھنے والے قیدی بھی بڑی تعداد میں موجود تھے، اور اسی کیفیت میں مسلسل سفر کرتے ہوئے یہ اسلامی لشکر آخر واپس مدینہ منورہ آپہنچا۔

☆.....سفانہ بنت حاتم الطائی:

ایک روز رسول ﷺ جب مسجد نبوی کے قریب سے گزر رہے تھے تب وہاں ان قیدیوں میں سے کچھ لوگ موجود تھے، انہی میں سے ایک عورت نے آگے بڑھ کر رسول ﷺ سے رُنکنے کی درخواست کی، اور اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے یوں کہنے لگی: ”مجھے دیکھئے..... میں اپنے قبیلے ”طی“ کے سابق سردار ”حاتم طائی“ کی بیٹی ہوں..... اور قبیلے کے موجودہ سردار ”عُدیٰ بن حاتم“ کی بہن ہوں..... میرا باپ ملکِ عرب کا انتہائی تھنی، مہماں نواز اور مہربان ترین انسان تھا..... جس کی سخاوت و فیاضی اور انسان دوستی و ہمدردی ضرب المثل تھی..... لیکن وہ تو اب اس دنیا میں نہیں رہا..... اور میرا بھائی بھی اس وقت بہت دور ہے..... وقت بدل چکا..... حالات بدل گئے..... سمجھی کچھ بدل گیا..... اے اللہ کے رسول!

(۱) ملکِ شام اس زمانے میں ”سلطنت روم“ کا حصہ تھا، اور ”رومی“ نصرانی ندھب کے بیروکار تھے، جبکہ عُدیٰ بن حاتم بھی اپنے باپ حاتم طائی کی طرح دین نصرانیت اختیار کر چکا تھا، لہذا مسلمانوں کے ہاتھوں شکست و پسپائی کے بعد اب وہ پناہ کی تلاش میں اپنے ان ہم ندھب لوگوں کے پاس آپہنچا اور وہیں رہا کش اختیار کر لی۔

مجھے دیکھئے..... میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں..... سقانہ..... حاتم طائی کی بیٹی..... میرا باپ جو ہمیشہ مجبور ولاچار لوگوں کی مدد کیا کرتا تھا..... بے آسرا اور بے ٹھکانہ فراہم کیا کرتا تھا..... آج میں اس کی بیٹی خود مجبور ہوں لاچار ہوں اور بے ٹھکانہ ہوں !.....

رسول ﷺ اس کی اس گفتگو سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور چونکہ اس کا باپ انہائی سخنی انسان تھا..... اور ظاہر ہے کہ ستاوہت و مہربانی، مہماں نوازی اور انسان دوستی..... یہ سب کچھ تو یقیناً اعلیٰ ترین اخلاق میں سے ہے..... لہذا آپ نے اس کی اس خوش اخلاقی کا لحاظ کیا..... اور جب اس کی خوش اخلاقی کا لحاظ کیا تو پھر مزید یہ کہ آپ نے اس کی اس بیٹی کا بھی لحاظ کیا..... کہ عظیم باپ کی عظیم بیٹی ہے..... اور پھر آپ نے اس کے ساتھ خوب اکرام کا معاملہ فرماتے ہوئے اسے بہت سے ہدایا تو حائف عنایت فرمائے، نیز اس کیلئے آزادی اور اس قید سے رہائی کا اعلان بھی فرمایا۔

رسول ﷺ کی طرف سے اس انعام و اکرام اور حسن سلوک اور پھر اپنی رہائی کی یہ خوشخبری سننے کے بعد اس نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ آپ گا شکر یہ ادا کیا..... البتہ اس موقع پر اس نے اس بات کا عملی ثبوت پیش کیا کہ واقعی و عظیم باپ کی عظیم بیٹی تھی..... چنانچہ رسول ﷺ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے وہ یوں کہنے لگی کہ ”اے اللہ کے رسول! میں اکیلی آزاد ہو جاؤں اور یہاں سے اپنے علاقے کی طرف چلتی ہوں جبکہ یہ میرے قبیلے والے سبھی لوگ یہاں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہیں میں ایسا نہیں کر سکتی لہذا یا تو میں بھی انہی کے ساتھ یہاں مسلسل قید میں ہی رہوں گی، اور یا یہ سب میرے ہمراہ جائیں گے۔“

اپنے قبیلے والوں کیلئے اس کا یہ جذبہ اور ان کیلئے یہ اس قدر خلوص اور وفاد کیجھ کر رسول اللہ ﷺ مزید متاثر ہوئے..... اور تب آپؐ نے ان سمجھی کی رہائی کا حکم صادر فرمایا..... جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ”سفانہ“ سمیت قبیلہ ”طی“ سے تعلق رکھنے والے یہ تمام افراد مسلمان ہو گئے..... اور یوں نبی رحمت ﷺ کی خوش اخلاقی، انسان دوستی اور بے مثال حسن سلوک کی بدولت یہ لوگ اب دین برحق کی نعمت سے مالا مال ہونے کے بعد مدینہ منورہ سے اپنے علاقے کی جانب روانہ ہو گئے۔

سفانہ نے اپنے گھر پہنچنے کے بعد بہت جلد وہاں سے ملکِ شام کی طرف رخت سفر باندھا..... اور وہاں پہنچنے کے بعد اس نے اپنے بھائی عدی بن حاتم سے ملاقات کی، اور اسے رسول ﷺ کے اعلیٰ اخلاق اور بے مثال حسن سلوک کے بارے میں، نیز اپنے قبولِ اسلام کے بارے میں مطلع کیا، نیزاں موقع پر اس نے نہایت اصرار اور گرجوشی کے ساتھ اسے بھی دین برحق قبول کر لینے کا مشورہ دیا، چنانچہ بہن کے اس مخلصانہ مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ ملکِ شام سے سفر کرتا ہوا مدینہ پہنچا، جہاں اسے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضری اور دینِ اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا، جس کے نتیجے میں وہ مسلمان ہو گیا..... اور یوں وہ محض عدی بن حاتم سے اب رسول اللہ ﷺ کے صحابی حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بن گئے..... اب ان کے شب و روز رسول ﷺ کی خدمت میں گذرنے لگے جہاں وہ نہایت ذوق و شوق کے ساتھ ہمہ وقت آپؐ سے کسبِ فیض اور تحصیلِ علم دین میں مشغول و منہمک رہنے لگے..... رسول اللہ ﷺ سے روایت کردہ ان کی متعدد احادیث صحابح ستہ میں موجود ہیں۔

الحمد للہ آج بتاریخ ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱۰ نومبر ۲۰۱۳ء روز اتواریہ بابِ کامل ہوا۔

غزوہ تبوک

رسول ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سالہ اسال سے مشرکین مکہ کی جانب سے جاریت اور مخالفت کا سامنا تھا، وقتاً فوتاً خنف جنگوں کے بعد بالآخر سن آٹھ بھری میں فتح مکہ کا یادگار اور تاریخی واقعہ پیش آیا، جو کہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہوا، جس کے نتیجے میں مشرکین مکہ کی تماamt شان و شوکت داستانِ ماضی بن کر رہ گئی..... اس فتح میں کے بعد مشرکین مکہ کی طرف سے چند معنوی جھڑپوں کے سوابا قاعدہ کوئی بڑی مشکل پیش نہیں آئی۔

لیکن مشرکین مکہ کی طرف سے اب اس بے فکری اور یکسوئی حاصل ہونے کے بعد جلد ہی، یعنی اگلے ہی سال سن ۹ بھری میں ایک اور بڑی آزمائش سامنے آ کھڑی ہوئی، وہ یہ کہ رسول ﷺ کو اور مسلمانوں کو مسلسل اس قسم کی خبریں موصول ہونے لگیں کہ روئے زمین کی سب سے بڑی قوت یعنی "سلطنتِ روم" نے مسلمانوں پر یلغار کرنے اور انہیں ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کر دینے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے..... اور اس مقصد کیلئے ملکِ شام کی سرحدوں پر "تبوک" نامی مقام پر ان کا بہت بڑا شکر جمع ہو چکا ہے.....!

یہ خبر مسلمانوں کیلئے انتہائی تشویش کا باعث بنی، رسول ﷺ نے اپنے جاں نثار ساتھیوں کو تیاری کا حکم دیا۔

غزوہ تبوک (جو کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آخری غزوہ ثابت ہوا تھا) کے موقع پر کچھ ایسے حالات و واقعات پیش آئے جو اس سے قبل کبھی کسی غزوے کے موقع پر پیش نہیں آئے

تھے، اور اسی وجہ سے یہ غزوہ بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا..... مثلاً یہ کہ:

☆..... یہ جنگ اُس دور میں تمام روئے زمین کی سب سے بڑی اور نہایت خطرناک قوت یعنی ”سلطنتِ روم“ کے خلاف لڑی جانے والی تھی۔

☆..... اس سے قبل جتنے غزوات پیش آئے تھے وہ سب مشرکین عرب کے خلاف لڑے گئے تھے، اگرچہ چند غزوات یہود کے خلاف بھی لڑے گئے تھے، لیکن وہ یہود صدیوں سے جزیرہ العرب میں ہی آباد تھے، لہذا زبان، لب و لہجہ، رہن، سہن، نیز فتوں، حرب وغیرہ کے لحاظ سے وہ کافی حد تک مقامی عرب باشندوں جیسے ہی تھے۔

مقصد یہ کہ گذشتہ تمام جنگوں کے موقع پر اگرچہ عقیدہ و ایمان کے لحاظ سے تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں اور ان کے مدد مقابل دشمنوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا..... البتہ زبان، لب و لہجہ، فتوں، حرب، اور سامانِ جنگ وغیرہ کے لحاظ سے دونوں میں مکمل ممائش تھی..... جو اسلحہ مسلمانوں کے پاس تھا، وہی دشمن کے پاس بھی تھا، جنگ لڑنے کے جو طور طریقے مسلمانوں کے تھے، وہی دشمن کے بھی تھے..... جو زبان مسلمان بولتے تھے، وہی زبان دشمن بھی بولتے تھے..... البتہ فرق صرف تعداد کا تھا..... لیکن سامانِ جنگ کی نوعیت میں تو اگرچہ ممائش تھی لیکن تعداد میں بہت فرق تھا..... مسلمانوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی جبکہ دشمن ہمیشہ بڑے لشکر جرار کے ہمراہ یلگار کرتا رہا..... مسلمانوں کو ہمیشہ سامانِ جنگ کی قلت درپیش رہی، جبکہ دشمن کے پاس ہمیشہ سامانِ جنگ نیز ہر قسم کے اسباب وسائل کی خوب فراوانی رہی!

اب غزوہ توبک جب درپیش آیا تو یہ پہلا موقع تھا کہ دشمن بالکل نیا اور نامانوس تھا..... ایک بالکل نئے اور اجنبی دشمن کے ساتھ مقالہ بلے کی نوبت آ رہی تھی کہ جس کی زبان بھی مختلف تھی،

جس کے جنگ لڑنے کے انداز اور طور طریقے بھی یقیناً مختلف ہوں گے.....شاید سامان جنگ اور فونِ حرب بھی جدا ہوں گے (۱) رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایمانی کیفیت کے لحاظ سے جن بلند یوں پر تھے یقیناً اس میں کسی شک و شبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے.....لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ وہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں تھے.....وہ بھی گوشت پوست کے انسان ہی تھے.....لہذا یہ تمام باتیں ان کیلئے بھی یقیناً پریشانی کا باعث تھیں (۲)

☆.....یہ سفر بہت زیادہ طویل تھا، مدینہ سے توبک تک مسافت بہت زیادہ تھی اور راستہ کافی دشوار گزار بھی تھا، سفری سہولتوں کا فقدان تھا، اس سے قبل کبھی کسی غزوے کے موقع پر اس قدر طویل سفر کی نوبت نہیں آئی تھی۔

☆.....یہ غزوہ ایسے موسم میں پیش آیا کہ جب قحط سالی چل رہی تھی، غدواناج کی کمی تھی، (۱) اگرچہ اس سے صرف ایک سال قبل ہی لعنی ن آٹھ بھری میں سلطنتِ روم کے خلاف مشہور و معروف ”غزوہ موتہ“ کی نوبت آئی تھی، اس موقع پر اگرچہ جنگ شروع ہونے کے بعد صورتِ حال یقیناً نازک اور خطرناک ہو گئی تھی.....لیکن ابتداء میں وہ معاملہ دراصل اس قدر نازک نہیں تھا، کیونکہ وہ تورومیوں کے ایک ظالم و جاہر گورنر کے ہاتھوں رسول اللہ ﷺ کے ایک قادر کو ناخن قتل کئے جانے کے بعد جوانی اور تآدمی کا روائی کی غرض سے ایک ہم ملک شام کی جانب روانہ کی گئی تھی.....مزید یہ کہ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے بھی شرکت نہیں فرمائی تھی..... جبکہ باقاعدہ علی الاعلان سلطنتِ روم کے خلاف ایک بڑی جنگ کی حیثیت سے یہی ”غزوہ توبک“ ہی پہلا موقع تھا۔

(۲) بلکہ یہ تو ان کی مزید رفعِ شان کا واضح ثبوت ہے کہ اس قدر نازک اور خطرناک ترین صورتِ حال اور اتنی زیادہ مشکلات کے باوجود ان کے قدم ڈگکائے نہیں.....اور نہ ہی ان کی استقامت میں کوئی اغتشاش آسکی..... اور کس طرح اللہ پر توکل کئے ہوئے وہ حضرات بغیر کی تال مثول اور بغیر کی تردود کے.....جان چھپلی پر لئے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ توبک کی جانب رواں دوال ہو گئے!!!!

نیز وسائل کی شدید قلت کا سامنا تھا، حتیٰ کہ جب یہ شتر تبوک کی جانب روانہ ہوا تو کیفیت یہ تھی کہ اٹھارہ افراد باری باری ایک اونٹ پر سفر کر رہے تھے..... یوں یہ طویل فاصلہ طے کیا گیا۔

☆..... سخت گرمی کا موسم تھا، گرمی کی شدت کی وجہ سے منافقین ایک دوسرے کو یوں کہتے پھر رہے تھے کہ ”اس قدر شدید گرمی میں مت سفر کرنا“، قرآن کریم میں منافقین کی اسی بات کا یوں مذکورہ کیا گیا ہے: ﴿وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرّ﴾ یعنی یہ منافقین یوں کہتے ہیں کہ ”گرمی میں مت نکلو“، اس پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے ان کیلئے یہ شدید و عینہ نازل ہوئی ﴿قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُ حَرًّا، لَوَكَانُوا يَفْقَهُونَ﴾ (۱) یعنی ”اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ تو بہت زیادہ گرم ہے، کاش وہ صحیح“

مطلوب یہ کہ کاش وہ اس بات کو صحیح کہ دنیا کی جس گرمی سے بچنے کی خاطروہ اللہ اور رسول کے حکم کی خلاف ورزی کے مرتبہ ہو رہے ہیں اور یوں اپنے لئے جہنم کا سامان کر رہے ہیں، کاش وہ اس بات کو صحیح کہ جہنم کی وہ گرمی تو دنیا کی اس گرمی کے مقابلے میں بہت زیادہ شدید ہو گی..... تب وہاں وہ کیا کریں گے.....؟

الغرض منافقین کی طرف سے اس قسم کی باقوں کا نتیجہ یہ تھا کہ گرمی کے ساتھ ساتھ منافقین کی یہ باتیں بھی اس موقع پر پست ہوتی، حوصلہ شکنی اور بدلی پھیلانے کا سبب بن رہی تھیں۔

☆..... کھجوریں پکنے کا موسم تھا، ان لوگوں کی زندگی میں کھجوروں کی بہت زیادہ اہمیت تھی، کھجور ہی ان کی خوراک تھی، کھجور ہی ان کا ذریعہ معاش تھی، کھجور کی تجارت بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی، کھجور پر ہی ان کی گذر بسر کا بڑی حد تک دار و مدار تھا..... چنانچہ بڑی محنت

سے تیار کردہ کھجور کی یہ فصل جب تیار ہو رہی تھی اور سال بھر کی محنت کا جب پھل سامنے نظر آنے لگا تھا..... ایسے میں اپنی محنت کے اس پھل کو یوں چھوڑ کر حللتے بننا..... جبکہ یہ خبر بھی نہ ہوا کہ واپسی کب ہو گی.....؟ یقیناً یہ بہت ہی مشکل کام تھا۔

غرضیکہ اس غزوے کے موقع پر یہ تمام مشکلات درپیش تھیں، اور یہی وجہ تھی کہ خود قرآن کریم میں اس موقع کو ”ساعۃ العُسْرَۃ“، یعنی ”مشکل کی گھٹڑی“ کے نام سے یاد کیا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾ (۱) یعنی ”بے شک اللہ نے نبی کے حال پر توجہ فرمائی، اور مہاجرین و انصار کے حال پر بھی، جنہوں نے ”مشکل کے وقت“ نبی کا ساتھ دیا.....“

☆..... اس غزوے کیلئے روانگی کے موقع پر اس قدر مشکلات کا سامنا تھا کہ اس معشرے میں اسی چیز کو مومن اور منافق میں پہچان اور تمیز کیلئے ”معیار“ سمجھا جانے لگا، یعنی جو اس غزوے میں شریک ہوا وہی ”مومن“ ہے، اور جو کوئی [بغیر کسی شرعی عذر کے] اس غزوے میں شریک نہیں ہوا وہ ہمیشہ کیلئے ”منافق“ کہلا یا (۲) کیونکہ اس قدر نکالیف اور مشکلات نیز انہتائی صبر آزماقوم کے حالات کے باوجود اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خرم کرتے ہوئے اس غزوے کے موقع پر نکل پڑنا..... یہ کام تو صرف اہل ایمان ہی انجام دے سکتے تھے..... منافقین کے بس کی یہ بات نہیں تھی.....!

☆..... اس غزوے کے موقع پر چتنی بڑی تعداد میں قرآن کریم کی آیات نازل ہوئیں

(۱) سورۃ التوبہ [۷۶]

(۲) مساوی تین حضرات، یعنی کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الریح رضی اللہ عنہم.....

کسی اور غزوے کے موقع پر اتنی آیات نازل نہیں ہوئیں، اس سے بھی اس غزوے کی خاص اہمیت واضح ہوتی ہے۔ (۱)

☆.....رسول ﷺ کا معمول یہ تھا کہ اس سے قبل ہمیشہ اختیاطی تدیر کے طور پر آپؐ ہر غزوے کے موقع پر رازداری سے کام لیا کرتے تھے، مثلاً یہ کہ لشکر کی روائی کب ہوگی؟ کس راستے پر سفر کیا جائے گا.....؟ وغیرہ وغیرہ.....تاکہ دشمن کو آپؐ کے منصوبوں کے بارے میں کوئی پیشگوی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

لیکن اس غزوے کے موقع پر چونکہ مذکورہ بالاتمام مشکلات کی وجہ سے صورت حال کافی نزاکت اختیار کرچکی تھی اور معاملہ بہت حساس ہو چکا تھا..... لہذا رسول ﷺ نے رازداری سے کام لینے اور معاملات کو خفیہ رکھنے کی بجائے تیاری کا عام اعلان فرمادیا، نیز دور راز کے علاقوں مثلاً مکہ اور طائف وغیرہ تک آپؐ نے قادر و روانہ فرمائے تاکہ وہاں جا کر لوگوں کو اس غزوے میں شرکت سے متعلق آپؐ کی طرف سے پیغام پہنچائیں، جس پر دور راز کے علاقوں سے بھی نہایت جوش و جذبے کے ساتھ بڑی تعداد میں دستے مدینہ پہنچنے لگے۔

آخر اپنی طرف سے مناسب تیاری کر لینے کے بعد رسول ﷺ میں ہزار جاں ثاروں پر مشتمل اپنے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے تبوک کی جانب رواں دواں ہو گئے اور تقریباً ایک ہزار کلو میٹر کا یہ سفر پندرہ دن میں طے کیا گیا۔

منزل مقصود یعنی ”تبوک“ کے مقام پر پہنچنے کے بعد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں
 (۲) اس غزوے سے متعلق نازل شدہ آیات سورہ ”توبہ“ میں ہیں، بلکہ اس سورت کا نام ”توبہ“ جس واقعہ کی طرف نسبت کی وجہ سے معروف ہو گیا تو بکے اس واقعہ کا تعلق بھی اسی غزوہ تبوک ہی سے ہے۔

کیلئے غیبی امداد اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ وہاں رو میوں کے کسی بڑے لشکر کا کوئی وجود ہی نظر نہیں آیا..... جس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو روی فوج مدینہ سے اسلامی لشکر کی توبک کی جانب روائی کی اطلاع ملنے پر جنگ کا رادہ ملتا تو کرتے ہوئے اس سرحدی علاقے سے اب واپس جا چکی تھی یا پھر یہ کہ توبک میں روی فوج کے بڑے پیمانے اجتماع کے بارے میں مسلمانوں کو جو خبر دی گئی تھی، اس میں کوئی صداقت نہیں تھی اور وہ م Hispano مفتین اور خفیہ بدوخاہوں کی طرف سے اڑائی ہوئی افواہ تھی تاکہ اس طرح مسلمانوں کو خوفزدہ اور پریشان کیا جائے، وہنی و نفیسیاتی صدمے سے دوچار کیا جائے، نیز یہ کہ کسی طرح انہیں بڑی تعداد میں مدینہ سے باہر در دراز کے مقام پر بھیج دیا جائے تاکہ شاید وہاں خود بخود یہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس کر رہ جائیں اور انہیں مدینہ کی جانب واپسی نصیب ہی نہ ہو سکے۔

بہر حال وجہ جو بھی ہو..... غلط خبر اڑائی گئی ہو..... یا یہ کہ روی واقعی بڑی تعداد میں وہاں جمع ہوئے تھے اور پھر واپس لوٹ گئے تھے..... بہر صورت مسلمانوں کیلئے بہتری ہی بہتری تھی کہ جنگ کی کوئی نوبت ہی نہیں آئی۔

اسی کیفیت میں رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر کے ہمراہ بیس روز مسلسل توبک میں ہی مقیم رہے تاکہ صورت حال خوب اچھی طرح واضح ہو جائے..... تاہم اس طویل قیام کے باوجود وہاں روی فوج کا کوئی بڑا دستہ نظر نہیں آیا اور نہ ہی ان کی جانب سے کوئی ایسی منتکوک نقل و حرکت مشاہدے میں آئی کہ جس سے مسلمانوں کے خلاف ان کے جنگی عزائم کا اظہار ہوتا ہو..... البتہ وقت فتنہ قرآن کے چھوٹے اور معمولی قسم کے اکاڈمیاتی نظر آتے رہے، لیکن ان کی طرف سے جب کسی شرارت یا جارحیت کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو آپ ﷺ نے بھی

ان کے ساتھ کسی چھٹپتی اور تصادم سے گریز کیا، جس سے یقیناً آپؐ کی صلح پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ آخر آپؐ نے واپسی کا فیصلہ فرمایا اور پھر تبوک سے مدینہ کی جانب سفر کرتے ہوئے آپؐ اپنے جاں ثار ساتھیوں سمیت تحریک و عافیت ماہ رجب سن ۹ هجری میں مدینہ منورہ واپس پہنچ گئے، یہ سفر کل پچاس دن کا تھا، جس میں سے بیس دن تبوک میں قیام رہا، جبکہ باقی تمیں دن آمد و رفت میں صرف ہوئے۔

☆.....نتائج:

غزوہ تبوک کے موقع پر اگرچہ مسلمانوں کو بہت زیادہ مشکلات اور ظاہری و نفسیاتی ہر قسم کی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا، حتیٰ کہ انہی مشکلات کی وجہ سے یہ غزوہ مومنین اور منافقین کے مابین تمیز اور پہچان کا معیار بن گیا.....تاہم نتائج کے اعتبار سے یہ غزوہ مسلمانوں کے حق میں بہت ہی بہتر اور انہائی مفید ثابت ہوا، مثلاً یہ کہ:

☆.....اس غزوے کے موقع پر اگرچہ مشکلات تو بہت زیادہ درپیش تھیں، لیکن منزلِ مقصود یعنی ”تبوک“ پہنچنے کے بعد نہ تو کوئی دشمن نظر آیا اور نہ ہی کسی جنگ کی نوبت آئی.....اس طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کیلئے غیبی امداد کا انتظام اور بے فکری و مسرت کا سامان کیا گیا۔

☆.....وہاں جزیرہ العرب اور سلطنتِ روم کے مابین اس سرحدی علاقے میں بڑی تعداد میں ایسے جنگجو قبائل آباد تھے کہ جو اگرچہ عرب تھے، لیکن وہ نصرانی تھے، نیز سیاسی طور پر وہ سلطنتِ روم کے زیر اثر بھی تھے، یعنی عرب ہونے کے باوجود وہ رومیوں کے ہم مذہب بھی تھے اور ان کے زیر اثر بھی تھے، اور اسی وجہ سے ان کی تمام تروف فاداریاں بھی رومیوں کے ساتھ ہی تھیں، غرضیکدینی سیاسی و اقتصادی ہر لحاظ سے وہ رومیوں کے ہی

ساتھی اور ہمنوائیخ۔

لیکن اب رسول ﷺ کی وہاں تشریف آوری اور بیک روزہ قیام کے موقع پر ان میں سے متعدد قبائل کے سر کردہ افراد اور رہنماء آپؐ کی خدمت میں از خود حاضر ہوئے، اور اپنی طرف سے مسلمانوں کے خلاف ہر قسم کی جاریت سے باز رہنے کا یقین دلاتے ہوئے صلح کی خواہش نیز جذبہ خیر سگالی کا اظہار کیا..... یہ بات مسلمانوں کیلئے یقیناً باعثِ مسرت تھی۔

☆..... مدینہ اور اس کے مضائقات میں اب تک منافقین کی بڑی تعداد موجود تھی، جو کہ چھپے ہوئے دشمن اور آستین کے سانپ کی حیثیت رکھتے تھے، مسلمانوں کی ان بڑھتی ہوئی فتوحات سے وہ انہائی نالاں اور رنجیدہ تھے، دین اسلام اور پیغمبر اسلام کو نقصان پہنچانے کیلئے ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتے تھے، پہلے وہ مشرکین مکہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے تانے بانے بننے میں مصروف رہتے تھے، اب مزید یہ کہ انہوں نے مسلمانوں کے ایک اور بڑے دشمن اور روئے زمین کی بہت بڑی قوت یعنی "سلطنتِ روم" کے ساتھ بھی خفیہ تعلقات استوار کر لئے تھے، مسلمانوں کی خبریں وہ خفیہ طور پر رومیوں تک پہنچایا کرتے تھے، نیز مدینہ میں خفیہ مقامات پر وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور ان کے خلاف سارشیں تیار کرنے اور خفیہ منصوبے تیار کرنے کی غرض سے خفیہ اجتماعات منعقد کیا کرتے تھے، چنانچہ غزوہ توبک کے موقع پر جو کچھ ہواں میں بھی انہی کی طرف سے پھیلائی گئی افواہوں کا بہت بڑا عمل دخل تھا، مسلمانوں میں تشویش اور افراطی پھیلانے نیز انہیں خوفزدہ و پریشان کرنے کی غرض سے یہی منافقین، رومیوں کی طرف سے مدینہ پر بڑے تباہ کن حملے کیلئے تیاریوں کی چھوٹی خبریں پھیلاتے رہے، اور پھر جب رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر کے ہمراہ توبک کی جانب روانہ ہوئے تب یا ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے

رہے اور بہت خوشیاں مناتے رہے..... کہ یہ مسلمان چلے ہیں اب اتنی بڑی قوت سے
ٹکر لینے کیلئے..... جب ان کا رومیوں کے ساتھ آمنا سامنا ہوگا اور جنگ کی نوبت آئے گی
تو یقیناً یہ سب نیست ونا بود ہو جائیں گے..... ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنی جان
بچا کر زندہ واپس آنا نصیب نہیں ہوگا..... یہ سب وہیں مارے جائیں گے..... لہذا ان
مسلمانوں سے ہمیشہ کیلئے ہماری جان چھوٹ جائے گی.....!

لیکن رسول اللہ ﷺ اپنے جاں ثارسا تھیوں سمیت کامیاب و کامران اور ہنسی خوشی
واپس مدینہ تشریف لائے وہاں تبوک میں کسی جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی، لہذا کوئی
جانی یا مالی نقصان بھی نہیں ہوا، مسلمانوں کی تمام قوت حفظ رہی، بلکہ عزت و شوکت
مزید بڑھ گئی مزید یہ کہ وہاں بہت سے سرحدی قبائل کے سرداروں نے آکر خود
مسلمانوں کے ساتھ صلح کر لی، اپنی طرف سے وفاداری اور عدم جارحیت کا یقین دلایا،
اور خیر سگالی کا اظہار کیا یوں مسلمانوں کیلئے یہ سفر تو بہت زیادہ کامیاب اور مفید ثابت
ہوا..... یہ صورت حال ان منافقوں اور بدخواہوں کیلئے بڑے صدمے کا باعث بنی ان
کے دل مر جھانے لگے یوں ان کے ناپاک عزم خاک میں مل گئے ان کے حوصلے
پست ہو گئے جبکہ مسلمانوں کے حوصلے مزید بلند ہو گئے !!

☆..... حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی وفات:

سن ۱۹ ہجری میں غزوہ تبوک سے کامیاب و کامران اور ہنسی خوشی واپسی کے فوری بعد رسول
الله ﷺ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں، تمام
مسلمانوں کیلئے عموماً، اور آپ کیلئے خصوصاً ایک باپ کی حیثیت سے فطری اور طبعی طور پر یہ
سانحہ بہت زیادہ رنج اور صدمے کا باعث بنا، بلکہ اس سے محض ایک سال قبل ہی آپ کی

بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بھی انتقال ہو چکا تھا، اور اس سے بھی پہلے ماهِ رمضان سن ۲، ہجری میں عین غزوہ بدر کے روز آپ ﷺ کی دوسرے نمبر کی صاحبزادی یعنی حضرت رقیر رضی اللہ عنہا بھی انتقال کر چکی تھیں.....

یوں رسول ﷺ کی چار صاحبزادیوں میں سے یہ تین صاحبزادیاں خود آپؐ کی حیات طیبہ کے دوران، اور آپؐ کی آنکھوں کے سامنے..... اور عین جوانی کی عمر میں..... اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں..... اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں..... اور ہمیں اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل و کرم سے وہاں جنت الفردوس میں اپنے حبیب ﷺ نیز آپؐ کی آل اور تمام صحابہ کرام رضویں اللہ علیہم اجمعین کی صحبت و معیت عطا فرمائیں۔

آمین برحمتك يا رحم الرحيمين۔



الحمد لله آج بتاریخ ۱۹ / محرم ۱۴۳۵ھ، مطابق ۲۲ / نومبر ۲۰۱۳ء، بروز جمعیہ باب مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبَّ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

عام الوفود؛ یعنی وفود کی آمد کا سال:

ہجرت کے آٹھویں سال ماه رمضان میں فتحِ کایدگار اور عظیم ترین تاریخی واقعہ پیش آئے کے بعد میں اسلام کو اور مسلمانوں کو بڑی تقویت نصیب ہوئی، جبکہ مشرکین اور خلیفین کی قوت اور شان و شوکت بری طرح متاثر ہوئی، اور پھر محض اگلے ہی سال یعنی جب ہجرت کا نواں سال چل رہا تھا، تبوک سے مسلمانوں کی یوں صحیح سالم اور بخیر و عافیت واپسی اسلام اور مسلمانوں کیلئے مزید عزت و نیک نامی اور شان و شوکت کا سبب بنی، جبکہ مشرکین و منافقین مزید کمزور پڑ گئے اور دل برداشتہ ہو گئے، اس تمام صورتِ حال کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ اب جزیرہ العرب میں دین اسلام اجنبی یا ناماؤں نہیں رہا، بلکہ اب دور دور تک اسلام کا چرچا ہونے لگا اور بڑی سرعت کے ساتھ دین اسلام پھیلتا چلا گیا..... لوگ بڑی تعداد میں فوج درفوج مسلمان ہونے لگے..... حتیٰ کہ اطراف و اکناف اور دور دراز کے علاقوں میں آباد قبائل کو بھی اب اس بدلتی ہوئی صورتِ حال میں دین اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی ججو ہونے لگی، اور اس مقصد کیلئے مختلف قبائل نے اپنے وفود میں ارسال کئے، چنانچہ ان دو سالوں یعنی ہجرت کے نویں اور دسویں سال بڑی تعداد میں وفود کی مدینہ آمد ہوئی، بالخصوص نویں سال یہ سلسلہ کافی عروج پر رہا اور اس سال مدینہ آنے والے ان وفود کی تعداد ستر سے زائد تھی، جن میں سے بعض وفود پچاس یا ساٹھ سے زائد افراد پر مشتمل تھے۔

دور دراز کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل ان وفود کی بڑی تعداد میں مدینہ

آم کا مقصد یہی تھا کہ یہ لوگ دینِ اسلام اور چشمِ اسلام کی تعلیمات اور طور طریقوں کا پی آنکھوں سے دیکھ سکیں، قریب رہ کر ان تعلیمات کو جان سکیں اور پھر جانچ سکیں.....

چنانچہ مدینہ میں قیام کے دوران یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی نیز آپؐ کے جاں ثار ساتھیوں کی سادہ اور پاکیزہ زندگی کا پی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے، آپؐ کے اعلیٰ اخلاق و کردار کو دیکھتے، اور اس حقیقت کو دیکھتے کہ اب تو آپؐ گوملکِ عرب کی وسیع سلطنت حاصل ہو چکی ہے، یعنی اب آپؐ صاحبِ اللہ کے نبی اور دینی رہنماء ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اب تو آپؐ اتنی بڑی سلطنت کے حکمران اور فرمانروای بھی بن چکے ہیں..... مگر اس کے باوجود کوئی فخر و غرور نہیں ہے..... کوئی زیب و زینت نہیں ہے..... کوئی عیش و عشرت نہیں ہے..... بس وہی سیدھی سادھی زندگی ہے..... مسجد کی وہی چٹائی آپؐ کا شاہی تخت ہے..... اور وہی پرانا عمامہ آج بھی آپؐ کے سر کا تاج ہے..... گھر میں ایک چار پائی ہے جو کہ بان کی رسیوں سے بُنی ہوئی ہے، جب آپؐ آرام کی غرض سے اس پر لیٹتے ہیں تو جسم مبارک پر ان رسیوں کے نشان پڑ جاتے ہیں..... آپؐ کے جاں ثاروں اور فرمانبرداروں کی بہت بڑی فوج موجود ہے، جو ہر دم ہر لمحہ اور ہر آن آپؐ کی خدمت کیلئے بیتاب رہتے ہیں، اور آپؐ کے اشارے کے منتظر رہتے ہیں، مگر اس کے باوجود آپؐ اپنے سبھی کام کا ج خود ہی کرتے ہیں..... اپنے کپڑوں میں پیوند خود ہی لگاتے ہیں..... جوتا پھٹ جاتا ہے تو خود ہی اس کی مرمت کر لیتے ہیں..... اپنے کسی کام کیلئے کسی کو تکلیف نہیں دیتے..... دوسروں کو بھی یہی تاکید و تلقین کیا کرتے ہیں کہ کوئی کسی پر بوجھ نہ بنے..... ہر کوئی اپنا کام کا ج خود کیا کرے..... آپؐ ہر ایک کی عزت کرتے ہیں..... کبھی کسی کا دل نہیں دکھاتے..... کسی کو تکلیف نہیں دیتے..... اور دوسروں کو بھی یہی تعلیم دیتے ہیں کہ کوئی کسی کا دل نہ دکھائے،

کسی کو نقصان نہ پہنچائے..... کسی کا حق نہ دبائے..... کسی کو تکلیف نہ پہنچائے..... نہ تو اپنی زبان سے..... اور نہ ہی اپنی کسی حرکت سے.....

دور راز کے علاقوں سے آئے ہوئے یہ لوگ یہ تمام مناظر دیکھتے..... اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے..... اور پھر واپس اپنے علاقوں میں جا کر اپنے قبائل اور خاندان والوں کو بھی اس بارے میں تفصیلات سے آگاہ کرتے، جس پر وہ سب بھی متاثر ہوتے..... اور یوں اُس دور میں لوگ بہت بڑی تعداد میں فوج درفعہ مسلمان ہوتے چلے گئے..... چنانچہ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ محض ایک سال قبل یعنی ہجرت کے آٹھویں سال فتح مکہ کے تاریخی موقع پر رسول ﷺ کے ہمراہ آپؐ کے جام شارستانیوں کی تعداد دس ہزار تھی، اور پھر محض اگلے ہی سال یعنی ہجرت کے نویں سال غزوہ توبک کے موقع پر آپؐ جب اپنے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے توبک کی جانب رواں دواں تھے تب یہ تعداد میں ہزار تک جا پہنچی تھی..... اور پھر محض اگلے ہی سال یعنی ہجرت کے دسویں سال آپؐ کے ہمراہ جب اللہ اور عکس کے یادگار موقع پر جو صحابہؓ کرام شریک تھے ان کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی..... !!



الحمد لله آن بیتاریخ ۲۷ / محرم ۱۴۳۵ھ، مطابق ۳۰ / نومبر ۲۰۱۳ء، روز ہفتہ

یہ بابِ مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ

حجۃ الوداع:

بیت اللہ کے معما را اول اللہ کے خلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام تھے (۱) جنہوں نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے طور پر تعمیر کعبہ کا مقدس ترین اور تاریخی فریضہ انعام دیا، جب یہ دونوں حضرات تعمیر کعبہ کے مقدس کام سے فارغ ہوئے تو نہیں اللہ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا کہ لوگوں کو حج بیت اللہ کا حکم سنائیں، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَأَذِنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجَّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجَّ عَمِيقٍ﴾ (۲) ترجمہ: (لوگوں میں آپ حج کی منادی کر دیجئے، لوگ آپ کے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور دور دراز کے ہر راستے سے دلبے پتلے اونٹوں پر بھی) یعنی دور دراز کے علاقوں سے طویل سفر کی مشقت و صعوبت برداشت کرنے کی وجہ سے سواری کے یہ جانور کمزور و لاغر ہو چکے ہوں گے۔

چنانچہ اللہ کے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بیت اللہ کے قریب (صفا کی جانب) جبل ابی قتبیس پر چڑھ کر یہ اعلان فرمایا۔

چنانچہ اس ندائے خلیل کے جواب میں دور دراز کے علاقوں اور تمام اطراف و اکناف عالم سے حج بیت اللہ کی غرض سے لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا، مکہ کے اس بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی سے بلند ہونے والی اس نحیف صد اکواں اللہ عزوجل نے اپنی قدرت سے دنیا کے کوئے کو نے تک پہنچا دیا، جس کا عملی مشاہدہ آج بھی حج و عمرہ کے موقع پر بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

(۱) یعنی طوفان نوح [علیہ السلام] کے نتیجے میں بیت اللہ کے آثار و نشانات مت جانے کے بعد از سر نومعا را اول حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔ (۲) ارج [۲۷]

ہزاروں سال گذر جانے کے باوجود جزیرہ العرب کے مشرکین بھی حج بیت اللہ کا خوب اہتمام کیا کرتے تھے، خصوصاً مشرکین مکہ کے نزدیک اس چیز کی مزید اہمیت تھی۔ (۱) البتہ دین اسلام کا سورج طلوع ہونے کے بعد باقاعدہ اسلامی عبادت کی حیثیت سے فرضیت حج کا حکم ہجرت کے نویں سال حج کے موقع پر نازل ہوا، اور اس عبادت کو دین اسلام کی اہم ترین عبادات، بلکہ ”ارکان اسلام“ میں شمار کیا گیا۔

چنانچہ اس حکم کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ”امیر الحجاج“، مقرر فرمایا اور انہیں مسلمان حجاج کی قیادت کرتے ہوئے مکہ مکرمہ کی جانب روائی کا حکم دیا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روائی کے بعد سورہ براءۃ کی ابتدائی چالیس آیات نازل ہوئیں، جن میں کفار و مشرکین کے ساتھ کئے گئے مختلف معاملات کے خاتمے کا، نیز آئندہ کیلئے ان سے مکمل لاتفاقی و برائت (بیزاری) کا اعلان کیا گیا تھا، اسی ”اعلان برائت“ کی وجہ سے یہ سورت ”براءۃ“ کے نام سے مشہور ہوئی۔ (۲)

حج کے موقع پر چونکہ جزیرہ العرب کے تمام اطراف اکناف سے آئے ہوئے حجاج بڑی تعداد میں مکہ میں موجود ہوا کرتے تھے، لہذا یہ بات ضروری تھی کہ کسی طرح اس مناسب ترین موقع پر یہ آیات وہاں مکہ میں تمام حجاج کے اجتماع میں پڑھ کر سنادی جائیں، نیزان آیات کے مفہوم و مضمون اور ان میں موجود احکام سے انہیں آگاہ کر دیا جائے۔

(۱) یعنی دین ابراہیمی سے تودہ یقیناً مکمل مخفف ہو چکے تھے، عقیدہ و ایمان کا فساد، نیز ہر قسم کا اخلاقی بگاڑ بھی ان میں عروج پر تھا..... البتہ اس کے باوجود بیت اللہ کا احترام اور حج کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔

(۲) اس سورہ کا نام ”توبہ“ بھی ہے کیونکہ اس میں ان تین حضرات (کعب بن مالک، بلال بن امیہ اور مرارہ بن الریبع رضی اللہ عنہم) کی قبولیت توبہ کا تذکرہ ہے جو غزوہ توبوک کے موقع پر شریک نہیں ہوئے تھے۔

چنانچہ رسول ﷺ نے اس مقصد کی خاطر اب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مکہ کی جانب روانہ فرمایا، تاکہ وہ ”امیر الحجاج حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ“ سے جا ملیں، اس حکم کی تقلیل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی کہ کی جانب روانہ ہو گئے اور تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔

مکہ عکر مہ پہنچنے کے بعد یوم اخر یعنی دس ذوالحجہ کے روز عرفات میں حاج کے اجتماع کے موقع پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے رسول ﷺ کی طرف سے تاکید کے مطابق وہ آیات تمام مشرکین کو پڑھ کر سنائیں، نیز اللہ سبحانہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ان احکام وہدایات کے بارے میں انہیں مطلع کرتے ہوئے ان کے ساتھ کئے گئے تمام معابدات کے خاتمے کا اعلان کیا۔ (۱)

چونکہ انہی آیات میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ ”مشرکین چونکہ بخس ہیں، لہذا اس سال کے بعداب آئندہ کوئی مشرک مسجدِ حرام کے قریب بھی نہیں جائے گا“۔

چنانچہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے وہاں موجود حاج میں سے مشرکین کو یہ حکم بھی پڑھ کر سنایا اور انہیں اس بارے میں خبردار کیا..... اور یوں مشرکین کیلئے ”حج بیت اللہ“ کا یہ آخری سال ثابت ہوا..... جس کے بعد ان کیلئے ہمیشہ کیلئے ”حدود حرم“ میں داخلے کی ممانعت ہو گئی۔ (۲)

(۱) مشرکین کے مختلف قبائل کے ساتھ مسلمانوں کے معابدات مختلف نوعیت کے تھے اور اسی مناسبت سے یہ ”اعلان براءت“ تمام مشرک قبائل کیلئے یکساں نہیں تھا، بلکہ اس میں کچھ تفصیل تھی، اس بارے میں مزید آگاہی کیلئے سورہ براءۃ کی ابتدائی آیات کی تفسیر ملاحظہ کی جائے۔

(۲) ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرُبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَاهِمْ هَذَا.....﴾ التوبہ [۲۸]

سن ۹ ہجری میں فرضیت حج کے اس حکم کے نزول کے بعد کیا جانے والا یعنی نہایت عجیب و غریب نوعیت کا تھا، اس میں ایسے مناظر تھے کہ جو نہ کبھی اس سے قبل دیکھے گئے تھے اور نہ ہی کبھی اس کے بعد دیکھے گئے..... کیونکہ تاریخ عالم میں یہ واحد حج تھا کہ جس میں مسلمان اور مشرکین بیک وقت دونوں شریک تھے..... دونوں وہاں یکجا تھے..... اور ایک ساتھ مناسکِ حج کی ادائیگی میں مشغول تھے..... البتہ دونوں کے طریقے یقیناً جدا جداتھے.....!

☆☆☆..... اور پھر جب اگلے سال یعنی سن ۱۰ ہجری میں حج کا مہینہ قریب آیا تو رسول اللہ ﷺ نے خود حج کا ارادہ فرمایا، فرضیت حج کا حکم نازل ہونے کے بعد یہی آپؐ کا پہلا حج تھا اور یہی آخری حج تھا جو کہ تاریخ میں ”حجۃ الوداع“ کے نام سے معروف ہے، مسلمانوں کو وجب آپؐ کے اس ارادے کی اطلاع ہوئی تو قریب و دور ہر جگہ سے بڑی تعداد میں انہوں نے نہایت ذوق و شوق اور خوب جذبہ لگن کے ساتھ حج کی تیاری شروع کر دی، کیونکہ اس سے قبل اسلامی عبادت کے طور پر کبھی حج ادا نہیں کیا گیا تھا، مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی معیت صحبت میں اس مبارک اور اہم ترین فریضے کی ادائیگی کی تو یقیناً شان ہی کچھ نہ زالی تھی..... اس کے علاوہ یہ کہ اسلامی فریضے کی حیثیت سے چونکہ حج کا یہ پہلا موقع تھا، لہذا ہر ایک کی خواہش تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں اب اسلامی طریقے کے مطابق حج ادا کیا جائے اور اس نادر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپؐ سے براہ راست ”مناسکِ حج“ کی بھی خوب اچھی طرح عملی تربیت حاصل کر لی جائے۔

چنانچہ دور دراز کے علاقوں سے بھی بہت بڑی تعداد میں شمع توحید کے پروانے مکہ پہنچنے لگے، اور پھر رسول اللہ ﷺ کی صحبت و معیت میں حج کے دوران جب یہ خوش نصیب افراد میدان عرفات میں جمع تھے تب وہاں ان کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی، اس سے

قبل کبھی حج کے موقع پر پشم فلک نے اتنا بڑا جمیع غیر اور انسانوں کا انحراف کیا انہیں دیکھا تھا..... اور تب وہاں میدانِ عرفات میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی اونٹی "قصواء" پر سوار ہو کر حجۃ الوداع کا وہ مشہور اور یادگار ترین خطبہ دیا جو تمام دنیا کے انسانیت کیلئے "دستورِ عمل" کی حیثیت رکھتا ہے، اور جسے بجا طور پر "انسانی حقوق" کا بہترین منشور کہا جا سکتا ہے..... چنانچہ اس موقع پر آپؐ نے اس عظیم الشان مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: *أَيُّهَا النَّاسُ!* اسْمَعُوا قَوْلِي ، فَإِنِّي لَا أُدْرِي ، لَعَلَّيْ لَا أَلْقَكُمْ بَعْدَ عَامِي هَذَا الْمَوْقِفِ أَبْدَا ، يَعْنِي "لوگو! میری بات غور سے سنو، کیونکہ شاید آج کے بعد آئندہ کبھی اس موقع پر میری تم سے ملاقات نہیں ہو سکے گی....."

اس کے بعد آپؐ نے اپنی امت کو "توحید" کا سبق ایک بار پھر یاد دلایا..... کہ جس پر دینِ اسلام کی اصل بنیاد ہے..... اور جو تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا اصل مقصد بعثت ہے۔ اس کے علاوہ آپؐ نے مزید ارشاد فرمایا: *إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ ، كَحُرْمَةٍ يَوْمَكُمْ هَذَا ، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا ، وَفِي شَهْرِكُمْ هَذَا ، يَعْنِي "بے شک تمہارا خون، تمہارا مال، تمہاری عزت و آبرو باہم ایک دوسرے کیلئے اسی طرح حرام ہیں کہ جس طرح آج کا یہ دن، اور یہ شہر، اور یہ مہینہ قابلِ احترام ہے،*

یعنی یہ حج کا دن، یہ مہینہ، اور یہ مقام جہاں حج بیت اللہ کے مناسک ادا کئے جا رہے ہیں جس طرح یہ سب کچھ واجب الاحترام ہے..... اور تم ان تمام چیزوں کی انتہائی عزت و تعظیم کیا کرتے ہو..... یعنیہ اسی طرح اے مسلمانو! آپس میں ایک دوسرے کیلئے تمہاری جان، تمہارا مال، اور تمہاری عزت و آبرو بھی واجب الاحترام ہے..... ایک دوسرے کے خلاف قتل و غارتگری، لوٹ مار، اور عزت و آبرو کی پامالی اسی طرح تم سب پر حرام ہے.....!

نیز آپ ﷺ نے اس موقع پر اخوت و مساوات، تجمل و برداشت، رواداری، اور بقاءے باہمی کا سبق سکھاتے ہوئے ان سب کو یہ حقیقت بھی یادداہی کہ ”تمام انسان آدم کی اولاد ہیں، اور آدم مٹی سے بنے تھے، الہذا عزت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔“

اس طرح رسول ﷺ نے اس اہم ترین موقع پر اپنے اس یادگار خطبے میں انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کی قدر و قیمت کو سمجھنے کا سبق سکھایا، اور اس کی حفاظت اور احترام کی تاکید و تلقین فرمائی۔

نیز اس موقع پر آپ ﷺ نے اپنی امت کو مزید بہت سی وصیتیں اور نصیحتیں فرمائیں، خصوصاً کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق کی حفاظت و رعایت، نیز عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت اور نرمی برتنے کی خاص تاکید فرمائی۔

مجموعی طور پر اس خطبے میں جہاں عقیدہ و ایمان کی حفاظت، کتاب و سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھنے، اور ”حقوق اللہ“ کی ادائیگی کی خوب تاکید و تلقین کی گئی تھی..... وہیں ”حقوق العباد“ کی ادائیگی کا بھی بہت زیادہ تاکید و اصرار کے ساتھ حکم دیا گیا تھا..... یہی وجہ ہے کہ صرف مسلمان ہی نہیں، بلکہ اغیار میں سے بھی بڑے بڑے نامی گرامی نظرکریں و مصلحین اور دانشوروں کی نظر میں یہ ”خطبہ حجۃ الوداع“، ”محض وعظ و نصیحت ہی نہیں“ بلکہ بجا طور پر یہ ”انسانی حقوق“ کا بہترین ”منشور“ بھی ہے۔

اور پھر اس خطبے کے اختتام پر رسول ﷺ نے اس عظیم الشان مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار فرمایا ”آلَّا هَلْ بَلَغْتُ؟“ یعنی ”کیا میں نے تم تک اللہ کا دین پہنچا دیا؟“ اس پر وہ سب بیک زبان بولے: نَسْهَدُ بِأَنَّكَ بَلَغْتَ، وَأَدَيْتَ، وَنَصَحْتَ، یعنی ”هم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کا دین پہنچا دیا، اور آپ کے ذمے (تبیخ دین کی) جو

امانت تھی، وہ آپ نے ادا کر دی، اور آپ نے خوب نصیحت فرمادی،“تب رسول اللہ ﷺ نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے تین بار یہ کلمات کہے: اللَّهُمَّ فَأَشْهِدُ اللَّهُمَّ فَأَشْهِدُ ، لیکن ”اے اللہ! اب تو بھی گواہ رہنا.....“ (۱)

اس یادگار موقع پر رسول اللہ ﷺ جب اپنے اس تاریخی خطبے سے فارغ ہوئے تو وہیں اسی وقت اور اسی مقام پر میدان عرفات میں ہی قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِلَيْكُمْ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتَمَّتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيَتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (۲) ترجمہ: (آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھر پور کر دیا اور تمہارے اسلام کے دین ہونے پر رضا مند ہو گیا)

اس آیت میں اللہ سبحانہ، و تعالیٰ کی طرف سے ”تکمیل دین“ کی خوشخبری دی گئی تھی، یعنی اللہ کے دین کے نزول کا سلسلہ، نیز نزولِ وحی اور نبوت کا سلسلہ، جس کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی تھی، مختلف اوقات، مختلف مقامات، اور مختلف انبیائے کرام علیہم السلام سے ہوتا ہوا یہ مبارک سلسلہ آج اپنے عروج اور مرحلہ تکمیل کر پہنچ گیا۔

(۱) اس تاریخی خطبے کی تفصیلات صحیح بخاری و صحیح مسلم و دیگر کتب حدیث میں موجود ہیں (باب حجۃ النبی ﷺ)

(۲) المائدہ [۲]

الحمد للہ آج بتاریخ ۱۳/ صفر ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱۳/ دسمبر ۲۰۱۳ء بروز جمعہ بی باب مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّلَ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ

اپنے رب کی طرف واپسی:

ہجرت کے دسویں سال حجۃ الدواع کے دوران میدانِ عرفات میں وقوف کے موقع پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی آیت: ﴿أَيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ أَتَمَّتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾ میں اگرچہ "تمکیلِ دین" کی عظیم خوشخبری تھی کہ جس پر اہل ایمان بہت زیادہ شاداں و فرحائیں ہو گئے تھے..... لیکن اس آیت میں اس عظیم بشارت کے ساتھ ساتھ ایک پیغام اور "اشارہ" بھی پوشیدہ تھا..... جس کی طرف اُس وقت حضرات صحابہ گرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی توجہ نہیں گئی تھی..... البتہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اُس خفیہ "اشارے" کو بھجو گئے تھے، اور قب وہ انتہائی رنجیدہ و افسردہ ہو گئے تھے۔

وہ خفیہ "اشارہ" دراصل یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر دی گئی تھی کہ اے ہمارے حبیب! آپ کا مقصد بعثت اب پورا ہو چکا ہے..... لہذا اب اس دنیاۓ فانی سے آپ کی واپسی کا وقت قریب ہے.....!

مزید یہ کہ اس حج کے موقع پر آپ ﷺ نے اپنے یادگار خطے کے آغاز میں یہ یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے کہ "لوگو! میری بات غور سے سنو، کیونکہ شاید آج کے بعد آئندہ کبھی اس موقع پر میری تم سے ملاقات نہیں ہو سکے گی"!

نیز اس حج کے دوران ایام التشریق میں رمی جمرات کے موقع پر بھی آپ نے اپنے جاں شار ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کلمات ارشاد فرمائے تھے: **خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ**

..... لَعَلَّيْ لَا أَلْقَا كُمْ بَعْدَ عَامِي هَذَا لیعنی ”لوگو! یہ مناسک حج تم مجھ سے خوب اچھی طرح سیکھ لو..... کیونکہ شاید اب آئندہ کبھی اس مقام پر میری تم سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔“

جبکہ اس سے کچھ عرصہ قبل ہی سورۃ ”النصر“ بھی (۱) نازل ہو چکی تھی، جس میں فتح مکہ جیسے اہم ترین اور تاریخی واقعہ کے نتیجے میں لوگوں کے فوج درفعہ قبولِ اسلام کا تذکرہ تھا..... لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں ایک اشارہ بھی پوشیدہ تھا..... اور وہ یہ کہ ”مقصدِ بعثت اب پورا ہو چکا..... لہذا اے ہمارے نبی..... اب آپ کی واپسی کا وقت قریب ہے، اور اس چیز کا تقاضا یہ ہے کہ اب آپ زیادہ سے زیادہ اپنے رب کی تسبیح اور حمد و ثناء بیان کیجئے، اور تو بہ واستغفار کا خوب اہتمام کیجئے۔“

اس موقع پر بھی اس سورت کے معنی و مفہوم میں چھپے ہوئے اس خاص ”اشارے“ کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی تھی..... البتہ رسول ﷺ کے خاص ساتھی اور ”یارِ عزاء“ لیعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس خاص ”اشارے“ کو سمجھ گئے تھے..... اور بت بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ لکھے تھے۔ (۲)

(۱) اذا جاء نصر اللہ والفتح (۲) سورۃ النصر میں پوشیدہ اسی ”اشارے“ کے تفاصیل پر عمل کرتے ہوئے ہر انسان کو چاہئے کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں جب اس دنیاۓ فانی سے رخصتی کا وقت قریب آچکا ہو..... تو بکثرت استغفار کا اہتمام و اتزام کرے، کیونکہ دنیا سے رخصتی اور اپنے خالق و مالک کی طرف روائی سے قبل انسان کیلئے یہ بات اہمی ضروری ہے کہ وہ گناہوں کے بوجھ سے آزاد ہو، ظاہری و باطنی پا کیزگی و نفاست سے آراستہ ہو، عیوب و نقاص کم ہوں اور خیر و خوبی زیادہ ہو، اس کی گردن میں کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کا کوئی بوجھ نہ ہو..... بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کی ہمیشہ ہی یہی کیفیت رہنی چاہئے..... کیونکہ کیا معلوم آخری وقت کب آجائے.....؟؟

نیز یہ کہ اسی سال حج سے قبل جب رمضان کامبارک مہینہ آیا تھا، تب رسول اللہ ﷺ نے جبریل امین علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا دوبار ”مذکورہ“ فرمایا تھا (۱)، جبکہ اس سے قبل ہر سال ماہ رمضان میں قرآن کریم کا یہ ”مذکورہ“ ایک بار کرنے کا معمول تھا۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ اس سے قبل ہمیشہ ماہ رمضان میں اپنی مسجد میں دس روز ”اعتكاف“ فرمایا کرتے تھے، جبکہ اس سال جب رمضان آیا تھا، تب آپ ﷺ نے خلافِ معمول بیس روز اعتكاف فرمایا تھا، اور جب آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس کی وجہ دریافت کی تھی، تو آپ ﷺ نے اپنی لاڈلی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی تھی کہ: ”مجھے اب اپنی موت قریب محسوس ہوتی ہے۔“ (۲)

انہی دنوں آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب ملک یمن کی جانب روانہ فرمایا تو آپ اس موقع پر انہیں رخصت کرنے کی غرض سے کچھ دور تک ان کے ہمراہ چلتے رہے..... اس موقع پر حضرت معاذ اپنی سواری پر تھے، جبکہ آپ ان کے ہمراہ پیدل ہی چل رہے تھے..... اور پھر ایک جگہ رُک کر آپ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”اے معاذ! شاید اب دوبارہ ہماری کمگہ ملاقات نہیں ہو سکے گی..... تم جب یمن سے واپس آؤ گے تو شاید میری مسجد..... اور میری قبر..... کے قریب سے گذر و گے.....“ اور تب آپ ﷺ کی زبانی یہ بات سن کر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پھوٹ کر رو دیئے تھے.....

اور پھر آپ ﷺ نے اپنا رُخ انور مدینہ شہر کی جانب موڑ لیا تھا، اور اس طرف بغور دیکھتے

(۱) یعنی رسول اللہ ﷺ اور جبریل امین علیہ السلام دنوں باہم ایک دوسرے کو قرآن کریم سنایا کرتے تھے (ذور کیا کرتے تھے) (۲) لاری إلَّا حَضَرَ أَجَابَی (بخاری [۳۹۹۶] کتاب [۲۹] نضائل القرآن، باب [۷] کان جبریل یہ رُخ القرآن علی النبی ﷺ)

ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا ”إِنَّ أُولَى النَّاسِ بِالْمُتَقْوَى، مَنْ كَانُوا، وَ حَيْثُ كَانُوا“ (۱) یعنی ”مجھ پر سب سے زیادہ حق ان لوگوں کا ہے جو ”متقی“ ہوں، خواہ وہ کوئی بھی ہوں، اور جہاں کہیں بھی ہوں“ (۲)

اسی کیفیت میں سن دس بھری اپنے اختتام کو بینچا، اور اس کے بعد جب اگلا سال آیا، یعنی سن گیارہ بھری، تو اس نے سال کا پہلا مہینہ یعنی محرم آیا اور گذر گیا، اور پھر دوسرا مہینہ یعنی صفر شروع ہوا تو اس مہینے کے آغاز کے ساتھ ہی آپ نے باقاعدہ اپنے ”سفر آخرت“ کی تیاری شروع فرمادی، چنانچہ انہی دنوں ایک روز آپ میڈانِ احمد کی طرف تشریف لے گئے، اور وہاں شہدائے احمد کیلئے دعائے مغفرت فرمائی، اور پھر وہاں سے واپسی پر آپ نے لوگوں کے سامنے مختصر خطبہ دیا، جس میں آپ نے فرمایا: ”إِنِّي فَرَطْكُمْ، وَإِنِّي شَهِيدٌ عَلَيْكُمْ، وَإِنِّي وَاللَّهِ لَا نَظُرٌ إِلَى حَوْضِي الآن“ (۳) یعنی ”لوگو! میں تم سے آگے جانے والا ہوں، اور میں تمہارے بارے میں گواہی دینے والا ہوں، اللہ کی قسم! میں اپنے حوض کو بھی سے دیکھ رہا ہوں“۔ (۴)

اور پھر انہی دنوں ایک رات آپ ﷺ نصف شب کے قریب ”بیقع“ (۵) تشریف لے گئے، اور اہل بیقع (۶) کیلئے دعائے خیر فرمائی۔ (۷)

(۱) احمد [۲۱۵۲۷] (۲) گویا اس طرح رسول ﷺ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی دلجوئی فرمانا چاہتے تھے کہ اب اگرچہ انہیں کبھی آپؐ کی زیارت نصیب نہیں ہو سکے گی، لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں، کیونکہ ”اہل تقویٰ“ کا تو آپؐ کے ساتھ ہمیشہ ہی بہت قریبی تعلق رہے گا..... خواہ وہ کوئی بھی ہوں، اور جہاں کہیں بھی ہوں۔

(۳) بخاری [۲۶۲۲] کتاب الرقاق [۱۸] باب [۷] ماتحذ من زهرة الدنيا..... (۴) یعنی ”حوض کوثر“

(۵) یعنی مدینہ کا قبرستان (۶) یعنی قیمع میں مدفن مسلمانوں کیلئے.....

(۷) احمد عن أبي مويه به، مولى اللہ ﷺ [۱۵۵۶۷]

مرض الموت:

سن گیارہ بھری میں جب ماہ صفر کے آخری دن چل رہے تھے، تب ۲۹ صفر بروز پیغمبر رسول ﷺ کی نمازِ جنازہ پڑھا کر بقیع سے جب واپس تشریف لارہے تھے، کہ اچانک راستے میں ہی آپ گودر دسر کی تکلیف شروع ہو گئی، جو کہ دیکھتے ہی دیکھتے شدت اختیار کر گئی، اور پھر ساتھ ہی شدید بخار بھی ہو گیا، یہ تکلیف مسلسل تیرہ یا چودہ دن جاری رہی، بالآخر یہی تکلیف ”مرض الموت“ ثابت ہوئی۔

اور پھر ماہ صفر کے اختتام کے بعد ماہ ربیع الاول شروع ہوا..... آج سے تریسٹھ بر س پہلے بھی ربیع الاول کا مہینہ آیا تھا..... جب نبی رحمت ﷺ کی ولادت باسعادت کی وجہ سے یہ تمام کائنات جھوم آٹھی تھی..... اس جہاں رنگ و بویں بہار کا جھونکا آیا تھا..... اور اب تریسٹھ بر س بعد پھر وہی ربیع الاول ہی کا مہینہ آیا تھا..... لیکن اس باریہ ربیع الاول ”مزدہ بہار“ نہیں..... بلکہ ”پیغامِ خزان“ بن کر آیا تھا۔

اس دوران مرض مسلسل شدت اختیار کرتا گیا، ان دونوں آپ ﷺ کی بشرت ”معوذتین“ (۱) پڑھتے اور اپنے ہاتھوں پردم کر کے انہیں اپنے جسم اطہر پر پھیر لیتے، جب کمزوری بڑھ گئی تو ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہی دونوں سورتیں پڑھ کر آپ کے دست مبارک پردم کرتیں، اور پھر انہیں پکڑ کر آپ کے جسم پر پھیر دیا کرتیں۔

اس دوران شدت مرض اور نقاهت کے باوجود آپ اب تک بدستور نماز کیلئے مسجد تشریف لے جاتے، اور خود نماز بھی پڑھاتے، البتہ مسجد میں وعظ و نصیحت وغیرہ کا کوئی سلسلہ اب جاری

(۱) ”معوذتین“ یعنی سورہ ”قل اعوذ برب الْفَلَق“ اور ”قل اعوذ برب النَّاس“

نہیں رہ سکا تھا۔

آخری چھ ایام، نیز آخری وصیتیں:

☆.....☆ / ربع الاول بروز بدھ:

اس روز آپ ﷺ کو قدرے افاقہ محسوس ہوا اور طبیعت کچھ سنبھلی تو ظہر کے وقت آپؐ نماز سے کچھ قبل ہی مسجد تشریف لے گئے، اور بظاہر اس موقع پر وہاں موجود اپنے صحابہؐ کرام کو خطاب کرتے ہوئے آپؐ نے قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کیلئے یہ ارشاد فرمایا: **لَغْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْيَهُودِ وَ النَّصَارَى، إِتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَاِهِمْ مَسَاجِدَ**“ (۱) یعنی ”اللہ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائی، کیونکہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا“،

نیز اس موقع پر آپ ﷺ نے یہ ارشاد بھی فرمایا: **”لَا تَتَخِذُوا قَبْرِي وَ شَنَآءِ عَبَدُ“** یعنی ”میرے بعد تم کسی بت کی مانند میری قبر کی پرستش میں نہ لگ جانا“ (۲)

یوں اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری دنوں میں آپ ﷺ نے نہایت اہتمام کے ساتھ اپنی امت کو ہمیشہ کلیے شرک اور قبر پرستی سے بازرہنے کی وصیت اور تاکید و تلقین فرمائی۔

اور پھر اسی موقع پر ہی آپ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: (مَنْ كُنْتُ جَلَدْتُ لَهُ ظَهِرًا فَهَذَا ظَهْرِي ، فَلَيَسْتَقْدِمْنَهُ ، وَمَنْ كُنْتُ شَتَمْتُ لَهُ عِرْضًا فَهَذَا عِرْضِي ، فَلَيَسْتَقْدِمْنَهُ) (۳) یعنی ”جس کسی کو میں نے ناقص کبھی مارا یا ہوئو تو یہ میری کر حاضر

(۱) [بخاری ۲۲۳۳] کتاب المغازی [۲۶] باب [۸۳] مرض النبی ﷺ وفاتہ۔

(۲) الرجیل الخاتوم ”قبل الوفاة بخمسة أيام“ صفحہ: ۳۶۵، بحوالہ: موطا امام مالک صفحہ: ۲۵۔

(۳) مجمع الزوائد للبهیشی، عن الفضل بن عباس۔ حدیث: ۱۲۵۲، ج: ۹، باب فی دواعی ﷺ۔

ہے، وہ آئے اور مجھ سے بدل پکالے..... اگر میں نے کبھی کسی کو بے عزت کیا ہو تو وہ آئے اور مجھ سے اپنا انتقام لے لے۔

اور پھر مزید یہ بھی فرمایا: ”جس کسی کا میرے ذمے کوئی حق ہو تو وہ آئے اور مجھ سے اپنا حق وصول کرے۔“

رسول ﷺ کی زبان مبارک سے صحابہ کرام یہ تمام گفتگو سننے رہے..... اور ہچکیاں لے لے کر روتے رہے.....

غور طلب بات ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی ﷺ کو تمام دنیاۓ انسانیت کیلئے ”رحمت“ بنا کر بھیجا تھا، آپ ﷺ کے تمام بنی نوی انسان پر بیشمار احسانات تھے، اور بالخصوص وہ لوگ جو کہ اُس وقت آپؐ کی اُس مجلس میں موجود تھے، جو اُس وقت آپؐ کے براہ راست مخاطب تھے، ان پر تو آپؐ کے بہت ہی زیادہ احسانات تھے..... اور پھر یہ کہ آپؐ اللہ کے رسول تھے، بلکہ سید الانبیاء والمرسلین تھے، جبکہ وہ لوگ تو محض آپؐ کے امتی تھے..... لیکن اس کے باوجود..... آپؐ کا تواضع عجز و انکسار..... اور حسن اخلاق ملاحظہ ہو..... کہ آپؐ اُس موقع پر انہیں مخاطب کر کے یہ تمام باتیں ارشاد فرماتے رہے۔

اس کے بعد آپؐ منبر سے نیچے تشریف لائے اور ظہر کی نماز پڑھائی، نماز سے فراغت کے بعد آپؐ دوبارہ منبر پر جلوہ افروز ہوئے، آپؐ کا اپنے منبر پر یہ آخری جلوہ تھا..... اور اب آپؐ نے انصارِ مدینہ کے حق میں چند وصیتیں فرمائیں، اور ان کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک اور ان کے اکرام و احترام کی بہت زیادہ تاکید فرمائی۔

اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا (إِنَّ عَبْدًا خَيْرُهُ اللَّهُ أَنْ يُؤْتِيَهُ مِنْ رَهْرَةِ الدُّنْيَا مَا شَاءَ، وَبَيْنَ مَا عِنْدَهُ، فَاخْتَارَ مَا عِنْدَهُ) یعنی ”اللہ کا ایک بندہ ہے،

جسے اللہ نے اس بات کا اختیار دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اللہ اسے دنیاوی زندگی کی خوب رونقیں عطا فرمائے، اور اگر وہ چاہے تو اب اللہ کے پاس موجود نعمتوں میں چلا آئے..... اور اس بندے نے اللہ کے پاس موجود نعمتوں کو پسند کر لیا ہے۔ (۱)

حضرت ابوسعید خدري رضي اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”یہ بات سن کر حضرت ابو بکر رضي اللہ عنہ روئے لگے..... اور یوں کہنے لگے (فَدَيْنَاكَ بِآبَائِنَا وَأَمَهَاتِنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ) یعنی ”اے اللہ کے رسول! آپ پر ہمارے ماں باپ قربان“۔

ابو بکر کی اس کیفیت پر ہمیں تجھب ہونے لگا..... اور یہ منظر دیکھ کر کچھ لوگ یوں کہنے لگے کہ ابو بکر کو دیکھو..... رسول اللہ ﷺ ہمیں یہ بات بتا رہے ہیں کہ ”اللہ کا ایک بندہ ہے، جسے اللہ نے اس بات کا اختیار دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اللہ اسے دنیاوی زندگی کی خوب رونقیں عطا فرمائے..... اور اگر وہ چاہے تو اب اللہ کے پاس موجود نعمتوں میں چلا آئے..... اور اس بندے نے اللہ کے پاس موجود نعمتوں کو پسند کر لیا ہے۔“ اور ذرہ ابو بکر کو دیکھو..... رسول اللہ ﷺ کی یہ بات سن کر یہ رورہ ہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ”اے اللہ کے رسول! آپ پر ہمارے ماں باپ قربان.....“ بھلا کیا بات ہوئی؟؟.....

اس کے بعد حضرت ابوسعید خدري رضي اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (فَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ الْمُخَيْرُ، وَكَانَ أَبُوبَكْرُ أَعْلَمَنَا) یعنی ”اللہ کی طرف سے اپنے جس بندے کو یہ اختیار دیا گیا تھا..... وہ خود رسول اللہ ﷺ تھے..... اور ابو بکر ہم سبھی سے زیادہ علم والے تھے۔“ (۲)

(۱) یعنی اس دنیا میں مزید زندگی برکرنے کی بجائے اللہ کے پاس چلے جانے کو پسند کر لیا ہے.....

(۲) متفق علیہ، مشکاة المصابح [۵۹۵] کتاب الفضائل والشماکل، باب بحیرۃ اصلاحیہ من مکۃ.....

مطلوب یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے اختیار دیئے جانے پر جواب میں رسول ﷺ
اس فانی دنیا میں اب مزید زندگی بسر کرنے کی بجائے اپنے رب کے جوار رحمت میں منتقل
ہو جانے کو پسند فرم اچکے تھے.....، ہم اس بات کو نہیں سمجھ سکے..... البتہ ابو بکر (رضی اللہ عنہ)
ہم میں سب سے زیادہ علم و دانش سے مالا مال تھے..... رسول ﷺ کی گنتلگو کو اور اس میں
پوشیدہ اسرار و روزگار سب سے زیادہ وہی سمجھنے والے تھے..... لہذا اس راز کی بات کو ہم
نہیں سمجھ سکے، اور اس وجہ سے ہم تجب کرنے لگے..... جبکہ ابو بکر اس راز کو سمجھ گئے
اورتب وہ بے اختیار رونے لگے۔

☆/ رجوع الاول بروز جمعرات:

اس روز یعنی رحلت سے چار روز قبل رسول ﷺ کی طبیعت مزید ناساز ہو گئی، اور مرض کی
شدت بڑھ گئی، اس وقت آپؐ کے گھر میں متعدد افراد موجود تھے، جن میں سے بعض کا تعلق
آپؐ کے اپنے اہل بیت سے تھا، جبکہ ان کے علاوہ بھی کبار صحابہ میں سے متعدد حضرات
اس موقع پر وہاں موجود تھے، تب آپؐ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: هَلْ مُوا
أَكْتُبُ لَكُمْ كِتَابًا لَنْ تَضْلُلُوا بَعْدَهُ يَعْنِي "لَا وَ، میں تمہیں کچھ لکھوادوں، تاکہ اس کے
بعد تم گمراہی میں نہ پر ٹسکو"۔

اس پر وہاں موجود افراد میں رسول ﷺ کی شدت مرض اور ناسازی طبع کو دیکھتے ہوئے
اختلاف رائے ہونے لگا، چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ یہ اصرار کرنے لگا کہ "جلدی کوئی
سامان کتابت حاضر کیا جائے کیونکہ رسول ﷺ کوئی اہم وصیت لکھوانا چاہتے
ہیں تاکہ ہم گمراہی سے محفوظ رہ سکیں"۔

جبکہ دیگر کچھ افراد یوں کہنے لگے کہ "اس وقت رسول ﷺ پر شدت درد غالب ہے، اور

ہمارے پاس چونکہ اللہ کی کتاب (قرآن کریم) موجود ہے، الہنا وہ ہمارے لئے کافی ہے، ہمیں اس وقت رسول ﷺ کو کسی مشکل یا مشقت میں ڈالنے کی بجائے آپؐ کی راحت اور آرام کی فکر کرنی چاہئے۔

یوں ان میں اختلافِ رائے ہونے لگا، کوئی کچھ کہتا..... اور کوئی کچھ..... جب شور و شغب زیادہ بڑھنے لگا..... تو آخر رسول ﷺ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ”تم سب یہاں سے اٹھ جاؤ“۔

اور یوں وہ اہم بات نہیں لکھی جا سکی جو رسول ﷺ بالکل آخری ایام میں اپنی امت کیلئے لکھوانا چاہتے تھے۔ (۱)

رسول ﷺ شدتِ مرض اور ناسازی طبع کے باوجود اب تک نماز کیلئے بدستور مسجد تشریف لاتے، اور تمام نمازیں خود ہی پڑھاتے..... اور اس روز بھی..... (یعنی اپنی وفات سے محض چار روز قبل، بتارنخ ۸/ ربیع الاول بروز جمعرات چار نمازیں، یعنی فجر، ظہر، عصر، اور مغرب کی نمازیں آپ ﷺ نے خود ہی پڑھائیں، البتہ یہ مغرب کی نماز آخری نماز تھی جو آپ ﷺ نے پڑھائی اس آخری نماز میں آپؐ نے اُس روز سورۃ ”المرسلات“ تلاوت فرمائی تھی (یعنی انتیسویں سپارے [تبارک] کی آخری سورت)۔

(۱) اس واقعے کے حوالے سے متعدد اہل علم نے یہ اظہار خیال کیا ہے کہ رسول ﷺ کا یہ حکم غالباً ”علی الوجوب“، نہیں ہوگا، بلکہ محض اختیاطی تدیر کے طور پر آپؐ کچھ لکھوانا چاہتے ہوں گے..... کیونکہ آپؐ کا یہ حکم اگر ”علی الوجوب“ ہوتا اور اس کی تجیل واجب اور ضروری ہوتی تو آپؐ دوبارہ کبھی یہی حکم دے سکتے تھے..... یا کم یہ کہ آپؐ زبانی ہی وہ وصیت فرمادیتے..... لیکن آپؐ نے ایسا نہیں فرمایا..... آپؐ کا انتقال اس واقعے کے چار دن بعد ہوا، اور اس دوران آپؐ نے متعدد وصیتیں بھی فرمائیں اور مختلف ہدایات بھی دیں، لیکن ان بارے میں کچھ ارشاد نہیں فرمایا (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ”السیرۃ النبویۃ الصحیحة“، تأییف دکتور اکرم ضیاء العمری، صفحہ: ۵۵۳)۔

لیکن اس کے بعد جب عشاء کی نماز کا وقت آیا تو آپ ﷺ نے مسجد جانے کی غرض سے وضوء کرنا چاہا، مگر..... کمزوری اور نقاہت کی شدت کی وجہ سے آپ پر بے ہوشی طاری ہو گئی..... تین بار ایسا ہی ہوا..... جب آپ ﷺ وضوء کیلئے بیٹھتے تو بے ہوشی طاری ہو جاتی..... آخر آپ نے حکم دیا کہ ”مُرُوا أَبَابَكَرَ، فَإِيْمَلٌ بِالنَّاسِ“، یعنی ”ابو بکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں“

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا چونکہ اپنے والد (حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ) کے مزاج سے بخوبی واقف تھیں، لہذا اس موقع پر انہوں نے اپنے والد کے بارے میں عرض کیا کہ ”يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّهُ رَجُلٌ رَّقِيقٌ، ضَعِيفُ الصَّوْتِ، كَثِيرُ الْبُكَاءِ إِذَا قَرَأَ الْقُرْآنَ“

یعنی ”اے اللہ کے رسول! وہ تو بہت ہی کمزور اور نرم دل انسان ہیں، ان کی آواز بھی کافی پست ہے..... مزید یہ کہ وہ جب بھی قرآن پڑھتے ہیں تو بہت زیادہ رو نے لگتے ہیں۔“ (۱)

تب آپ نے اپنا ہی حکم دہرا�ا..... اور حضرت عائشہ نے بھی اپنی وہی گزارش دہرائی، آخر تیسری بار آپ نے قدرے سختی کے ساتھ یہی حکم دہرا�ا..... اور تب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کی حیات طیبہ کے دوران ہی..... اور خود آپ کے حکم پر..... آپ کی جگہ مسجد بنبوی میں امامت کا آغاز کیا۔

(۱) یعنی میرے والد تو کمزور دل انسان ہیں، لہذا اے اللہ کے رسول..... وہ آپ کی جگہ کھڑے ہونے کی حراثت کس طرح کر سکیں گے؟ مزید یہ کہ ان کی آواز بھی پست ہے، لہذا جب مقامت یوں تک ان کی آواز ہی نہیں بیٹھ سکے گی تو لوگ ان کی اقتداء میں کس طرح نماز پڑھیں گے؟ اور پھر یہ کہ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے ان پر تو ہمیشہ بہت زیادہ گریہ طاری ہو جاتا ہے، لہذا وہ امامت کرتے ہوئے کس طرح قرآن پڑھ سکیں گے.....؟

☆..... ۹/ ربع الاول بروز جمعہ:

اس روز بھی حسب معمول آپ ﷺ پر نقاہت اور کمزوری کا غلبہ رہا، اس روز جب آپ کی عیادت کی غرض سے متعدد افراد حاضر خدمت تھے، تب آپ نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا: (لَا يَمُوتَنَّ أَحَدُكُمْ إِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللَّهِ تَعَالَى) (۱) یعنی ”تم میں سے کسی کو موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ وہ اپنے رب کے بارے میں حسنِ ظن رکھتا ہو،“ (۲)

☆..... ۱۰/ ربع الاول بروز ہفتہ:

اس روز آپ ﷺ کو بوقت ظہر قدرے افاقہ محسوس ہوا تو آپ ایک طرف اپنے محترم پچھا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور دوسری طرف اپنے بچا زادا اور داماد یعنی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے کندھوں کا سہارا لئے ہوئے مسجد تشریف لائے، اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ امامت کر رہے تھے، انہوں نے جب آپ کے قدموں کی آہٹ محسوس کی تو نماز میں ہی اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنے لگے، جس پر آپ نے اپنے دستِ مبارک سے انہیں پیچھے نہ ہٹنے کا اشارہ کیا..... پھر آپ حضرت ابو بکرؓ کی دائیں جانب بیٹھ کر نماز میں شامل ہو گئے، اور اب اس نماز کی کیفیت یہ ہوئی کہ حضرت ابو بکرؓ آپؓ کی اقتداء کرنے لگے، جبکہ تمام مقتدی حضرت ابو بکرؓ کی تکبیروں پر نماز ادا کرنے لگے۔

☆..... ۱۱/ ربع الاول بروز التوار:

اس روز یعنی اپنی رحلت سے مgesch ایک روز قبل آپ ﷺ نے حکم دیا کہ گھر میں جو بھی نقدی ہے، وہ مساکین میں تقسیم کر دی جائے، چنانچہ تلاش کے بعد گھر میں کل پونچی سات دینار (۱) مسلم [۲۸۷] کتاب الفتن۔ (۲) یعنی بندہ مؤمن کو بوقت موت اپنے رب سے اچھی امید رکھنی چاہئے۔

نکل، جو کہ اسی وقت مساکین میں تقسیم کر دیئے گئے..... اور اس شام جب اندر ہرا چھانے لگا تو گھر میں چراغ جلانے کیلئے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک پڑون سے تیل ادھار مانگنا پڑا۔

نیز اس وقت آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی..... کیونکہ کچھ عرصہ قبل آپ نے اس کے پاس اپنی وہ زرہ رہن رکھوا کر اس سے گھر میں پکانے کیلئے کچھ جو کے دانے حاصل کئے تھے۔

☆/ ربیع الاول بروز پیر (آخری دن):

اُس روز علی الصباح جب نمازِ فجر کا وقت ہوا، نمازی مسجد نبوی میں جمع ہوئے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز کی ادائیگی میں مشغول ہو گئے..... رسول اللہ ﷺ کا حجرہ مبارک تو مسجد سے متصل ہی تھا، درمیان میں محض ایک پردہ پڑا ہوا تھا، آپ نے پردہ اٹھا کر دیکھا، اپنے صحابہ کو یوں انتہائی خشوع و خصوع کے ساتھ نماز میں مشغول و منہمک پایا..... کچھ دریا سی طرح آپ اُسی منظر میں کھوئے رہے..... اپنے صحابہ کو یوں نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے رہے، اور پھر اس منظر کی وجہ سے آپ فرط مسرت سے مسکرا دیئے..... رُخ انور پر بنشت پھیل گئی..... اور ہنڑوں پر مسکرا ہٹ کھلیل گئی.....

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جو کہ نماز پڑھا رہے تھے، انہیں کچھ اندازہ ہوا کہ شاید آپ ﷺ نماز کیلئے تشریف لانا چاہتے ہیں، یہ سوچ کر وہ نماز میں ہی اپنی جگہ سے کچھ پیچھے کی جانب سر کنے لگے، جس پر آپ نے اشارے سے انہیں منع فرمایا۔

آپ ﷺ کے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جو اس وقت نماز میں مشغول تھے، اُس موقع پر آپ ﷺ کیلئے شوق دیدار اور بیتابی کی وجہ سے ان کا پر حال ہوا کہ..... گویا وہ

سب ابھی نماز میں ہی آپؐ کی طرف متوجہ ہو جائیں گے.....آپؐ کے خادم خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت میری نظر جب اچانک آپؐ کے چہرہ مبارک پر پڑی تو مجھے آپؐ کا چہرہ بالکل ”قرآن کے ورق“ کی طرح محسوس ہوا.....(۱) اور پھر تھوڑی دیر بعد آپؐ نے پردہ گرا دیا.....اور یہ نماز بھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مکمل فرمائی۔

اس کے بعد ”عجی رحمت ﷺ“ پر کسی اور نماز کا وقت ہی نہیں آیا..... اور پھر جب صبح کی روشنی پھیلنے لگی، سورج قدرے بلند ہو گیا، تو آپؐ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو بلا یا اور ان کے کان میں کچھ سرگوشی فرمائی.....جس پروہ رو نے لگیں.....اور پھر جلد ہی ان کے کان میں دوبارہ کچھ سرگوشی فرمائی.....تب وہ مسکرائے لگیں.....(۲)

نیز اسی موقع پر آپؐ ﷺ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو ”سیدۃ النساء العالمین“، ہونے کی بشارة بھی دی۔

اس کے بعد آپؐ ﷺ نے اپنے کمسن نواسوں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بلا یا، دونوں کو پیار سے چوما، اور وہاں موجود بھی افراد کو ان کے ساتھ ہمیشہ احترام سے پیش آنے کی

(۱) یعنی ”قرآن کے ورق“ میں بیک وقت حسن و مجال، تقدس اور پاکیزگی.....یہ تم خوبیاں سمجھا ہوا کرتی ہیں.....بھی کیفیت انہیں اس موقع پر رسول ﷺ کے زرخ انور میں محسوس ہوئی۔

(۲) بعد میں کسی موقع پر جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تھا تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ میرے والد نے پہلے مجھے اس راز سے مطلع کیا کہ ”اب اسی تکلیف کے دوران ہی میری رو قبض کر لی جائیگی“، جس پر میں رو دی.....اور پھر کچھ دیر بعد مجھے مطلع کیا کہ ”اہل بیت میں سے سب سے پہلے میں اپنے والد سے جاملوں گی.....“، جس پر میں مسکرا دی۔

وصیت فرمائی۔

اور اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو بلوایا اور انہیں چند صحیحیں فرمائیں، اسی دوران آپؐ کی طبیعت زیادہ ناساز ہونے لگی..... اور تب اسی کیفیت اور شدید رقاہت و مکروہی کی حالت میں اپنی امت کو یہ آخری وصیت فرمائی ”الصلوٰۃ ، الصلاۃ وَمَا مَأْكُثُ أَيْمَانُکُمْ“، یعنی ”نماز کی پابندی کرتے رہنا..... اور وہ لوگ جو تمہارے ماتحت ہیں، ان کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آنا“ (۱) یہ الفاظ آپ ﷺ نے متعدد بار دہرائے۔

اسی دوران نوجوان اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما اندر داخل ہوئے، جنہیں دیکھ کر آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ فضاء میں بلند کئے یہ منظر دیکھ کر وہاں موجود افراد سمجھ گئے کہ آپؐ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کیلئے کامیابی کی دعا فرمائے ہیں۔ (۲)

انہی آخری لمحات میں حضرت ابو بکر صداق رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما کے بھائی عبد الرحمن وہاں آئے، ان کے ہاتھ میں تازہ مسوک تھی، آپؐ مسوک کی جانب بغور دیکھنے لگے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما چونکہ مزاج شناس

(۱) ”ماتحت“ میں انسان کیلئے اس کے اہل و عیال خادم، اور اس کے ماتحت افراد وغیرہ سبھی شامل ہیں، یعنی سبھی کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی۔

(۲) رسول ﷺ نے آخری ایام میں سلطنتِ روم کے خلاف کارروائی کی غرض سے ایک لشکر کی روائی کا حکم صادر فرمایا تھا، اس لشکر کا سپہ سالار آپؐ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو مقرر فرمایا تھا جو کہ اس وقت بالکل نوجوان تھے، آپؐ کی ناسازی طبع کی وجہ سے لشکر مدینہ سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رک گیا تھا، حضرت اسامہؓ والپیں مدینہ پہنچنے تک خود آپؐ کی طبیعت کے بارے میں صورت حال سے آگاہی ہو سکے..... اس موقع پر یہ صورت حال پیش آئی تھی جو اور پر بیان کی گئی، یعنی مکروہی اور شدتِ مرض کی وجہ سے چونکہ آپؐ کیلئے گفتگو کرنے ادا شوار تھا..... لہذا اس موقع پر آپؐ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اشارے سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو دعاء خير دی۔

تھیں، الہذا سمجھ گئیں آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ انہوں نے آپ سے اس بارے میں استفسار کیا، جس پر آپ ﷺ نے اثبات میں سر ہلا�ا..... تو انہوں نے اپنے بھائی سے وہ مسواک لے کر آپ کی خدمت میں پیش کی، لیکن نقاہت کی وجہ سے وہ آپ سے چبائی نہیں جا رہی تھی، اس پر حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ ”اگر ارشاد ہو تو میں نرم کر دوں؟“ آپ نے سر کے اشارے سے ”ہاں“ فرمایا، تو آپ سے مسواک لے کر حضرت عائشہؓ نے اسے دانتوں سے چبا کر خوب نرم کر کے دوبارہ آپ کی خدمت میں پیش کی اور تب آپ نے ان سے وہ مسواک لے لی اور خوب اچھی طرح اپنے دانتوں پر پھیری اُس وقت پانی کا ایک پیالہ قریب ہی رکھا ہوا تھا، آپ بار بار اس میں اپنا ہاتھ ڈبوتے اور چہرہ مبارک پر پھیر لیتے۔

اسی دوران آپ ﷺ نے یہ الفاظ کہے ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ إِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتَ“ یعنی اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں..... پیش موت کی سختی ہوا ہی کرتی ہے۔“ اور اس کے ساتھ ہی آپ پر نزع کی کیفیت طاری ہو گئی آپ نے اپنا دست مبارک بلند فرماتے ہوئے انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ فرمایا..... نگاہیں اور پرکی جانب جنم گئیں..... ہونٹوں میں خفیہ سی جنبش ہونے لگی ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کان لگا کر سنا تو اُس وقت آپ کی زبان مبارک پر یہ آخری کلمات تھے ”مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّدِيقِينَ وَالشَّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمْنِي“ یعنی ”ان لوگوں کے ساتھ جن پر اللہ نے اپنا انعام فرمایا، انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین اے اللہ! مجھے بخش دے اور مجھ پر حم فرماء“ اور پھر آخر میں تین بار فرمایا ”وَالْحَقْنِي بِالرَّفِيقِ الْأَعْلَى، اللَّهُمَّ الرَّفِيقُ الْأَعْلَى“

لیعنی ”اور مجھے اوپر والے ساتھی کے ساتھ ملا دے اے اللہ! اے اوپر والے ساتھی“۔ اور ان آخری الفاظ کے ساتھ ہی آپ ﷺ کا اٹھا ہوا باتھ گر گیا اور جسمِ اطہر سے روح مبارک پرواز کر گئی

اور یوں وہ بولتا ہوا قرآن، نورِ بدایت کا پیکر، مکمل نمودنہ حیات، خیر البشر، رحمۃ للعالیین، دشمنوں کا خیرخواہ، مظلوموں کا غنیوار، اور انسانیت کا محسنِ اعظم، یعنی رسول اکرم ﷺ، تمیس سال کے عرصے میں اللہ کے بندوں تک اللہ کا دین مکمل پہنچادیتے کے بعد، ہجری کینڈر کے مطابق تریسیٹھ برس کی عمر میں، ۱۲/ ربیع الاول سن ۱۱ ہجری، بروز پیر، وقتِ چاشت اپنے رب سے جاملے۔ (۱)

اناللہ وانا الیه راجعون کل من علیہا فان وینقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام اللہم صل وسلم وبارک علی عبدک ورسولک محمد، علی آلہ واصحابہ اجمعین، برحمتك یا رحم الرحمین۔



(۱) بخطِ کشیدہ عبارت فقیر سید وحید الدین کی کتاب ”محسن اعظم“ سے مأخذ ہے، جو کہ میں نے بچپن میں ۱۹۶۵ء میں پڑھی تھی اور یہ الفاظ اس وقت سے ہی میرے ذہن میں نقش ہیں۔

سوگوار فضاء:

اشرف الانبیاء والمرسلین، سید الانویین والآخرین، رسول اکرم ﷺ کی رحلت اور اس جہان فانی سے خصتی کا یہ سانحہ یقیناً آپؐ کے افرادِ خانہ اور اہل بیت کیلئے نیز تمام مسلمانوں کیلئے بہت ہی بڑا صدمہ تھا، جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَا رَأَيْتُ يَوْمًا قَطُّ كَانَ أَحْسَنَ وَلَا أَضْوَأَ مِنْ يَوْمٍ دَخَلَ عَلَيْنَا فِيهِ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا رَأَيْتُ يَوْمًا أَفْبَحَ وَلَا أَظْلَمَ مِنْ يَوْمٍ مَاتَ فِيهِ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (۱) یعنی ”میں نے مدینہ شہر میں کبھی کوئی ایسا خونگوار اور روشن دن نہیں دیکھا کہ جیسا رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے موقع پر تھا..... اسی طرح میں نے مدینہ شہر میں کبھی کوئی ایسا سوگوار اور بجا بجا سادن نہیں دیکھا کہ جیسا رسول اللہ ﷺ کی وفات کے موقع پر تھا۔“ چنانچہ اس روز تمام مدینہ شہر میں ہر جانب رنج والم کی فضاء چھائی ہوئی تھی..... ہر کوئی غم کے سمندر میں ڈوبا جا رہا تھا..... یہ افسوسناک خبر سنتے ہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بڑی تعداد میں مسجد میں اور قرب و جوار کے علاقے میں جمع ہونے لگے..... ہر طرف آہ و بکاء کا ماحول تھا۔

حتیٰ کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جیسا انتہائی جرأۃ مند بہادر، باہمت اور مدد بر انسان (جسے دنیا ”فاروق عظیم“ کے لقب سے یاد کرتی ہے) شدت غم کی وجہ سے ہوش و حواس کھو بیٹھا، انہیں کسی صورت یقین، ہی نہیں آرہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اب ہمیشہ کیلئے ہم سے جدا ہو چکے ہیں..... چنانچہ وہ وہاں موجود مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے باؤز بلند

(۱) مشکاة المصابح [۵۹۲] کتاب الفضائل والشمائل، باب هجرة أصحابہ من مکہ ووفاتهم.....

یوں کہنے لگے ”کوئی ہرگز یوں نہ کہے کہ رسول ﷺ وفات پاچکے ہیں..... کیونکہ رسول ﷺ کے پاس گئے ہیں..... جس طرح موسیٰ علیہ السلام چالیس روز کیلئے کوہ طور پر اللہ کے پاس گئے تھے..... تورات لینے کیلئے..... اور پھر واپس آگئے تھے..... اسی طرح رسول ﷺ کو بھی اللہ نے اپنے پاس بلا�ا ہے..... اور یہ کہ آپ بھی چالیس روز کے بعد واپس تشریف لائیں گے..... اور آج جو لوگ یوں کہہ رہے ہیں کہ رسول ﷺ کا انتقال ہو چکا ہے..... وہ یاد رکھیں کہ آپ جب اپنے اللہ کے پاس سے واپس تشریف لاائیں گے،
تب خود اپنے ہاتھ سے ان لوگوں کی گردان اڑا دیں گے“۔ (۱)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گھر مسجد بنوی سے کچھ دور تھا (۲) اُس روز نمازِ فجر کے وقت چونکہ رسول ﷺ کی طبیعت میں قدرے بہتری اور افاقت کے آثار نمایاں تھے..... لہذا حضرت ابو بکرؓ فجر کی نماز پڑھانے کے بعد اپنے گھر چلے گئے تھے، لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد جب انہیں رسول ﷺ کا انتقال کی جان لیوا خبر موصول ہوئی تو وہ واپس تشریف لائے، مسجد کے اندر بھی اور آس پاس بھی انتہائی سوگوار ماحول میں مسلمانوں کا ایک جمیع غیر نظر آیا..... نیز انہوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ اس مجمع کے درمیان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے باوازِ بلند کیسی عجیب و غریب باتیں کر رہے ہیں..... کچھ دیر وہ ان کے قریب کھڑے رہے، ان کی باتیں سنتے رہے، اور سمجھ گئے کہ شدتِ غم کی وجہ سے یہ ہوش و حواس گنوں میٹھے ہیں..... لہذا انہوں نے حضرت عمرؓ سے کوئی بات نہیں کی، نہ ہی کسی اور سے کوئی بات کی، بلکہ اس مجمع میں کچھ دیر تو قوف کے بعد فوری طور پر رسول اللہ

(۱) السیرۃ النبویہ لا بن ہشام / رقم انص: ۲۰۹۵ / صفحہ: ۳۶۳ / جلد: ۲۔

(۲) ”سُخ“ کے مقام پر، جسے آجکل ”عوائی“ کہا جاتا ہے۔

علیہ السلام کے گھر پہنچے جو کہ ان کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا گھر تھا، گھر میں داخل ہونے کے بعد اپنی بیٹی سے مختصر گفتگو کی، جو دل گداز اور جان لیوا خبر سنی تھی..... اس کی تصدیق چاہی..... اور پھر یقین ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے جسدِ اطہر کی طرف متوجہ ہوئے رُبُّ الْأَنْوَار سے کپڑا اٹھایا..... جبین اقدس پر بوسہ دیا..... کچھ آنسو بھائے اور پھر کچھ دیرا اسی طرح کھڑے دیکھتے رہے اس کے بعد ہونوں میں لرزش ہوئی اور لرزتی ہوئی آواز میں یہ الفاظ کہئے ”بِأَبِي أَنَّتَ وَأَمِّي يَا رَسُولَ اللَّهِ“ یعنی ”اے اللہ کے رسول آپ پر میرے ماں باپ قربان“ اور پھر وہاں سے چل دیئے

اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے، اور مسجد میں پہنچے، لوگوں کا وہی جمیع غیر اسی طرح موجود تھا، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی طرح جمیع کے درمیان کھڑے ہوئے بے خودی کی کیفیت میں اپنی وہی باتیں مسلسل دھرا رہے تھے

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب یہ صورت حال دیکھی، اور حضرت عمرؓ کی یہ باتیں سینیں تو سمجھ گئے کہ یہ تو ہوش کھو بیٹھے ہیں اس پر انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ ”اے عمر آپ بیٹھ جائیے“ لیکن حضرت عمرؓ شدتِ غم کی وجہ سے اس قدر مغلوب الحال ہو چکے تھے کہ بیٹھنے سے انکار کر دیا

اسی دوران اب یہ صورتِ حال ہوئی کہ لوگوں نے جب حضرت ابو بکرؓ دیکھا تو سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور ان کے گرد جمع ہونے لگے تب انہیں مخاطب کرتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ نے مختصر خطبہ دیا، جس میں رسول اللہ ﷺ کی اس جہان فانی سے خصتی کا یوں

اعلان فرمایا ”مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّداً فَإِنَّ مُحَمَّداً قَدْ مَاتَ، وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ“، یعنی ”تم میں سے جو کوئی محمدؐ کی عبادت کرتا تھا، وہ جان لے کر محمدؐ کا ب انتقال ہو چکا ہے..... اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا، تو اللہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے، اسے کبھی موت آنے والی نہیں ہے.....“ (۱) اور پھر قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی: ﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهُ شَيْئاً وَ سَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ﴾ (۲)

ترجمہ: ”محمدؐ ﷺ تو صرف رسول ہی ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے، یا وہ شہید ہو جائیں، تو تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو ہرگز وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا، عنقریب اللہ شکر گذاروں کو نیک بد لدے گا“

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس آیت سے نیز اس کے مضمون سے خوب واقف تھے، اور عرصہ دراز سے اسے پڑھتے اور سنتے چلے آرہے تھے..... لیکن اس روز حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی جب یہ آیت سنی تو انہیں یوں محسوس ہوا کہ گویا یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہو..... ان کے ذہنوں میں اس آیت کا مضمون تازہ ہو گیا..... وہ سب اس آیت کو بار بار دہرانے لگے..... جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس وقت وہاں جس شخص کی طرف بھی میری نگاہ اٹھی مجھے اس کے لب ہلتے ہوئے نظر آئے..... اور وہ بھی آیت زیر لب دہراتا ہوا نظر آیا..... اور تب رفتہ رفتہ انہیں

(۱) صحیح بخاری [۳۶۶۸] کتاب [۲۲] فضائل الصحابة، باب [۵] لوکنت مخدداً اخلياً..... (۲) آل عمران [۱۳۳]

اس تلخ ترین حقیقت پر یقین آنے لگا کہ رسول اللہ ﷺ واقعی اب ہم میں نہیں رہے.....
 حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ آیت دیگر صحابہ کرام کی طرح حضرت عمر رضی
 اللہ عنہ نے بھی سنی..... تو نہیں بھی اب یقین آنے لگا کہ واقعی رسول اللہ ﷺ اب ہم میں
 نہیں رہے..... اور تب صدمے نے دوسری شکل اختیار کر لی..... جب تک یقین نہیں آیا تھا
 اُس وقت تک بے خودی کی کیفیت طاری تھی..... لیکن جب یقین آگیا تو صدمے کی شدت
 کی وجہ سے ایسا لرزہ طاری ہوا کہ ٹانگوں میں جسم کا بوجھا اٹھانے کی سکت باقی نہیں رہی.....
 جیسا کہ بعد میں انہوں نے خود اپنی یہ کیفیت بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ”ابو بکر کی زبانی یہ
 آیت سننے کے بعد مجھے یقین آگیا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پاچے ہیں..... مگر ساتھ ہی
 صدمے کی وجہ سے میرا یہ حال ہو گیا کہ میری ٹانگیں میرا بوجھا اٹھانے سے قاصر ہو گئیں.....
 اور میں بے اختیار اسی جگہ گر گیا.....“ (۱)

تجھیز و تکفین:

اشرف الانبیاء والمرسلین، سید الالٰ ولين والآخرین، رسول اکرم ﷺ کی رحلت اور اس جہان
 فانی سے خصتی کے بعد تجھیز و تکفین کا عمل فوری طور پر شروع نہیں کیا جاسکا..... یہ سانحہ پیر کی
 صحیح پیش آیا تھا، جبکہ تجھیز و تکفین کا عمل دوسرے روز یعنی منگل کے دن شروع کیا گیا..... اس
 تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ یہ سانحہ آپ ﷺ کے افرادِ خانہ والیں بیت، نیز دیگر تمام مسلمانوں کیلئے
 اتنے بڑے صدمے کا باعث تھا کہ ہوش و حواس بحال نہیں تھے، کسی میں کوئی سکت ہی باقی
 نہیں رہی تھی..... مدینے کی گلیوں میں ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا..... ہر کوئی انتہائی افسردہ
 و غمزدہ تھا..... صدمے اور غم و اندوه کی اس کیفیت سے نکلنے میں کچھ وقت لگا.....

(۱) السیرۃ النبویہ لابن ہشام / رقم ا حص: ۲۰۹۵ / صفحہ: ۳۶۳ / جلد: ۲۔

نیز اس موقع پر ایک اور انتہائی نازک معاملہ یہ درپیش تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ارجاع
کے بعداب آپؐ کا جانشیں کون ہوگا.....؟ کبار صحابہ کا اصرار یہ تھا کہ یہ نازک ترین معاملہ
رسول ﷺ کی تجدیہ و تکفین سے قبل طے پا جانا ضروری ہے.....تاکہ منافقین یاد گیر موقع
پرست اور سازشی عناصر کو اس نازک صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہل سکے.....
چنانچہ تجدیہ و تکفین سے متعلق انتظامات کے سلسلے میں ہی جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ
عنہ، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ و دیگر چند کبار صحابہ رسول ﷺ کے گھر میں ہی موجود تھے
کہ اسی دوران انہیں یہ اطلاع ملی کہ ”سقیف بن ساعدة“ نامی مقام پر بڑی تعداد میں لوگ جمع
ہیں اور ان کا موضوع گفتگو یہی ہے کہ اب رسول ﷺ کا جانشیں کون ہوگا.....؟
یہ اطلاع ملنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اصرار کرتے
ہوئے کہا کہ ”قبل اس کے کہ معاملہ نازک ہو جائے..... ہمیں وہاں چلانا چاہئے.....“
چنانچہ یہ حضرات وہاں پہنچے، وہاں یہی موضوع زیر بحث تھا، اور کسی بھی لمحے یہ معاملہ کوئی
غلط رُخ اختیار کر سکتا تھا، صورتِ حال کی اس نزاکت کو بھانپتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیق
رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نازک موقع پر ”فتنه و افتراء“ سے بچنے
اور اتفاق و اتحاد کو بہر صورت قائم رکھنے کی اہمیت و ضرورت کے بارے میں مختصر گفتگو کی،
اس کے بعد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، نیز حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ
عنہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ”یقیناً یہی دو حضرات رسول ﷺ کی جانشینی
کے قابل ہیں، لہذا میراث مشورہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر جلد از جلد بیعت
کر لی جائے۔“

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”ہم میں سے کس کا دل اس بات کو گوارا کرے گا کہ وہ شخص جسے خود رسول اللہ ﷺ نے ہماری امامت کیلئے منتخب فرمایا تھا، اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کو اس منصب کیلئے پسند کیا جائے.....؟“

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ بات سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اصرار کیا ”ابو بکر، اپنا ہاتھ بڑھائیے“ جس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا، اور تب فوراً ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں موجود لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بآواز بلند یہ الفاظ کہے ”لوگو! میں ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کر رہا ہوں..... تم سب بھی انہی کے ہاتھ پر بیعت کرو..... یہی رسول ﷺ کے جانشین ہیں.....“

اس پر وہاں موجود سبھی افراد نے بڑی تعداد میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، کبھار صحابہ کرام میں سے چند افراد اس وقت وہاں موجود نہیں تھے، جنہوں نے بعد میں مسجد نبوی میں بیعت کی.....

یوں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بالاتفاق رسول ﷺ کے جانشین اور ”خلیفہ اول“ کی حیثیت سے منتخب کر لیا گیا۔

البتہ یہ اہم ترین معاملہ نیز دیگر کچھ نازک معاملات کو طے کرنے میں اس دن کا کافی حصہ گزرنگیا..... اور شام کا اندر ہیرا پھیلنے لگا..... الہزار رسول ﷺ کے جسد اطہر کی تجمیع و تکفین کے معاملے کو دوسرا روز یعنی منگل تک ملتوی کر دیا گیا۔

اس کے بعد دوسرے دن بروز منگل تجمیع و تکفین کا سلسلہ شروع ہوا، آپ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا، اس موقع پر فضل بن عباس اور اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہم پر دہ آگے کئے

کھڑے رہے، جبکہ حضرت عباس بن عبدالمطلب، حضرت علی بن ابی طالب، اور انصار مدینہ میں سے اوس بن خولی (رضی اللہ عنہم اجمعین) نے جسدِ اطہر کو غسل دیا..... جس کے بعد آپ ﷺ تو تین سفید سوتی کپڑے کی چادروں میں کفن دیا گیا۔
 ”تجہیز و تغییف“ کے اس مرحلے سے فراغت کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوا کہ ”تُدْفِنَ“ کس مقام پر کی جائے.....؟ اس موقع پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لَنْ يُقْبَرَ نَبِيٌّ إِلَّا حَيْثُ يَمُوتُ“، یعنی ”ہر نبی کو اسی جگہ فن کیا جاتا ہے جہاں اس کی وفات ہوئی ہو۔“ (۱)
 حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ ارشادِ نبوی سننے کے بعد طے پایا کہ آپ ﷺ کے بستِ وفات کے مقام پر ہی قبر تیار کی جائے (جو کہ دراصل امام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ججرہ تھا) (۲)

تجہیز و تغییف اور پھر مقامِ تُدْفِنَ کی تعین کے بعد جب جنازہ اسی جگہ (یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے جگرے میں) رکھا ہوا تھا..... تب نمازِ جنازہ کا آغاز ہوا، پہلے آپ ﷺ کے افرادِ خانہ اور اہلِ خاندان نے، اور پھر دیگر مہاجرین و انصار، مردوں اور عورتوں نے نمازِ جنازہ ادا کی۔

آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ کے موقع پر کوئی امام نہیں تھا، جگرے کی تنگِ دامانی کی وجہ سے دس

(۱) مسند امام احمد [۱/ ۳۵]

(۲) قبر مبارک کی کھدائی کا کام حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے انجام دیا، جو کہ مسجدِ نبوی سے متصل (اب مسجدِ نبوی کے اندر بابِ فہد سے متصل) ”بیرون“ نامی اپنے کنوئیں اور باغ کی جگہ سے اور پھر اس بارے میں نازل ہونے والی آیت ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبَرَ حَتَّىٰ تُنْتَفِقُوا مَمَّا تُحِبُّونَ﴾ (آل عمران: ۹۲) کے حوالے سے معروف ہیں..... جبکہ خود ان کی اپنی قبر میں ترکی کے قریب بحرِ احمر میں کسی گنمام جزیرے میں واقع ہے۔

دس اشخاص اندر جاتے اور نماز پڑھ کر منگل آتے یہ سلسلہ لگاتار جاری رہا اس لئے تدفین منگل اور بدھ کی درمیانی شب، یعنی وفات کے تقریباً بیتیس گھنٹے بعد عمل میں آئی۔

آپ ﷺ کے جسم الطہر کو حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عباس بن عبدالمطلب، اور ان کے بیٹوں یعنی فضل بن عباس اور قشم بن عباس، نیز آپ ﷺ کے ایک آزاد کردہ غلام "مُقْتَرَان" (رضی اللہ عنہم اجمعین) نے مل کر قبر شریف میں اتارا۔ (۱)

اللَّهُمَ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَى عَبْدِكَ وَرَسُولِكَ مُحَمَّدٌ، وَعَلَى أَلَّهِ وَاصْحَابِهِ اَجْمَعِينَ
بِرَحْمَكَ يَا رَحْمَ الرَّاحِمِينَ۔



(۱) السیرۃ النبویۃ لابن ہشام، ۳۸/۲۔

الحمد للہ آج بتاریخ / ربيع الاول ۱۴۳۵ھ، مطابق ۸ جنوری ۲۰۱۴ء بروز بدھ یہ باب مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَتُبَّ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

اصل مقصود؛ اتباع رسول ﷺ:

الحمد لله الذي شتم صفات میں رسول ﷺ کی سیرت مبارکہ اور حیات طیبہ کے بارے میں مختصر تذکرے کی ہمیں سعادت نصیب ہوئی اور یوں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے خاص فضل و کرم اور توفیق کی بدولت ہم اس قبل ہو سکے کہ اللہ کے جبیب ﷺ کے مبارک تذکرے کے ذریعے اپنے دلوں کو منور کر سکیں۔

ابتداء اس موقع پر یہ اہم ترین تنبیہ ضروری ہے کہ جب بھی رسول ﷺ کی سیرت مبارکہ کا کہیں تذکرہ سناجائے..... یا اس بارے میں کسی کتاب کامطالعہ کیا جائے..... تو یہ بات ضرور ذہن نشیں رکھی جائے کہ اس سے اصل مقصود آپ ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات کا ”اتباع“ ہے..... کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے دنیاۓ انسانیت کیلئے آپ ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد یہی تھا۔

☆..... نیز اس موقع پر یہ بات سمجھنا بھی ضروری ہے کہ رسول ﷺ ہمارے محسن ہیں، تمام دنیاۓ انسانیت پر آپؐ کے بیشمار احسانات ہیں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو دنیا و ما فیہا کیلئے ”رحمت“ بناؤ کر بھیجا گیا، حتیٰ کہ آپؐ کا وجود مسعودتو آپؐ کے بدترین مخالفین اور دشمنوں کیلئے بھی باعثِ رحمت تھا..... مشرکین مکہ ہمیشہ آپؐ کا مذاق اڑایا کرتے..... طذر کیا کرتے..... اور تمسخر و استہزاء کے طور پر یوں کہا کرتے کہ ”آپ جس عذاب کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں..... اور ہمیں اللہ کے جس عذاب سے آپ ہمیشہ ڈراستے ہیں..... کہاں ہے وہ عذاب.....؟ لایئے وہ عذاب..... اللہ سے کہئے کہ ہم پر آسمان سے

پھر برسائے..... یا، میں کسی بڑے عذاب میں بٹا کر کے دکھائے۔

مشرکین مکہ کی اسی بیہودہ گوئی کا قرآن کریم میں یوں تذکرہ کیا گیا ہے: ﴿وَإِذْ قَالُوا
اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوْ
إِتْنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (۱) ترجمہ: (اور جب ان لوگوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر یہ قرآن
تیری طرف سے واقعی ہے تو ہم پر آسمان سے پھر برسا، یا ہم پر کوئی دردناک عذاب واقع
کر دے)

اس پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ ارشاد ہوا:
﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ...﴾ (۲) ترجمہ: (اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں
کرے گا کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے انہیں عذاب دے.....)

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ رسول ﷺ کا وجود مسعود تمام بنی نوع انسان کیلئے، حتیٰ
کہ بدترین دشمنوں، مخالفوں، بدخواہوں اور تمسخر و استہزاء کرنے والوں کیلئے بھی باعث
رحمت تھا..... اسی حقیقت کا قرآن کریم میں ان الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے: ﴿وَمَا
أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ﴾ (۳) یعنی ”[اے بنی] ہم نے آپ کو تمام
دنیا والوں کیلئے رحمت بنا کرہی بھیجا ہے“

اور پھر بالخصوص اپنی امت کیلئے آپ ﷺ کے قلب مبارک میں خیر خواہی و ہمدردی کے جو
جدبات تھے..... اپنی امت کی صلاح و فلاح کی خاطر آپ جس طرح ہمیشہ فکر منداور
کوشش رہا کرتے تھے..... اور امت کی رہبری و رہنمائی کی خاطر آپ جس طرح ہمیشہ
مشغول و منہمک رہا کرتے تھے..... اسی حقیقت کی طرف اشارے کے طور پر قرآن کریم

میں یوں ارشادِ بانی ہوا: ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (۱) ترجمہ: (تمہارے پاس ایک ایسے رسول تشریف لائے ہیں جو تمہاری ہی جنس میں سے ہیں، جنہیں تمہاری مضرت کی بات نہایت گران گذرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں، ایمان والوں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں)

یقیناً اس سے یہی حقیقت خوب واضح و ثابت ہو جاتی ہے کہ تمام دنیاۓ انسانیت پر عموماً..... جبکہ اپنی امت پر خصوصاً..... آپ کے بہت زیادہ احسانات ہیں۔

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے: (إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ النَّاسِ كَمَثَلِ رَجُلٍ إِسْتَوْقَدَ نَارًا، فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهَا جَعَلَ الْفَرَاشُ يَقْعُنَ فِيهَا، فَأَنَا آخُذُ بِحُجَّزِكُمْ عَنِ النَّارِ، وَأَنْتُمْ تُقْحَمُونَ فِيهَا) (۲) ترجمہ: ”میری اور تم لوگوں کی مثال اُس شخص کی مانند ہے کہ جس نے کوئی آگ جلانی، اور جب وہ آگ خوب روشن ہو گئی تو پروانے آ کراس میں گرنے لگے..... میں ہوں کہ مسلسل تمہارے لباس کی گرہوں سے پکڑ پکڑ کر تمہیں اس آگ میں گرنے سے بچانے کی کوشش کرتا ہوں، جبکہ تم لوگ ہو کہ اس آگ میں گرتے پڑتے ہو۔“

یعنی جس طرح پروانے آگ پر ٹوٹے پڑ رہے ہوں، اور کوئی شخص انہیں موت سے اور جل مرنے سے بچانے کی غرض سے مسلسل انہیں وہاں سے دور رکھنے کیلئے محنت و مشقت اور جدو جہد کئے جا رہا ہو..... لیکن اس کے باوجود پروانے اس آگ میں جل مرنے کیلئے ہر طرف سے ٹوٹے پڑ رہے ہوں..... یہی حال رسول ﷺ کا اپنی امت کے ساتھ ہے،

(۱) التوبہ [۱۲۹] (۲) بخاری [۲۸۳] [كتاب الرقاق] [باب] [۲۶] [الانباء عن العاصي]

گویا ”امتنی“ برائے اور نافرمانیوں کے مسلسل ازناکاب کے ذریعے جہنم کی آگ میں جل
مرنے پر ٹلے ہوئے ہیں..... جبکہ رسول ﷺ انہیں اس بربادی سے اور جل مرنے سے
بچانے کی خاطر شب و روز مخت و کوشش میں مشغول و منہک ہیں۔ (۱)

اسی طرح رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: (لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ، فَتَعَجَّلَ
كُلُّ نَبِيٍّ دَعْوَتَهُ، وَإِنِّي إِخْتَبَأْتُ دَعْوَتِي شَفَاعَةً لِأَمْنِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ)
(۲) ترجمہ: ”ہر نبی کو کسی ایک خاص دعا کا موقع دیا جاتا ہے جو قبول کی جاتی ہے، اور ہر نبی
نے دنیا میں ہی اللہ سے وہ دعاء مانگ لی ہے، جبکہ میں نے اپنی وہ خاص دعا قیامت کے
روز اپنی امت کی شفاعت کیلئے چھپا کر رکھ لی ہے“

یعنی ہر نبی کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ایک موقع ایسا دیا جاتا ہے کہ وہ اللہ سے جو چاہیں
دعاء مانگ لیں، ان کی وہ دعا ضرور قبول کی جائیگی..... آپؐ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے
انبیاء کرام علیہم السلام میں سے ہر نبی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیا میں ہی
اللہ سے اپنے لئے وہ دعاء مانگ لی ہے..... لیکن میں نے اب تک وہ دعاء نہیں مانگی ہے.....
کیونکہ میں نے تو اسے روز قیامت اپنی امت کی شفاعت کیلئے چھپا کر رکھا ہوا ہے.....

(۱) انسان کے لباس میں کچھ حصے ایسے ہو اکرتے ہیں جو نیبہ زیادہ موٹے اور مضبوط ہو اکرتے ہیں، مثلاً کسی جوڑ
پر کہ جہاں کپڑا آکر اٹھا ہوتا ہے اور بعض اوقات کسی موٹی گردہ کی شکل محسوس ہوتی ہے..... یا جو لوگ تہندی یا لگی
باندھتے ہیں تو جس جگہ لگکی کی گردہ ہو اکرتی ہے (مقدُّ الإِزارِ أَو السَّرَّاوِيلِ) مضبوطی کے ساتھ کپڑے کیلئے
وہ جگہ مناسب ہو اکرتی ہے..... لہذا آپ ﷺ نے یہی تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ”میں تمہارے لباس کی ان
گرہوں سے کپڑ کر تمہیں آگ میں جل مرنے سے بچانے کیلئے مسلسل جدوجہد میں مشغول رہتا ہوں..... مگر تم
لوگ ہو کہ بس جلنے پر ہی مُصر ہو.....“

(۲) بخاری [۲۳۰۲] کتاب الدعوات [۸۰] باب [۱] لکل نبی دعوة متجابتة - نیز: مسلم [۱۹۹] کتاب الایمان۔

سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک میں اپنی امت کیلئے اس قدر خیر خواہی و ہمدردی کے جذبات..... اتنی محبت..... اس قدر فکر..... اور اتنا درد..... کہ وہ دعا کہ جس کی تبولیت یقینی ہے..... جس کی قبولیت کا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے..... آپ نے وہ دعا خودا پنے لئے نہیں مانگی..... بلکہ اپنی امت کیلئے بچا کر اور چھپا کر رکھ لی ہے۔

لہذا آپ کے قلب مبارک میں جب امت کیلئے خیر خواہی و ہمدردی کے اس قدر شدید جذبات تھے..... تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ ”آمُتِی“ کی حیثیت سے ہمارے دلوں میں بھی آپ کیلئے عقیدت و محبت کے جذبات ہمیشہ موجود رہیں..... بلکہ آپ کی محبت توہ مومن کیلئے ”جزءِ ایمان“ ہے، جس کے بغیر ایمان کی تکمیل کا تصور نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے: (لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ الَّدْهَ وَالَّدِهِ وَالنَّاسِ أَجَمَعِينَ) (۱) یعنی ”تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا، تاوق تکیہ میں اسے اس کی اولاد اس کے والدین نیز تمام سے لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔“

☆..... محبت تقاضا کرتی ہے ”اتباع“، جیسا کہ خود اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے: (قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحِبِّكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ) (۲) ترجمہ: (کہہ دیجئے! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعdarی کرو، خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمادے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (۳) ترجمہ: (اس رسول ﷺ

کی جو کوئی اطاعت کرے اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَ الرَّسُولَ﴾ (۱)

ترجمہ: (کہہ دیجئے! کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کرو)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ (۲)

ترجمہ: (کہہ دیجئے! کہ اللہ تعالیٰ کا حکم مانو اور رسول کی اطاعت کرو)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَإِن تُطِعُوهُ تَهْتَدُوا﴾ (۳) ترجمہ: (ہدایت تو تمہیں اسی وقت

ملے گی جب تم رسول کی اطاعت کرو)

نیز ارشاد ہے: ﴿فَلَيَحْذَرَ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ

يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (۴) ترجمہ: (جو لوگ حکم رسول کی مخالفت کرتے ہیں انہیں

ڈرتے رہنا چاہئے کہ کہیں ان پر کوئی زبردست آفت نہ آپڑے یا انہیں دردناک عذاب نہ

پہنچ)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَمَا آتَكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا

وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (۵) ترجمہ: (اور جو کچھ میں رسول دئے

لے لو۔ اور جس سے تمہیں روکے رک جاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو۔ یقیناً اللہ

تعالیٰ سخت عذاب والا ہے)

نیز رسول ﷺ کا ارشاد ہے: (کُلُّ أُمَّيٍّ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى ، قِيلَ :

وَمَنْ يَأْبَى يَأْرَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ : مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ ، وَمَنْ عَصَانِي

(۱)آل عمران [۳۲]

(۲)النور [۵۳]

(۳)النور [۵۳]

(۴)آل عمران [۲۳]

(۵)الجاثیہ [۶]

فَقَدْ أَبَىٰ) (۱) ترجمہ: (میری امت کے سب ہی لوگ جنت میں داخل ہو ہی جائیں گے سوائے اس شخص کے جو خود ہی [جنت میں جانے سے] انکار کر دے، عرض کیا گیا کہ: اے اللہ کے رسول! ایسا شخص کون ہو سکتا ہے کہ جو خود ہی [جنت میں جانے سے] انکار کر دے؟ آپ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گیا، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خود ہی [جنت میں جانے سے] انکار کر دیا)

گذشتہ نصوص کی روشنی میں یہ بات خوب واضح و ثابت ہو جاتی ہے کہ مسلمان کیلئے زندگی کے ہر شعبے میں رسول ﷺ کی خصیت کو "اُسوہ حسنہ" سمجھنا اور آپ کی پاکیزہ تعلیمات پر صدقِ دل کے ساتھ عمل کی فکر و جستجو کرتے رہنا از حد ضروری ہے۔

اسی مسئلے میں مزید یہ ارشادِ بانی بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۲) ترجمہ: (یقیناً تمہارے لئے رسول ﷺ کی ہستی میں بہترین نمونہ ہے)

اس آیت کی رو سے ہر مسلمان کیلئے یہ بات ضروری و لازمی ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں رسول ﷺ کی خصیت کو اپنے لئے بہترین مثال اور قابل تقلید نمونہ تصور کرے اور آپ کی تعلیمات وہدایات کو اپنے لئے مشعل راہ اور روشنی کا مینار سمجھے۔

☆..... یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تمام بني نوع انسان میں سے صرف رسول ﷺ کی خصیت کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے تمام دنیائے انسانیت کیلئے بہترین مثال اور قابل تقلید نمونہ قرار دیا گیا اور تمام اہل ایمان کو آپ ﷺ کا اخلاق و کردار اپنانے کی تاکید

(۱) بخاری [۲۸۰]۔ کتاب الاعتصام بالكتاب والسنۃ [۹۶] باب [۲] الاقتداء بمن رسول اللہ ﷺ و قول اللہ

(۲) الاحزاب [۲۱] تعالیٰ: واجعلنا لِمَنْ تَقْرِبُنَا اماماً۔

تاکید و تلقین کی گئی ہے، اس بارے میں اگر غور فکر کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام دنیا کے انسانیت کیلئے قبل تقلید نمونہ اور مثال صرف اسی شخصیت کو قرار دیا جاسکتا ہے جس میں درج ذیل دو اوصاف موجود ہوں:

۱۔ سیرت و تعلیمات کا محفوظ و معلوم ہونا:

یعنی اگر کوئی شخص کسی مخصوص شخصیت کو اپنے لئے مثال اور نمونہ قرار دیتے ہوئے اس کی تعلیمات کی پیروی اور اتباع کا خواہشمند ہو تو اس مقصد کیلئے ضروری ہے کہ اس مخصوص شخصیت کے حالاتِ زندگی اور اس کی تعلیمات وہدایات محفوظ اور معلوم ہوں، ورنہ یہ کہ اگر اس کی تعلیمات کے بارے میں کسی کو علم ہی نہ ہو تو ان پر عمل کس طرح کیا جائیگا؟ الہذا قبل تقلید نمونہ یا اُسہ حسنہ صرف ایسی شخصیت کو قرار دیا جاسکتا ہے جس کے حالاتِ زندگی محفوظ ہوں، جس کا اخلاق و کردار معلوم و معروف ہو، جس کی تعلیمات وہدایات محفوظ ہوں اور ان کے بارے میں بہولت معلومات حاصل کی جاسکتی ہو۔

اس دنیا میں بیشتر مشہور و معروف اور بڑی نامور ہستیاں گذری ہیں، جن میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی جلیل القدر ہستیاں بھی شامل ہیں، عظیم فاتحین و سلاطین بھی شامل ہیں، بڑے بڑے دانشور، مصلحین و مجددین، سیاسی و مذہبی رہنماء، شعراء و ادباء اور شاعریہ بیان خطباء و مقررین کی بھی طویل فہرست ہے، لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آج ان ہستیوں میں سے کسی کے بھی حالات یا تعلیمات اس قدر محفوظ و معلوم نہیں کہ جس قدر رسول اللہ ﷺ کی سیرت، آپؐ کے حالاتِ زندگی نیز آپؐ کی تعلیمات وہدایات محفوظ و معلوم ہیں، چنانچہ آپ ﷺ کی ولادت، آپؐ کا بچپن، آپؐ کی پاکیزہ جوانی، آپؐ کی بعثت، آپؐ کی ہجرت، آپؐ کی عبادت، آپؐ کی تجارت، آپؐ کی سیاست، آپؐ کی گھریلو زندگی

آپ کی مسجد کی زندگی، آپ کی بازار کی زندگی، آپ کے صلح و جنگ کے حالات و واقعات، سفر و حضر کے حالات و واقعات، آپ کے اخلاق و عادات، آپ کا حلیہ مبارکہ، آپ کا انداز تکلم، انداز تبسم، آپ کی رفتار و گفتار، آپ کی نشست و برحواست، آپ کے کھانے پینے کے طور طریقے، اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپ کی معاشرت، نیزا پنے اصحاب کے ساتھ آپ کا روتیہ و سلوک، غرضیکہ آپ کی حیاتِ طیبہ نیزا آپ کی پاکیزہ و مقدس تعلیمات کا ہر پہلو اور ہر گوشہ نہایت ہی وضاحت و تفصیل کے ساتھ سیرت کی کتابوں میں موجود و محفوظ ہے، گویا آپ کی سیرت نیزا آپ کی تعلیمات وہدیات کسی کھلی کتاب کی طرح دنیا کے سامنے موجود ہیں، اور تمام دنیائے انسانیت میں یقیناً یہ امتیازی و صاف صرف اور صرف آپ ہی کو حاصل ہے، تمام بني نوع انسان میں آپ کے سوا اور کسی کو یہ امتیازی و صاف اور یہ شرف حاصل نہیں ہو سکا۔

۲۔ جامعیت و اکملیت:

تمام دنیائے انسانیت کیلئے اُسوہ حسنہ اور قابل تقلید نمونہ صرف ایسی شخصیت کو ہی قرار دیا جاسکتا ہے جس میں جامعیت و اکملیت کی صفت پائی جاتی ہو، جس کی شخصیت ہم گیر ہو..... اور یقیناً یہ امتیازی و صاف اور شرف بھی تمام بني نوع انسان میں صرف رسول اللہ ﷺ ہی کو حاصل ہے، چنانچہ آپ نے بعثت سے قبل بکریاں بھی چراں میں، محنت و مشقت بھی کی، تجارت بھی کی، آپ واعظ و ناصح بھی تھے، معلم و مرتبی بھی تھے، قاضی و مُنصف بھی تھے، اسلامی سلطنت کے فرمانرو اور پیشوائی بھی تھے، اسلامی لشکر کے سپہ سالار بھی تھے، اپنی مسجد میں امام و خطیب بھی تھے، مثالی شوہر اور شفق و مہربان باب پ بھی تھے.....

☆..... لہذا اگر کوئی تاجر ہے تو اس کیلئے آپ ﷺ کی زندگی کا وہ دور نمونہ ہے جب تجارت

کے حوالے سے چہار سو آپؐ کی امانت و دیانت کے چرچے تھے، اپنے اور پرانے دوست اور دشمن، سب ہی آپؐ نو ”صادق“ و ”امین“ کے لقب سے پکارتے تھے۔
 ☆.....اگر کوئی مظلوم و مجبور ہے تو اس کیلئے آپؐ کی زندگی کا وہ درخواست ہے جو بے پناہ مصائب و مشکلات سے بھر پور تھا، خصوصاً وہ عرصہ جو آپؐ نے کفارِ مکہ کی طرف سے مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ) کے دوران شعب ابی طالب میں انتہائی بے بسی اور عسرت و تنگی کی کیفیت میں گزارا۔

☆.....اگر کوئی فتح و غالب ہے تو اس کیلئے آپؐ کی زندگی کا وہ حصہ نہ مونہ اور مثال ہے جب آپؐ کو اللہ نے کفارِ مکہ کے مقابلے میں ہمیشہ کیلئے فتح و غلبہ سے نوازا، اور فتح مکہ کے تاریخی اور یادگار موقع پر آپؐ فاتحانہ شان و شوکت یا کبر و غرور کی بجائے اپنے رب کی کبریائی اور حمد و شاء بیان کرتے ہوئے انتہائی عاجزی واکساري کے عالم میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے، اور اس وقت کفارِ مکہ جب آپؐ کے سامنے عاجزو بے بس تھے اور مکمل طور پر آپؐ کے رحم و کرم پر تھے، آپؐ نے انتقام کی مکمل قدرت و طاقت کے باوجود کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا اور اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف فرمادیا۔

لہذا اگر کوئی شخص مزدور ہو یا تاجر، کسی سلطنت کافر مازرو اور حکمران ہو یا مسجد کا امام و خطیب، معلم و مرbi ہو یا منصف و قاضی، سپاہی ہو یا سپہ سالا، غرض یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی ہستی میں ہر انسان کیلئے بہترین اُسوہ اور قابلی تقلید نہ مونہ موجود ہے، خواہ اس کا تعلق معاشرے کے کسی بھی طبقہ سے ہو۔

☆.....الغرض رسول ﷺ کی سیرت مبارکہ کا جب بھی تذکرہ ہو یا اس موضوع پر جب بھی کسی کتاب یا کسی مضمون کے مطالعے کا اتفاق ہو تو، ایسے میں اصل مقصود یہی ہونا چاہئے

کہ ہم آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کو جانئے اور آپ ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات کو سمجھنے کے بعد خلوص نیت اور جذبہ صادق کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں ان تعلیمات کو جاری و نافذ کرنے کی مخاصانہ کوشش کریں اور اس طرح ہم دنیا و آخرت میں اپنے لئے صلاح و فلاح اور خیر و خوبی کا انتظام کر سکیں واللہ الموفق والہادی الی سواء السبیل!

وَآخْرِدُّ عَوَانَا أَنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

وَسَلَّمَ اللَّهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٌ وَآلُهُ وَاصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔



الحمد لله آج بتاریخ ۱۸/ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ، مطابق/ ۲۰۱۳ء بروز هفتہ،

بعد نماز عشاء، یہ کتاب "سیرت النبی ﷺ" مکمل ہوئی۔

رَبَّنَا تَقْبَلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْغَلِيمُ، وَتُؤْتُ عَلَيْنَا إِنَّكَ

أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ،

اللَّهُمَّ احْسِرْنَا مَعَ النَّبِيِّنَ وَالصَّدِيقِينَ وَالشَّهِداءِ

وَالصَّالِحِينَ، وَارْزُقْنَا صُحْبَةَ نَبِيِّكَ مُحَمَّدٌ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

وَاصْحَابِهِ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ،

بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ،

سُبْحَانَ رَبِّ الْعَزَّةِ عَمَّا يَصِفُّونَ، وَسَلَامٌ عَلَى

الْمُرْسَلِينَ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



